

ہستی باری تعالیٰ جلّ مجدہٗ

اعلیٰ حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی

ایدہ اللہ بنصرہ

کی وہ معرکۃ الآرا تقریر جو حضور نے جلسہ سالانہ ۱۹۲۱ء پر بیان فرمائی

جسے

مینیجر بک ڈپو تالیف و اشاعت قادیان نے شائع کیا

ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء

بار اول

تعداد جلد ۱۰۰۰

مختصر فہرست کتب حضرت مسیح موعود
علیہ السلام

نام کتاب مع مضمون	زبان	قیمت
۱ براہین احمدیہ ۔ تین قابل قدر مضامین یعنی وید و فرقان کا مقابلہ الہام کی حقیقت اور آریوں کے قدامت روح کی اصلیت	اُردو	۴ر
۲ براہین احمدیہ ۔ چہار جلد ۔ صداقت اسلام دلائل توڑنے والے کو انعام اور بعض آیات کی تفسیر	اردو	۴ر عہ
۳ سرمہ چشم آریہ ۔ ردّ آریہ میں ایک مکمل کتاب	اُردو	۴ عہ
۴ شحنۂ حق ۔ ردّ آریہ ۔	"	
۵ فتح اسلام ۔ بیان دعویٰ خود وذکر پنج شاخ ۔	"	۳ر
۶ نور الحق ہر دو حصہ ۔ ردّ عیسائیت و پیشگوئی کسوف خسوف	عربی مترجم اردو	۱۲ر
۷ آسمانی فیصلہ ۔ دُعا کے ذریعہ مخالفین سے فیصلہ کرنے کی تجویز اور استخارہ کا طرز ۔	"	۳ر
۸ نشان آسمانی ۔ گذشتہ اولیاء کی پیشگوئیاں مسیح موعود کے لئے	"	
۹ انوار الاسلام ۔ ردّ عیسائیت عبد اللہ آتھم والی پیشگوئی کی تفصیل ۔	"	۴ر
۱۰ نور القرآن ۔ خصوصیت سے ردّ ردّ عیسائیت میں اور ردّ دیگر مذاہب باطلہ ۔ حصہ اوّل	اُردو	۴ر
۱۱ ضیاء الحق ۔ ردّ عیسائیت و جواب بعض اعتراضات متعلق پیشگوئی عبد اللہ آتھم ۔	"	۲ر
۱۲ ست بچن ردّ سکھ ۔	"	۱۲ر
۱۳ جلسہ اعظم مذاہب ۔ مقصود حیات انسان وحقیقت اسلام اور حیوان سے انسان بننے اور انسان سے با اخلاق انسان بننے اور با اخلاق انسان سے باخدا انسان بننے کی تفسیر چند آیات ۔	"	۹ر
۱۴ استفتا ۔ لیکھرام کا قتل پیشگوئی سے ہوا ۔	"	۱ر
۱۵ تحفہ قیصرہ ۔ شکریہ سلطنت ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند اور اسکو دعوت اسلام	"	۴ر
۱۶ سراج منیر ۔ چند پیشگوئیوں کا پورا ہونا ۔	"	۶ر

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھوالناصر

ہستی باریتعالے

آج میں ایک ایسے مضمون کے متعلق تقریر کرنی چاہتا ہوں جو سب مضامین کا جامع ہے اور سب مضامین اسکے گرد چکر لگاتے ہیں اور سب اسکے تابع ہیں اور یہ انکا متبوع ہے۔ میں اسوقت تک جس قدر مضامین بیان کرتا رہا ہوں وہ سب اس مضمون کے اجزاء اور اسکی شاخیں تھیں اور آیندہ بھی مجھے جو کچھ توفیق ملے اسی کی تشریح ہوگی۔ اس مضمون کو خواہ کس قدر بھی سنایا جائے ختم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ ایک غیر محدود ہستی سے تعلق رکھتا ہے اور اس وجہ سے غیر محدود ہوگیا ہے۔ آپ لوگ جسقدر بھی اس مضمون پر غور کرینگے اسکے مطالب کو غیر محدود پائینگے۔ اور نئے سے نئے مطالب آپ پر ظاہر ہوں گے۔

سب انبیاء نے اس مضمون کو بیان کیا ہے مگر بالآخر یہی کہا کہ تو مضمون بیچ ہی رہ گیا۔ اور ہم جاتے ہیں۔ غرض سب انبیاء اور اولیاء یہی کہتے آئے ہیں۔ کہتے رہیں اور جب تک یہ دنیا رہیگی کہتی رہیگی۔ اور مرنے کے بعد خلا میں بھی یہی مضمون ہوگا۔ یہ مضمون ہے۔ ذات باری۔

ذات باری یعنی اللہ کا مضمون بہت وسیع مضمون ہے۔ اور تمام مضامین اس کے

نکلتے ہیں۔ دیکھو ملائکہ کیا ہیں۔ خدا تعالیٰ کی مخلوق اور اسکی طرف سے مختلف کاموں پر مقرر ہیں۔ نبی کیا ہیں؟ خدا تعالےٰ کی مخلوق اور اسکے بھیجے ہوئے۔ آسمانی کتابیں کیا ہیں؟ خدا تعالےٰ کا کلام۔ دعا کیا ہے؟ خدا تعالیٰ کے حضور التجا۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کیا ہیں؟ خدا تعالےٰ کی عبادات۔ بندوں سے حسن سلوک کیا ہے؟ اپنے محبوب کے پیاروں سے پیار اور اس ذریعہ سے اپنے محبوب سے ملنے کی خواہش اور اسکے انعامات کی امید۔ غرض ساری کے سارے مضمون اسکے گرد اس طرح گھومتے ہیں جس طرح چاند سورج کے گرد گھومتا ہے۔

ہستی باری تعالےٰ کے مضمون کی ضرورت

میرا مضمون خدا تعالےٰ کی ہستی کو ثابت کرنا نہیں۔ بلکہ ذات باری ہے۔ مگر چونکہ اس کا یہ بھی حصہ ہے۔ اس لئے بیان کرتا ہوں۔ اس زمانہ میں گناہ اور بدی کی کثرت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ لوگ خدا کا انکار کرلتے ہیں۔ اور سب بدیاں اور گناہ خدا کو نہ سمجھنے۔ اور اس پر حقیقی ایمان نہ لانے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے بھی اس مضمون کو سمجھنے کی بہت ضرورت ہے۔ پھر یورپ کی تعلیم نے کالج کے لڑکوں کو بالکل آزاد بنادیا ہے۔ وُہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے باپ دادا جاہل تھے۔ جو خدا کو مانتے تھے۔ نہ کوئی خدا ہے۔ اور نہ اسکے ماننے کی ضرورت۔ میں حج کیلئے گیا۔ تو میری ساتھ جہاز میں تین طالب علم بھی تھے۔ جو ولایت جا رہے تھے۔ ان میں سے دو مسلمان تھے۔ اور ایک ہندو۔ ان کی ایک پادری سے بحث ہوئی۔ جسے سنکر مجھے اس خیال سے خوشی ہوئی کہ انہیں بھی مذہب سے تعلق ہے۔ یہ سمجھکر میںنے اُن سے کوئی مذہبی بات کی تو وہ تینوں بول اُٹھے کہ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ میںنے کہا ہاں۔ پادری صاحب سے جو آپ مذہب کے متعلق گفتگو کر رہے تھے وہ کہنے لگے ہم تو قومی مذہب کی حمایت کر رہے تھے۔ نہ کہ خدا کو مان کر اس کے مذہب کی حمایت کرتے تھے۔ یہ حمایت مذہب کی نہ تھی بلکہ ہندوستانیت کی۔

اس زمانہ میں خدا کا انکار حد سے بڑھا ہوا ہے اور یہاں تک دلیری سے انکار کیا جاتا ہے۔ کہ ایک دفعہ گفتگو کے درمیان میں انہیں طالب علموں میں سے ایک نے جو نسلاً ہندو تھا۔ میز پر تنکا پھینک کر کہا میں تو اس میز کو اُٹھا کر دکھا سکتا ہوں۔ تمہارا خدا اس تنکے کو اٹھا کر دکھادے۔ اسکی باتوں کا مجھپر ایسا اثر ہوا۔ کہ میںنے آتے ہی ایک ٹریکٹ لکھا جس میں خدا تعالےٰ کی

ہستی کے دلائل دیئے۔ مگر آج اس سے زیادہ وسیع مضمون بیان کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ توفیق دے +

خدا کے انکار کی وجہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ کا انکار بہت بڑھا ہوا ہے جس کا بڑا سبب تو یہ ہے کہ گناہ کی کثرت کی وجہ سے تعلق باللہ نہیں رہا۔ اور دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انگریزی دان لوگ یورپ کے فلسفہ سے متاثر ہوکر مذہب سے دور جا پڑے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں نے ان کے اثر کو قبول کیا ہے۔ یورپ کے فلسفہ کا اور فلسفیوں کے خدا تعالیٰ سے اس قدر دور ہو جانیکا سبب یہی ہے کہ جب یورپ میں علمی ترقی ہونے لگی اور طبعی اکتشافات کا سلسلہ شروع ہوا تو پادریوں کو یہ بیوقوفی سوجھی کہ انہوں نے اس ترقی کو مذہب کے خلاف سمجھا۔ اور اس کی مخالفت شروع کردی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ مسیحیت کی بنیاد ایسے اصول پر ہے جنکو عقل رد کرتی ہے۔ اگر لوگوں کی توجہ عقل کی طرف ہوگئی تو اسکو کون مانیگا۔ پس انہوں نے اس تصرف کو قائم رکھنے کیلئے جو ان کو عوام الناس پر حاصل تھا۔ علوم ہی کی مخالفت شروع کردی۔ اور جو بات بھی علوم طبعیہ کے متعلق نئی دریافت ہوئی اُسے کفر قرار دیدیا اور کہدیا کہ یہ مذہب کے خلاف ہے۔ اور اسکی طرف توجہ کرنا گناہ ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے جب دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ تو اسکے متعلق پادریوں نے فتویٰ دیدیا۔ کہ یہ مذہب سے نکل گیا ہے۔ آپ حیران ہونگے۔ کہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا دعوے کرکے وہ شخص کس طرح مسیحیت سے نکل گیا۔ مگر اس کا جواب آسان ہے۔ پادریوں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ خدا تعالےٰ کا کلام انسان پر نازل ہوا ہے اور انسان زمین پر بستا ہے۔ اسلئے زمین سب سے اعلیٰ ہوئی۔ لیکن اگر زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو زمین سورج کے مقابلہ میں ادنیٰ ہوگئی۔ تو اس کی ذلت میں شبہ نہ رہا۔ اور اسپر بسنے والے بھی ذلیل ہوگئے۔ اس بنا پر اسپر کفر کا فتوے دیدیا گیا۔ اور اسے اتنا تنگ کیا گیا کہ آخر اس نے ایک کتاب لکھی جس میں لکھا کہ مینے سورج کے گرد زمین کے گھومنے کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اگرچہ عقل کے رُو سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ مگر انسانی عقل ہے کیا چیز کہ اسپر بھروسہ کیا جاوے۔ اصل بات یہ ہے کہ شیطان چونکہ انسان اور خدا کا دشمن ہے۔ اور خدا کے

نور کو دنیا میں پھیلنے سے روکتا ہے۔ اسلیئے اس نے میرے دل میں یہ خیال ڈال دیا۔ اور مجھے اس وقت ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ زمین گھومتی ہے۔ یہ عذر کر کے اپنے عقلمندوں کی نگاہ میں تو اپنے دعویٰ کو پختہ کر دیا لیکن پادریوں نے اپنی بے وقوفی سے سمجھا کہ اب اس کو عقل آگئی ہے اور اسکی توبہ قبول کیگئی +

اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایجادیں کرنے والے اور نئی نئی باتیں دریافت کرنیوالے خدا کے ہی خلاف ہو گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ اگر ثابت شدہ باتوں اور آنکھوں دیکھی باتوں پر عقیدہ رکھنے سے خدا کے کلام کا انکار ہوتا ہے تو خدا کا کوئی وجود ہی نہیں۔ کیونکہ کس طرح ممکن ہو کہ خدا کا کلام کچھ اور کہے اور اسکا فعل کچھ اور۔ اس وجہ سے وہ مذہب کے خلاف ہو گئے اور فلسفی جو مذہب پر پہلے سے ہی معترض تھے ان کے مددگار ہو گئے اور علوم کی ترقی کیساتھ ساتھ مذہب کی گرفت بھی کم ہوتی چلی گئی +

مشرق میں جب ان علوم کا رواج ہوا تو چونکہ کتابیں لکھنے والے مسیحیت سے تنگ آکر دوسری حد کی طرف نکل گئے تھے جس طرح پادری ہر ایک علمی تحقیق کو کلام الٰہی کے خلاف ثابت کرتے تھے۔ انہوں نے ہر ایک علمی تحقیق سے یہ نتیجہ نکالنا شروع کیا کہ خدا ہی کوئی نہیں اور ان کی کتب کا مطالعہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ دل جو پہلے ہی زنگ آلود تھے خدا تعالیٰ کی طرف سے بالکل دور جا پڑے اور طبائع دہریت کی طرف مائل ہو گئیں +

فلسفی خیالات کے متعلق ایک اور مصیبت ہو اس میں صرف دماغ کی تر و تازگی کا سامان ہے کرنا کرانا کچھ نہیں پڑتا اسلیئے بہت سے لوگ اسکی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اسکے خلاف مذہب پر غور و تدبر کرنیکا نتیجہ عملی اصلاح ہے جو لوگوں پر گراں گذرتی ہے۔ مثلاً جو شخص اسلام پر غور کریگا اور اس کی خوبی کا قائل ہو گا اسکو ساتھ ساتھ کچھ کرنا بھی ہو گا اور مذہب میں ترقی کے ساتھ ساتھ عمل میں بھی ترقی ہوتی چلی جائیگی اگر پہلے فرض شروع کریگا۔ تو اور غور کرنے پر سنتیں بھی پڑھنے لگ جائیگا۔ اور پھر جب اور غور کریگا۔ تو اسے معلوم ہو گا نوافل بھی بہت مفید ہیں یہ بھی پڑھنے لگ جائیگا۔ اور جوں جوں غور کریگا۔ نوافل میں ترقی کرتا جائیگا۔ غرض مذہب میں انسان جس قدر غور و فکر سے کام لیگا۔ اسی قدر زیادہ پابندیاں

اپنے اوپر عاید کرتا جائیگا۔ مگر فلسفہ میں یہ بات نہیں ہوتی صرف دماغ تازہ کیا جاتا ہے۔ اور عملی طور پر کیا کرایا کچھ نہیں جاتا۔ اسلیئے لوگ ادھر زیادہ متوجہ ہو جاتے ہیں۔ غرض دہریت اور خدا کے انکار کا اس زمانہ میں بڑا زور ہے۔ ایک وجہ اس انکار کی یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگ خود تحقیق نہیں کرتے بلکہ ان کے مذہب کی بنیاد صرف ماں باپ کے ایمان پر ہوتی ہے۔ اور جن لوگوں کی اپنی تحقیق کچھ ہو ہی نہیں وہ اعتراض کا دفعیہ نہیں کر سکتے بلکہ جلد ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف سُنی سُنائی بات ہوتی ہے اور دوسری طرف دلیل اگر وہ لوگ دل سے خدا تعالیٰ کو مانتے ہوتے۔ تو اس قدر دہریت نہ پھیلتی۔ مثلاً یہ میز پڑی ہے یا یہ سائبان لگے ہے۔ کوئی فلسفی کہے۔ کہ یہ میز نہیں۔ یا یہ سائبان نہیں۔ یا اس وقت سورج چڑھا ہوا نہیں۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ لوگوں میں سے کوئی اُسکی بات مان لے۔ اسی طرح اگر لوگوں نے خدا تعالےٰ کو دیکھا ہوتا۔ اسے حقیقی طور پر مانتے تو کس طرح ممکن تھا۔ کہ خدا تعالےٰ کا انکار کرنے والوں کی بات مان لیتے۔ بات یہی ہے کہ ایسے لوگوں نے خود غور نہیں کیا ہوتا۔ دوسروں کے کہنے پر مانتے ہیں۔ اسلیئے اگر کوئی ذرا ٹھوکر لگا دے۔ تو کہیں کے کہیں جا گرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں تو اسلیئے کہ بحثیں نہ کرنی پڑیں۔ جیسے غیر احمدیوں کو جب کہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ کی وفات پر گفتگو کر لو۔ تو اس سے بچنے کیلئے کہدیتے ہیں۔ فرض کر لو حضرت عیسیٰ مر گئے۔ اسی طرح جو لوگ مثلاً مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں وہ اپنے قومی مذہب کو اپنے مذہب کے خلاف دیکھکر اور بحث سے بچنے کیلیئے جب سوال ہو تو کہدیتے ہیں کہ ہم خدا کو مانتے ہیں اور بعض لوگ تو اپنے آپ کو ذہنی کشمکش سے بچانے کیلئے اپنے نفس کو بھی دھوکے میں رکھتے ہیں اور جب ان کے دل میں شک پیدا ہو تو بلا کسی دلیل کے اسکو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی درحقیقت دہریہ ہیں گو بہ ظاہر خدا کو مانتے ہیں ۔

لیکن اگر خدا ہے۔ تو اُس کے ساتھ ان دھوکہ بازیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر لوگ محض سُنے سُنائے اسے مانتے ہیں۔ اور بحث سے بچنے کے لئے ماننے کا اقرار کرتے ہیں۔ تو اس سے اُن کی نجات نہ ہو سکیگی۔ ایسے لوگ قیامت کے دن پکڑے جائینگے اور دہریوں میں شامل کئے جائینگے۔ اسلیئے ضروری ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے متعلق غور کیا جائے ۔

خدا کے ماننے کا فائدہ جب کہا جاتا ہے کہ خدا کو مانو۔ تو بعض لوگوں کے دلوں میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم خدا کے وجود یا عدم وجود کی بحث میں پڑیں ہی کیوں اسکا فائدہ ہی کیا ہے۔ اب بھی ہم محنت سے کماتے ہیں۔ اگر خدا کو مانکر بھی محنت ہی کرنی پڑے گی اور جو کوشش اب کرتے ہیں وہی پھر بھی کرنی ہوگی۔ تو پھر خدا کے ماننے سے ہماری زندگیوں میں کون تغیر ہوا جسکی خاطر ہم یہ جھگڑا سہیڑیں *

یوروپین محققین کا جواب یورپ کے لوگوں کے سامنے بھی یہی سوال آیا ہے جس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے۔ کہ اگر خدا کو نہ مانا جائے۔ تو دنیا سے امن اُٹھ جائیگا۔ کیونکہ پولیس تو ہر جگہ نہیں ہوتی۔ ہزارہا لوگ جن کے دل میں چوری کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ خُدا ہی کے ڈر سے رُکتے ہیں اور اس کے ڈر کی وجہ سے چوری کا ارتکاب نہیں کرتے۔ اسلئے خدا کو ماننا چاہئے۔ اگرچہ واقع میں کوئی خدا نہیں۔ مگر سیاستاً خدا کے خیال کو ضرور زندہ رکھنا چاہئے تاکہ دنیا میں امن قایم رہے۔ یہ عقیدہ پہلے پہل رومہ سے شروع ہوا۔ وہاں تین قسم کے خدا مانے جاتے تھے۔ ایک عوام کا خُدا جسے کبھی عورت کے بھیس میں اور کبھی کسی اور شکل میں ظاہر ہونیوالا قرار دیا جاتا تھا۔ دوسرا فلسفیوں کا جو بہت لطیف اور وراء الوریٰ سمجھا جاتا تھا تیسرا حکومت کا خدا جس کا مطلب صرف یہ تھا کہ امن قائم رکھنے کے لئے ایک بالا ہستی کو منوانا عوام الناس کو جرموں سے بچانیکے لئے ضروری ہے۔ اب یورپ بھی اس قسم کے خدا کا قائل ہے۔ حالانکہ یہ دہریت ہے اور خدا تعالیٰ کی پاک ذات سے تمسخر *

اس دلیل کی کمزوری خدا کے ماننے کیلئے یہ دلیل کہ اس کے ماننے سے امن قائم ہوتا ہے۔ یورپ کی دلیل ہے۔ مگر یہ کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اگر فی الواقعہ خدا نہیں ہے تو پھر کیوں دھوکہ دیکر لوگوں سے خدا منوایا جائے۔ دھوکہ دیکر لوگوں کو گناہوں سے باز رکھنا خود ایک گناہ ہے۔ اور پھر یہ بھی تو سوال ہے کہ خدا تعالیٰ کا وجود ہی کوئی نہیں تو پھر گناہ کیا شئے ہے۔ خدا تعالیٰ کے نہ ہونے کی صورت میں تو گناہ کی تعریف ہی بدلنی پڑیگی۔ پس خدا تعالیٰ کے منوانے کی یہ غرض اپنی ذات میں گناہ ہے اور لوگوں کو ذہنی غلامی میں پھنسائے رکھنا ہے اور دہریت پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ جب ایک چیز کو اسکے اصل مقصود سے پھیر دیا جائے تو اس کی حقیقت پر

غور کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں رہتی۔ اصل جواب اس سوال کا کہ خدا تعالےٰ پر کیوں ایمان لایا جائے یہ ہے کہ چونکہ خدا تعالےٰ موجود ہے اسلئے اسپر ایمان لانا چاہئے اور دوسری صداقتوں کو جو ہم مانتے ہیں تو یہ سوچکر تو نہیں مانتے کہ ان کے ماننے میں کیا فائدہ ہے۔ بلکہ اسلئے مانتے ہیں کہ وہ سچائیاں ہیں اور سچائیوں کو معلوم ہونیکے بعد نہ ماننا جہالت اور حماقت ہے اور جبکہ نہایت چھوٹی چھوٹی صداقتوں کی دریافت کیلئے بغیر اسکے کہ اس دریافت سے کسی فائدہ کی پہلے سے کوئی امید ہو لوگ کوشش کرتے ہیں تو کیوں اس قدر اہم مسئلہ کی دریافت کی طرف توجہ نہ کیجائے جو پیدائش عالم کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ جب لوگوں نے زمین کے گھومنے یا اسکے گول ہونے یا ستاروں کے فاصلوں پر غور کرنا شروع کیا تھا تو ان امور کی دریافت میں سوائے زیادتی علم کے اور کیا فائدہ سوچا تھا۔ پس اگر جزئیات کی دریافت کے متعلق بغیر کسی نفع کی امید کے کوشش کیجاتی رہی ہے اور کیجاتی ہے تو ذات باری کے مسئلہ کے متعلق کیوں غور نہ کیا جائے؟ درحقیقت جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق غور ہی کیوں کریں وہ ایک رنگ میں خدا تعالیٰ کی ذات کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی غرض اس علم سے جو فوائد مترتب ہوتے ہیں ان کا معلوم کرنا نہیں ہوتا۔

جب خدا کے نہ ماننے والوں کے سامنے مندرجہ بالا امر پیش کیا جاتا ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ باقی باتیں تو اختیاری ہیں۔ کسی کی مرضی ہو۔ تو زمین کے گھومنے کی تحقیقات کرے اور نہ ہو تو نہ کرے۔ اسے کوئی مجبور نہیں کرتا۔ مگر خدا کو تو جبرًا منوایا جاتا ہے۔ اور ہر ایک کو مجبور کیا جاتا ہے۔ کہ خدا کے بارے میں تحقیقات کرے۔ مگر یہ غلط ہے جس طرح ان علوم کی اشاعت ہوتی ہے اسی طرح اس علم کی بھی اشاعت کی جاتی ہے جس طرح دوسرے علوم خاص خاص لوگوں نے جنہوں نے اپنی عمریں انکی دریافت میں صرف کی ہیں دریافت کئے ہیں اسیطرح خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکشاف بھی خاص خاص لوگوں پر جو اس امر کے اہل ہوتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا جلوہ کامل طور پر انپر ظاہر ہو۔ ہوا ہے۔ اور جب انپر حقیقت ظاہر ہوگئی ہے تو انہوں نے باقی دنیا کو اس صداقت کے تسلیم کرنے کی دعوت دی ہے۔ اسی طرح جسطرح ان لوگوں نے جنہوں نے قانون قدرت کی باریکیوں کو دریافت کیا اور پھر دوسرے لوگوں کو ان کے ماننے

کی دعوت دی۔ اس میں کیا شک ہے، کہ سب دنیا اس تحقیق میں مشغول نہیں ہوئی تھی کہ زمین گول ہے یا نہیں مگر جب یہ صداقت ظاہر ہو گئی تو پھر سب سے ہی اس صداقت کو منوایا جاتا ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے وجود کا اسکی محبت میں فنا ہو کر بعض لوگوں نے پتہ لگایا تو اب سب پر فرض ہے کہ وہ اسے مانیں۔ خواہ اسکے ماننے میں ان کو کوئی فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اگر زمین کی گولائی اور جوار بھاٹے کے اصول کے دریافت ہونیکے بعد دنیا کو اجازت نہیں دیجاتی کہ جو چاہے ملنے۔ تو کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسیکو کچھ نہ کہو خواہ کوئی توجہ کرے یا نہ کرے۔ جنکو خدا تعالےٰ کی ہستی کا علم ہوا ہے انکا حق ہے اور انپر فرض ہے کہ وہ دوسروں تک اس علم کو پہونچائیں اور کسی کا حق نہیں کہ ان کی اس کوشش پر اعتراض کرے یا اس مسئلہ پر غور کرنے کو عبث قرار دے +

تیسرا جواب یہ ہے۔ کہ خالق کے معلوم کرنے سے حقائق الاشیاء معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس طرح خدا کے معلوم ہونے سے دنیا کے علوم میں بہت کچھ ترقی ہوتی ہے۔ خدا تعالےٰ کے وجود کے نہ سمجھنے کے نتیجہ میں ہی شرک پیدا ہوا ہے اور شرک سے حقائق اشیاء کے دریافت کرنے کی طرف بے توجہی ہوئی ہے۔ اگر ہر اک چیز کی علت خدا تعالےٰ کے حکم اور اسکے ارادہ کو قرار دیا جاتا۔ تو کیوں ان چیزوں کو جو انسان کے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہیں خدا قرار دیکر انسانی تحقیق سے بالا سمجھ لیا جاتا +

چوتھا جواب یہ ہے کہ یہاں یہ ہی نہیں کہ ہم خدا تعالےٰ کے وجود پر غور ہی کیوں کریں۔ کیونکہ غور ہماری طرف سے شروع ہی نہیں ہوتا بلکہ خدا تعالےٰ خود اپنے ایلچی بھیج بھیج کر ہمیں اپنی طرف بلاتا اور ہماری توجہ کو کھینچ رہا ہے۔ پس جب بلاوا دوسری طرف سے آرہا ہے تو یہ سوال ہی غلط ہے کہ ہم کیوں خدا تعالیٰ کے وجود کے دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ جب آواز ادھر سے آرہی ہے تو ہماری کوشش کا سوال ہی اٹھ گیا۔ اگر چلتے چلتے ایک چیز ہمارے سامنے آجائے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم اسے کیوں دیکھیں۔ کیونکہ وہ چیز ہمارے ارادے سے پہلے ہمارے سامنے آگئی ہے۔ پس جب خدا تعالیٰ کی طرف سے ایلچی کے بعد ایلچی ہماری طرف آرہا ہے تو اب اس سوال کے معنے ہی کیا ہوئے کہ ہم اس سوال پر کیوں غور کریں۔ اسکا

جواب صاف ہے کہ اسلئے غور کریں کہ یہ سوال ہمارے سامنے آگیا ہے اور ایسے رنگ میں آگیا ہے کہ اس سے غفلت کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فرستادوں کا سلسلہ ایسا چلایا ہے کہ ایک منکر خدا کہہ سکتا ہے۔ کہ دق کر دیا ہے۔ اور جب تک لوگ انکار کرتے رہیں گے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہیگا۔ حضرت نوح۔ حضرت ابراہیم۔ حضرت موسیٰ۔ حضرت عیسےٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسیح موعود کے آنے پر بھی جو لوگ نہیں مانتے اگر وہ انکار کرتے چلے جائینگے تو پھر کسی اور رسول کو بھیجدیگا۔

لوگوں میں خدا کا خیال کس طرح پیدا ہوا؟

جب اس سوال کو اس طرح رد کیا جاتا ہے۔ تو منکران خدا اور طرف رُخ بدلتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر خدا تعالےٰ فی الواقع ہوتا تو چاہئے تھا کہ خدا تعالےٰ کا خیال دنیا میں الہام کے ذریعہ سے پیدا ہوتا مگر ہم جب انسانی ارتقاء کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی بالا ہستی کا خیال آہستہ آہستہ قوموں میں پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے اقوام میں ان اشیاء کی پرستش شروع ہوئی ہے جن سے انسان ڈرا ہے۔ جس طرح ایک بچہ ڈر کر لجاجت اور گریہ وزاری کرنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح جب انسان بعض چیزوں سے مرعوب ہوا اور ڈرا تو یہ ان کے آگے لجاجت کرنے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا اس سے عبادت پیدا ہوئی پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اپنے سے بالا ہستیوں کا خیال راسخ ہوتا گیا اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ انسان نے ادنیٰ چیزوں سے نظر اُٹھا کر صرف بالا ہستیوں کو پوجنا شروع کیا۔ پھر کچھ مدت کے بعد جب اور علمی ترقی ہوئی تو بالا ہستیاں غیر مادی قرار پا گئیں اور جن چیزوں کی پہلے پرستش کی جاتی تھی وہ انکا مظہر قرار پائیں اور آخری قدم یہ تھا کہ ایک واحد ہستی جو سب پر فائق تھی تجویز ہوئی پس خدا تعالےٰ کا خیال بندے کی مخلوق ہے نہ کہ کوئی بالا ہستی بندے کی خالق۔ چنانچہ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ سب سے پہلا علم جو دنیا میں رائج ہوا ہے وہ علم ہیئت تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ سورج۔ چاند۔ ستارے سب سے زیادہ انسانی عقل کو حیران کرنیوالے تھے اسلئے سب سے پہلے انہی کو خدا قرار دیا گیا اور ان کی چالوں پر غور شروع ہوا تا کہ معلوم ہو سکے کہ خدا کا منشاء کیا ہے اور اس سے علم ہیئت کی ترقی ہوئی علم

اور فکر کی ترقی سے متاثر ہو کر جب لوگوں نے اس خیال سے تسلی نہ پائی تو پنڈتوں نے ان چیزوں کو بالا ہستیوں کے مظاہر قرار دیدیا پس خیالات کے اس ارتقاء سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کا خیال انسانی دماغ کی ایجاد ہے نہ کرکسی حقیقت پر مبنی یا کسی الہام کا نتیجہ ہے۔ اگر فی الواقعہ خدا ہوتا اور الہام سے دنیا کو اس خیال کیطرف توجہ پیدا ہوتی تو شروع سے ہی خدا تعالےٰ کی ذات کی نسبت مکمل اور صحیح عقیدہ دنیا میں موجود ہونا چاہئے تھا۔ یہ اعتراض واقعہ میں قابل غور ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ جن اقوام نے کہ الہام کی تعریف کو موجودہ زمانہ کے اعتراضات سے ڈر کر بدل دیا ہے انہوں نے تو اس اعتراض کا جواب نہایت آسانی سے دیدیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جس خیال کو تم نامکمل کہتے ہو اور جس تصویر کو تم ناقص کہتے ہو وہ بھی الہام کے ذریعہ سے تھی۔ اور چونکہ دنیا کی ذہنی ترقی ابتداء میں کامل نہ تھی اسلئے خدا تعالیٰ نے اپنے وجود کو تمثیلی رنگ میں بنی نوع انسان میں ظاہر کیا تھا اور چونکہ اصل چیز جس کی قدر کیجا سکتی ہے وہ تعلق ہے پس جو شخص بھی نیک نیتی سے سانپ یا بچھو یا ستاروں کو خدا سمجھکر پوجتا ہے وہ درحقیقت خدا کو ہی پوجتا ہے۔ اور وہ بھی اپنی عقل کے مطابق ایک الہام پر ہی عمل پیرا ہے۔ پس اگر ابتداء میں خدا تعالیٰ کا خیال ناقص تھا تو اس کا موجب یہ نہ تھا کہ انسان کے دماغ نے اس خیال کو ڈر سے پیدا کیا۔ بلکہ اسکا موجب یہ تھا کہ انسانی دماغ بوجہ ناقص ہونے کے خدا تعالےٰ کے خیال کو مکمل صورت میں اخذ نہیں کر سکتا تھا اسلئے اسکی طاقتوں کے مطابق خدا تعالےٰ کا خیال اسکے دماغ پر نقش کیا گیا اور خدا تعالیٰ کا وجود اسے مختلف مظاہر کی صورت میں دکھایا گیا اور پھر یہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ سچ نہیں کہ دنیا کی ہر اک شئے ایک بالا طاقت کی منظر ہے؟

مجھے اس جواب کی صحت یا اسکے سقم پر اسوقت بحث کرنیکی ضرورت نہیں مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ جو لفظی الہام کے قائل ہیں یہ جواب منکرین خدا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ اگر الہام لفظوں میں نازل ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے تو خدا تعالےٰ کے وجود کو بنی نوع انسان کے سامنے بالکل ابتدائی زمانہ میں بھی اس رنگ میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ کہ انسان محسوس کرے کہ خدا تعالےٰ کا وجود دوسری اشیاء سے جو مخلوق ہیں بالکل الگ تھلگ ہے

پس ہمیں اور قسم کے جوابوں کی ضرورت ہے۔

میرے نزدیک اس اعتراض کا حقیقی جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس اعتراض کی حقیقت کیا ہے؟ اگر ہم اس اعتراض کی حقیقت پر غور کریں تو پہلے اس کی مندرجہ ذیل اجزاء معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) خدا تعالےٰ کا خیال ڈر اور حیرت سے پیدا ہوا ہے۔ (۲) اس میں تدریجی ترقی ہوئی ہے۔ اب اگر یہ دونوں باتیں صحیح ہیں تو خدا تعالےٰ کے متعلق جو خیال بنی نوع انسان میں پیدا ہوا ہے اس سے یہ ثابت ہونا چاہئے کہ سب سے پہلے جن چیزوں کی عبادت شروع ہوئی ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن سے سب سے پہلے بنی نوع انسان کو خوف پیدا ہو سکتا تھا۔ اب اگر ذرہ بھی تدبر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے انسان کو خوف درندوں سے ہو سکتا تھا کیونکہ جس وقت انسان کے پاس حفاظت کا پورا سامان نہ تھا اور آبادیوں کا دستور نہ شروع ہوا تھا سب سے زیادہ خطرہ درندوں سے ہی ہو سکتا تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ درندوں کی پرستش کیڑوں کی پرستش سے بہت کم ہے زیادہ تر سانپ کے پجاری ملتے ہیں۔ شیروں اور بھیڑیوں کی پوجا سانپ سے بہت کم ہوتی ہے حالانکہ سانپ چھپکر حملہ کرتا ہے اور شیر ظاہر میں اور شیر کی آواز ہے اور سانپ کی نہیں۔ اور شیر کا جسم بڑا ہے اور سانپ کا نہیں۔ اور بھیڑیے کا حال بھی شیر کی طرح کا ہے پس اگر تدریجی ترقی ہوتی تو سب سے پہلے شیر اور بھیڑیئے اور ریچھ وغیرہ کی پرستش ہوتی مگر ان کی پرستش اس کثرت سے اور اس قدر پرانی نہیں ہے جسقدر کہ سانپ کی ہے جس سے معلوم ہوا کہ خدا کے خیال کے تدریجًا پیدا ہونے کا خیال ہی غلط ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ اعتراض تب ہی پڑ سکتا تھا جبکہ تسلیم کیا جائے کہ انسان اچانک دنیا میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس وجہ سے اسے بعض چیزوں کو دیکھکر حیرت اور خوف پیدا ہوا مگر یہ عقیدہ رکھکر تو فورًا ایک بالارادہ ہستی کو تسلیم کرنا ہوگا جس نے ارادہ کیا کہ انسان پیدا ہو اور وہ پیدا ہو گیا اور خود یہ عقیدہ ہی خدا تعالےٰ کے وجود کو ثابت کر دیگا پس خدا تعالیٰ کے انکار کے ساتھ اس امر کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ انسان کی پیدائش بتدریج اور مختلف تغیرات سے ہوئی ہے اور اس قسم کے معترضین کا عقیدہ بھی یہی ہے۔ اب

اگر یہ بات درست ہی کہ انسان بتدریج مختلف حالتوں سے ترقی کرتا ہوا بنا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان بننے کی صورت میں اسنے چاند سورج ستاروں اور شیروں بھیڑیوں اور سانپوں کو اچانک نہیں دیکھا۔ بلکہ وہ اس سے پہلی حالت میں بھی ان چیزوں کو دیکھتا آیا ہے اور بعض کا مقابلہ کرتا چلا آیا ہے اور بعض کو قطعاً نظر انداز کرتا آیا ہے۔ پس اگر جبکہ انسان بندریا اس سے بڑھکر کسی اور جانور کی صورت میں سانپ سے خوب آشنا تھا بلکہ اس کا مقابلہ کیا کرتا تھا تو کیونکر ممکن ہے کہ جب وہ اس حالت سے ترقی کر جائے تو اسے پوجنے لگجائے۔ یہ چیز نئی نہ تھی بلکہ ایسی چیز تھی جس سے وہ نسلاً بعد نسل واقف چلا آیا تھا پس ارتقاء کا مسئلہ بھی اس خیال کو رد کر رہا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہی کہ اگر یہ درست ہی کہ خوف و حیرت سے خدا کا خیال پیدا ہوا تو چاہئے تھا کہ سب سے پہلے چاند اور سورج کی پرستش شروع ہوتی۔ کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو سب کو اور سب سے پہلے نظر آتی ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جانوروں کی پرستش۔ ستارہ پرستی سے پہلے کی ہے۔ حالانکہ سورج۔ چاند وغیرہ کو ہر شخص شروع سے ہی دیکھتا چلا آیا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ خیال ہی غلط ہے کہ پہلے دوسری چیزوں کی عبادت شروع ہوئی بعد میں ایک وراء الوراء ہستی کا خیال پیدا ہوا ہے۔ خود تاریخ اسکو رد کر رہی ہے اور ان لوگوں کا استدلال تاریخ سے درست نہیں ہے۔ پرانی سے پرانی اقوام میں ہمیں ایک خدا کے خیال کا پتہ لگتا ہے۔

دنیا کی سب سے پرانی قوم کا خیال خدا کے متعلق

دنیا میں پرانی اقوام جواب تک محفوظ چلی آتی ہیں۔ ان میں سے سب سے پرانی مکسیکو کی قوم ہے۔ یہ قوم بہت پرانی سمجھی جاتی ہے۔ اور نہایت قدیم خیالات اس میں محفوظ پائے جاتے ہیں۔ جب ہم اس قوم کو دیکھتے ہیں کہ اس میں خدا تعالے کے متعلق کیا خیال ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گو یہ ایک نہایت ہی پرانی قوم ہے مگر اس میں ایک خدا کا خیال موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ایک خدا ہے جس کا نام اونا ولونا ہے۔ (Awona Wilona) جو سب کا خالق ہے۔ اور سب پر محیط ہے۔ اور سب باپوں کا باپ ہے۔ ابتدا میں جب کچھ نہ تھا۔ ولونا نے خیال کیا۔ اور اسکے خیال کرنے کے بعد اس خیال سے نمو کی طاقت پیدا ہوئی۔ اور وہ طاقت بڑھتے بڑھتے وسیع فضا کی صورت میں تبدیل ہوگئی

اور اس سے خدا کی روشنی جلوہ گر ہوئی۔ اور فضا سکڑنے لگی۔ جس سے یہ چاند۔ اور سورج اور ستارے بنے۔ یہ میکسیکو کے باشندوں کا نہایت ہی پرانا خیال ہے اب خدا تعالےٰ کے متعلق جو تازہ سے تازہ خیالات ہیں انکو ان سے ملا کر دیکھو وہ بھی ان کے مشابہ ہیں۔ عیسائیت میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ پہلے تاریکی تھی۔ پھر دنیا بنی اور اسلام میں بھی یہی ہے۔ یہ ہزاروں سال بعد کی تحقیقاتیں بھی یہی ثابت کرتی ہیں۔ اور یہی باتیں ہیں جو سائنس کہتی ہے۔ کہ پہلے بہت باریک ذرات تھے۔ جو بغیر کسی سبب اور ذریعہ کے اکٹھے ہوئے۔ اور بادل بنے۔ ان میں ایک جگہ ٹھوس ہو گئی۔ اسلئے کہ وہاں زیادہ مادہ جمع ہو گیا۔ اس جگہ نے دوسرے ذروں کو کھینچنا شروع کیا۔ اور کرہ بڑھنے لگا۔ اور اس میں گولائی آنے لگی۔ اس طرح بہت بڑا کرہ بنا۔ پھر اسکے ٹکڑے ہو گئے۔ کوئی سورج بنگیا۔ کوئی چاند۔ کوئی ستارے ۔

افریقہ کے قدیمی باشندوں کے خیال پھر افریقہ کی طرف آئیے۔ وہاں کے پرانے اور قدیمی باشندوں کے دماغ اتنے ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ کہ اگر انہیں پڑھایا جائے۔ تو بڑھاپے میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دماغ اس قدر ادنیٰ ہوتے ہیں۔ کہ سیکھی ہوئی باتوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ ان میں بھی ایک وراءالوراء ہستی کے خیال کا پتہ لگتا ہے۔ چنانچہ ان کے ایک قبیلہ کا خیال ہے کہ ایک وراءالوراء ہستی ہے۔ جو سب کی خالق ہے۔ اور اسے وہ نینگمو (Nyongmo) کہتے ہیں ۔

بابلیوں میں خدا کا عقیدہ پھر بابلیوں میں بھی یہی عقیدہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بابل کے ایک نہایت ہی پرانے بادشاہ کی ایک دعا نکلی ہے جو یہ ہے۔ کہ اے دائمی بادشاہ تمام مخلوق کے مالک تو میرا خالق ہے۔ اے بادشاہ تیرے رحم کے مطابق۔ اے آقا جو تو سب پر رحم کرنیوالا ہے تیری وسیع بادشاہت رحم کرنیوالی رحم والی ہو۔ اپنی الوہیت کی عبادت کی محبت میرے دل میں گاڑ دے۔ اور جو کچھ تجھے اچھا معلوم دیتا ہے۔ وہ مجھے دے۔ کیونکہ تو ہی ہے جس نے میری زندگی کو اس رنگ میں ڈھالا ہے ۔

کتنا اعلیٰ اور نبیوں والا خیال ہے۔ جو اس دعا میں ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ ممکن ہے میں کوئی چیز مانگوں۔ اور وہ میرے لئے مضر ہو۔ اسلئے اے خدا جو کچھ تجھے میرے لئے اچھا معلوم ہوتا ہے

وہ دے یہ اس قوم کی دعا ہے۔ جسے بت پرست کہا جاتا ہے +

دیگر اقوام کے خیال اسی طرح کنیڈا والے قدیمی باشندے ایک خدا کو مانتے ہیں۔

پھر آسٹریلیا کا علاقہ جو چند صدیوں سے ہی دریافت ہوا ہے۔ اور جہاں کے لوگ دنیا سے بالکل علیحدہ تھے۔ اور اس قدر وحشی اور خونخوار تھے۔ کہ ان کا قریباً خاتمہ کر دیا گیا۔ انکا ارنٹا (Arunta) نامی ایک قبیلہ ہے۔ وہ ایک ایسے خدا کا قائل ہے جو آسمان پر رہتا ہے اسے وہ الٹجیرا (Altjira) کہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ چونکہ حلیم ہے اسلئے سزا نہیں دیتا۔ اور اسلئے اس کی عبادت کی ضرورت نہیں +

افریقہ کا ایک وحشی قبیلہ جسے زولو (Zulu) کہتے ہیں ان میں بھی یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ ایک غیر مرئی خدا ہے جو سب دنیا کا باپ ہے۔ اس کا نام انکولنکولو (Unkulunkulu) بتاتے ہیں +

ہندوؤں میں خدا تعالےٰ کی غیر محدود طاقتوں کے متعلق خیال پایا جاتا ہے۔ چنانچہ درونا کے متعلق وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ عالم الغیب اور غیر محدود طاقتوں والا ہے چنانچہ اسکے متعلق ہندوؤں کا پرانا خیال ہے کہ " اگر کوئی آدمی کھڑا ہو یا چلے یا پوشیدہ ہو جائے، اگر وہ لیٹ جائے یا کھڑا ہو جائے۔ یا جو دو آدمی اکٹھے بیٹھکر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کریں بادشاہ درونا اسے جانتا ہے وہ وہاں بطور ثالث موجود ہے۔

" یہ زمین بھی درونا کی ہے۔ اور آسمان اپنے وسیع فضا سمیت بھی اسیکا ہے۔" " وہ شخص آسمان سے بھی بھاگ کر نکل جائے وہ بھی بادشاہ ورونا کی حکومت سے باہر نہیں جا سکتا"

اسی طرح آسٹریا کے قدیم وحشی باشندے نورینڈیر (Nurrendere) کو شریعت دینے والا خدا سمجھتے ہیں +

دومبو ایک پرانا وحشی قبیلہ نوریلی (Nurelli) کے نام سے ایک زبردست خدا کی پرستش کرتا ہے۔ افریقہ کا مشہور مغربی بنٹو قبیلہ نزامبی (Nzambi) تمام دنیا کا پیدا کرنیوالا اور بنی نوع انسان کا باپ قرار دیا جاتا ہے +

پس اس قدر قدیمی اور بعض وحشی قبائل کے اندر ایک زبردست غیر مرئی خدا

کا خیال پایا جانا بتاتا ہے کہ آہستہ آہستہ خدا کا خیال نہیں پیدا ہوا بلکہ الہامی طور پر آیا ہے

اہل یورپ کا اعتراض بعض لوگ اوپر کے بیان پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ یہ تو مانا کہ ایک غیر مرئی قادر مطلق خدا کا خیال پرانی اور قدیمی اقوام میں پایا جاتا ہے۔ مگر یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ خیال بھی ان قوموں میں پرانا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو خود وحشی قبائل میں الہام کا خیال موجود ہے پرانے سے پرانے قبائل کو لیا جائے وحشی سے وحشی قبائل کی روایات پر غور کیا جائے تو انمیں الہام کا خیال موجود ہے اور وہ یقین کرتی ہیں کہ انکے پاس جو قانون ہے وہ خدا تعالیٰ نے الہام کیا ہے۔ پس یہ شہادت جو ان اقوام کی ہے جو الہام یا عدم الہام کی حقیقت سے ناواقف ہیں بتاتا ہے کہ یہ خیال کسی تدریجی ترقی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ الہام کے ذریعہ سے قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ویدوں کو لیتے ہیں۔ ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین اور شریعت کے عالم بالا سے نازل ہونیکا خیال بہت پرانا ہے +

آسٹریلیا کے وحشی قبائل دنیا کی قدیم ترین حالت کے نمائندے ہیں ان سے جب پوچھا جائے کہ وہ کیوں بعض رسوم کی پابندی کرتے ہیں تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ نُرنڈیڈرُ نے انکو ایسا ہی حکم دیا ہے یعنی خدا نے +

امریکہ کے پرانے قبائل میں بھی یہ خیال موجود ہے کہ انکے قوانین الہام کے ذریعہ سے بنے ہیں +

یہ شہادتیں بتاتی ہیں کہ تدریجی ترقی سے یہ خیالات پیدا نہیں ہوئے بلکہ کسی ایک شخص کی معرفت جو اپنے آپ کو ملہم قرار دیتا تھا مختلف قبائل میں پھیلے۔ لوگ ان اشخاص کو جھوٹا کہہ سکتے ہیں۔ فریبی کہہ سکتے ہیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خیالات تدریجی ترقی کا نتیجہ تھے ورنہ یہ روایات قدیم وحشی قبائل میں نہ پائی جاتیں +

دوسرا جواب یہ ہے کہ آثار قدیمہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بہت سی قومیں جنمیں اب مشرکانہ خیالات ہیں ابتدا میں ان میں ایک خدا کی پرستش تھی چنانچہ میگز ایک محقق ہے۔ اس نے چین کے متعلق تحقیقات کی ہے۔ کہ گو وہاں ہر چیز کا الگ خدا مانتے ہیں

آگ کا خدا۔ چولھے کا خدا۔ توے کا خدا۔ غرضکہ ہر چیز کا خدا الگ الگ ہے۔ گویا ہندوستان سے بھی بڑھکر شرک ہے کہ جہاں صرف ۳۳ کروڑ دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پرانے زمانہ میں وہاں ایک ہی خدا کی پرستش کیجاتی تھی۔ اسی طرح بابل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ بابل وہ شہر ہے جسے ہمارے ملک کے بچے بھی جانتے ہیں۔ اور ہاروت ماروت کے قصے کی وجہ سے خوب مشہور ہے۔ اس شہر کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس پرانے زمانہ میں ایک خدا کا خیال موجود تھا ٭

تیسرا جواب تیسرا جواب یہ ہے۔ کہ قدیم اقوام کے متعلق یہ کہنا کہ ممکن ہے ان میں ایک خدا کا خیال بعد میں پیدا ہوگیا ہو۔ عقلاً غلط ہے۔ کیونکہ یہ ایک مانا ہوا قاعدہ ہے کہ جو خیال کسی قوم میں بعد میں پیدا ہو اس کی عظمت زیادہ ہوتی ہے۔ اور جو دیوتا بعد میں مانا جائے اسکی عبادت زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ بات تمام قدیم اقوام کے حالات سے معلوم ہوتی ہے کہ انمیں ایک خدا کا خیال تو موجود ہے لیکن پرستش چھوٹے دیوتاؤں کی زیادہ ہے اگر یہ خیال درست ہے کہ تدریج سے ایک خدا کا خیال پیدا ہوا ہے تو چاہئے تھا کہ تمام اقوام میں ایک خدا کی پرستش زیادہ ہوتی اور چھوٹے دیوتا اگر باقی بھی رہتے تو محض رسمی طور پر حقیقتاً لوگوں کا ان سے لگاؤ نہ ہوتا مگر واقعہ اسکے بالکل برخلاف ہے۔ چھوٹے دیوتاؤں کی پرستش ہی قدیم قبائل کرتے ہیں اور خدا کی پرستش شاذونادر ہی کسی قبیلہ میں پائی جاتی ہے۔ پس یہ صورت حالات اس تدریجی ترقی والے مقولہ کو باطل کر دیتی ہے۔

پھر ایک اور ذریعہ بھی اس سوال کو حل کرنیکا ہے اور وہ موجودہ زمانے کے تغیرات سے استنباط ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد کہ خدا کے خیال نے تدریجی ترقی کی ہے اصل میں صرف اس خیال پر مبنی ہے کہ تمام چیزوں میں تدریجی ترقی یا ارتقاء پایا جاتا ہے۔ اور اس سے انسانی دماغ مستثنےٰ نہیں۔ اب ہم اس اصل کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی حالت کو دیکھتے ہیں۔ دشمن بھی اقرار کرتے ہیں کہ اسلام خالص توحید پر مبنی تھا اسکے ابتداء میں شرک کا ایک شمہ بھی اس کی تعلیم میں شامل نہ تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اب اسلام کی کیا حالت پہنچ گئی ہے۔ کیا اب مسلمانوں میں قبر پرست درخت پرست۔ جن پرست۔ بھوت پرست۔ ستارہ پرست

اعتراض کہ اگر خدا تعالیٰ واقع میں ہوتا تو ابتداء میں ایک خدا کا خیال ہوتا۔ باطل ہے اور اس اعتراض کی بنیاد غلط واقعات پر رکھی گئی ہے۔

اگر خدا ہے تو دکھاؤ ان ابتدائی بحثوں کے بعد خدا تعالیٰ کے وجود کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت ثابت ہو جاتی ہے اور اسکے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا تو منکرین خدا یہ کہدیا کرتے ہیں کہ اچھا ہم ماننے کو تیار ہیں لیکن تم خدا ہمیں دکھا دو۔ چنانچہ پڑھے لکھے دہریہ تک بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ لاؤ خدا دکھا دو۔ پھر ہم مان لینگے۔ اگر خدا ہے تو چاہئے تھا کہ آسمان سے آواز آتی۔ کہ میرے بندو اکٹھے ہو جاؤ۔ میں تمہیں اپنا مُنہ دکھاتا ہوں۔ اگر صبح و شام اسی طرح ہوتا۔ تو سب لوگ خدا کو مان لیتے۔ پس اگر خدا ہے تو دکھا دو۔ ہم مان لینگے۔

مجمل جواب اسکا مجمل جواب تو یہ ہے۔ جو صوفیا نے دیا ہے۔ کہ وہ قریب ہے۔ اور سب سے زیادہ قریب۔ اور وہ دور ہے۔ اور سب سے زیادہ دور۔ اور بہت ہی قریب کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اور بہت دور کی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ پس خدا تعالیٰ جو بندہ سے نہایت دُور ہے۔ اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اور اسی طرح وہ بندہ سے اس قدر قریب ہے کہ حبل الورید سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اسلئے بھی نظر نہیں آتا۔ کیا کبھی کسی نے اپنی حبل الورید دیکھی ہے۔ یا اگر کوئی پانی میں مُنہ ڈال لے۔ تو اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے؟ پس ایک بات تو خدا کے متعلق ہم یہی کہتے ہیں۔ کہ وہ چونکہ اتنا قریب ہے۔ کہ حبل الورید سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اسلئے انسان اسے دیکھ نہیں سکتا۔ انہی دنوں ایک دوست نے سُنایا۔ کہ ایک شخص جرمنی وغیرہ سے ہو کر آیا۔ ہمیں نماز پڑھتے دیکھکر کہنے لگا۔ اس قسم کی ورزش کا کیا فائدہ؟ اس کی بجائے کوئی اور معقول ورزش کر لیا کرو جس کا کچھ فائدہ بھی ہو۔ اسے کہا گیا۔ یہ ورزش نہیں بلکہ عبادت ہے اس نے کہا کس کی عبادت؟ کہا گیا خدا کی عبادت۔ اس نے کہا خدا کہاں ہے؟ اگر ہے تو دکھاؤ۔ حسین تو اپنے آپ کو دکھاتے ہیں۔ اگر خدا سب سے زیادہ حسین ہے۔ تو کیوں چھپا ہوا ہے؟ اس دوست نے کہا۔ میں نے کاغذ پر اللہ لکھکر دور سے اسے دکھایا۔ اس نے کہا کچھ نہیں نظر آتا۔ پھر اسے کہا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں یہی فرماتا ہے کہ نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ میں انسان سے اسکی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ اور اس کاغذ کو

اس کی آنکھوں کے بالکل قریب رکھدیا۔ اور کہا بتاؤ اب تمہیں کیا نظر آتا ہے۔ اس نے کہا اب تو کچھ نہیں نظر آتا۔ اس پر اسے بتایا گیا کہ جب خدا اس سے بھی زیادہ قریب ہے تو وہ تمہیں ان آنکھوں سے کس طرح نظر آجائے۔ تو خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کرنے والوں کو مجمل جواب تو یہ دیا جاتا ہے۔ کہ چونکہ خدا قریب سے قریب اور بعید سے بعید ہے۔ اس لئے ان دونوں وجہ سے نظر نہیں آتا۔

ہر چیز کے دیکھنے کا طریق الگ ہے

اور اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے دیکھنے اور معلوم کرنے کا طریق الگ ہے۔ اور یہ کہنا کہ دوسری چیزوں کی طرح ہی خدا بھی ہمیں دکھاؤ۔ نہایت ہی بے ہودہ اور خلاف عقل سوال ہے۔ ہم نے کب کہا ہے کہ خدا کوئی مادی چیز ہے جسے اور مادی چیزوں کی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا وہ بادشاہ کے پاس جاکر کہنے لگا۔ میں نبی ہوں مجھے قبول کرو۔ بادشاہ نے کہا کس طرح معلوم ہو۔ کہ تم نبی ہو۔ وزیر نے کہا یہ تو کوئی مشکل بات نہیں۔ ابھی اسکا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ کہکر اس نے اس مدعی نبوت کے سامنے ایک تالہ رکھدیا۔ اور کہا اگر تم نبی ہو تو اسے کھول دو۔ اسنے کہا میںنے نبی ہونے کا دعوے کیا ہے۔ نہ کہ لوہار ہونیکا کہ تالہ کھولوں۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو کہلاتے تو فلاسفر یعنی عقلمند ہیں مگر خدا کے متعلق اسی قسم کا مطالبہ کرتے ہیں جس قسم کا وزیر نے مدعی نبوت سے کیا تھا۔ انہیں اتنا تو سمجھنا چاہئے۔ کہ ہم آٹے کا خدا نہیں مانتے۔ اور نہ پتھر کا خدا مانتے ہیں۔ اگر اس قسم کے خداؤں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو مندروں میں دیکھ لیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک وراء الوریٰ ہستی مانتے ہیں۔

ہر چیز دیکھکر نہیں مانی جاتی

اور یہ صاف بات ہے کہ دنیا کی ہر ایک چیز دیکھکر ہی نہیں مانی جاتی۔ بلکہ اور طریقوں سے بھی مانی جاتی ہیں۔ مادہ اشیاء میں سے بھی بعض کے وجود کا علم سونگھنے سے بعض کا چکھنے سے بعض کا ٹٹولنے سے بعض کا سننے سے معلوم ہوتا ہے۔ پس اگر کوئی کہے۔ کہ گلاب کے پھول کی خوشبو مجھے دکھادو۔ یا لوہے کی سختی مجھے دکھادو۔ یا خوبصورت آواز دکھادو۔ تو وہ شخص نہایت ہی نادان ہوگا۔ اور جب مادی

چیزوں میں سے بھی سب کی سب دیکھنے سے نہیں مانی جاتیں۔ تو پھر خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ ہم اسے دیکھے بغیر نہیں مانینگے۔ کس قدر نادانی ہے۔ علاوہ ازیں سب چیزیں حواس خمسہ سے بھی نہیں معلوم کی جاسکتیں۔ بعض قیاس سے بھی معلوم کی جاتی ہیں۔ ایسی چیزیں نہ سونگھی جاتی ہیں نہ چکھی جاتی ہیں نہ دیکھی جاتی ہیں نہ ٹٹولی جاتی ہیں۔ نہ سنی جاتی ہیں۔ جیسے غصہ ہے۔ کس طرح پتہ لگتا ہے۔ کہ فلاں میں غصہ ہے؟ کیا چھوکر یا سنکر۔ یا چکھ کر۔ یا دیکھکر۔ یا سونگھکر۔ ان پانچوں طریقوں میں سے کسی سے بھی اس کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا۔ پھر کیونکر معلوم ہوتا ہے۔ کہ غصہ کوئی چیز ہے۔ اور لوگوں کو آیا کرتا ہے۔ اس طرح کہ انسان سمجھتا ہے۔ کہ میں بھی آدمی ہوں۔ اور دوسرے بھی آدمی ہیں۔ پس وہ اپنے غصہ کی حالت کی کیفیات کو جب دوسروں کی ویسی ہی کیفیات سے ملا کر دیکھتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ چیز اوروں میں بھی پائی جاتی ہے اور جس وقت وہ کیفیات دوسرے میں دیکھتا ہے خیال کر لیتا ہے کہ اسوقت اسکو غصہ آیا ہوا ہے۔ اسی طرح اور کئی باتیں ہیں۔ جو دوسرے کی کیفیت کو اپنے اوپر چسپاں کرنے سے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً درد ہے۔ نہ یہ چکھی جاتی ہے نہ سونگھی جاتی ہے۔ نہ دیکھی جاتی ہے۔ نہ چھوئی جاتی ہے۔ نہ سُنی جاتی ہے۔ پھر کس طرح پتہ لگایا جاتا ہے۔ کہ کسی شخص کو واقع میں درد ہے اور کس طرح ہے۔ اس طرح کہ اپنے نفس پر وہ حالت گزری ہوئی ہوتی ہے اور اس کے آثار کا علم ہوتا ہے اسلئے جب کوئی کہتا ہے۔ کہ مجھے فلاں جگہ درد ہے تو دوسرے انسان اس کی شکل اور حالت کو دیکھکر درد کا حال معلوم کر لیتے ہیں اور اپنے تجربہ کی بنا پر جو تکلیف اسے ہو رہی ہوتی ہے اس کا اندازہ کر لیتے ہیں۔

غرض بعض چیزیں ایسی ہیں کہ انکا علم حواس خمسہ سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ان چیزوں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو قیاس سے معلوم ہوتی ہیں۔ دوسری وہ جو اندرونی حسوں سے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً غیر کا غصہ تو قیاس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو جب غصہ یا پیار آتا ہے۔ تو اس کا پتہ قیاس سے نہیں لگایا جاتا۔ اور نہ وہ سونگھنے چکھنے دیکھنے۔ سننے اور چھونے سے معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ انسان کی اندرونی حسیں اسے محسوس

کرتی ہیں۔

پھر بعض ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے اثرات سے ان کو معلوم کرتے ہیں۔ جیسے مقناطیس ہے۔ اسے جب لوہے کے پاس رکھا جائے تو اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس سے ہم سمجھ لیتے ہیں۔ کہ اس میں جاذب کی طاقت ہے اور جب اس امر کا ہم بار بار تجربہ کر لیتے ہیں تو ہمیں اور بھی یقین ہو جاتا ہے اور اگر اسکے اثر کو ہم منتقل کر سکیں تو اس سے ہمیں یقین اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقتاً کوئی وجود رکھتی تھی جس کی وجہ سے منتقل بھی ہوگئی۔ اس طاقت مقناطیسی کو ہم دیکھکر یا سونگھکر یا چکھ کر یا چھو کر یا سن کر نہیں مانتے۔ بلکہ اسکے اثر کی وجہ سے مانتے ہیں۔ اس قسم کی اشیاء بھی لاکھوں کروڑوں ہیں اور کوئی عقلمند انکا انکار نہیں کرتا۔ پس جبکہ دنیوی اور مادی اشیاء میں حواس خمسہ کے سوا اور ذرائع سے بھی انسان چیزوں کے وجود کا پتہ لگایا کرتا ہے تو خدا تعالےٰ جو مادی نہیں اسکے متعلق یہ شرط کیونکر لگائی جا سکتی ہے کہ اسے دکھا دو یا حواس خمسہ کے ذریعہ سے اس کا ثبوت دو۔ ثبوت بے شک ہر دعویٰ کے لئے ضروری ہے مگر وہ ثبوت دعویٰ کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ بے تعلق اور بے جوڑ۔

خدا تعالےٰ کی ذات خدا تعالےٰ کی ذات کیسی ہے؟ اسکے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔ ابصار علم کو بھی کہتے ہیں۔ اسلئے اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ تم خدا کو ان ظاہری آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ اپنے علم اور فہم سے بھی نہیں دیکھ یا معلوم کر سکتے۔ مگر جب خدا تعالےٰ خود تم پر اپنا اثر ڈالے۔ تو جس طرح لوہے پر مقناطیس کا اثر پڑنے سے مقناطیس کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اسی طرح تم خدا کے اثر سے اس کو معلوم کر سکتے ہو۔

اس مرحلہ پر پہنچکر منکرین خدا کا یہ سوال ہوتا ہے کہ اچھا جس طرح تم چاہو۔ خدا کی ہستی کو ثابت کرو۔ اور جو ثبوت اس کے ہونے کے ہو سکتے ہیں۔ وہ دو۔ اس لئے اب وہ دلائل بیان کئے جاتے ہیں۔ جن سے خدا کی ہستی ثابت ہوتی ہے۔

ہستی باری کی پہلی دلیل اس کے لئے پہلی دلیل تو ہم قبولیت عامہ کی لیتے ہیں

یعنی یہ کہ خدا کا خیال ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ اور خدا کے بڑے سے بڑے منکر بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ قبولیت عامہ بہت بڑی دلیل ہے۔ چنانچہ سپنسر جو دہریت کا بانی ہوا ہے (اگرچہ اس نے اس کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن اسی کی کتابوں پر دہریت کی بنیاد رکھی گئی ہے) اسنے لکھا ہے کہ جس بات کو ساری دنیا مانتی ہو۔ وہ بالکل غلط نہیں ہو سکتی اس کی ضرور کچھ نہ کچھ حقیقت ہوتی ہے۔ پس جب کہ ہم ساری اقوام کو دیکھتے ہیں کہ ان میں خدا کا خیال پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی مینے بتایا ہے۔ تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ یہ خیال کہیں سے نکلا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس دلیل کو پیش کیا ہے۔ فرماتا ہے۔ ان من امة الا خلا فیھا نذیر۔ کہ کوئی قوم دنیا کی ایسی نہیں جس میں پھرے پکارنے والے نہیں پھر گئے۔ اور یہ نہیں بتا گئے۔ کہ میں ہوں۔ یہی ہر قوم میں پھرنے والے تھے۔ جنہوں نے ان میں خدا کے ہونے کا خیال پھیلایا۔ پس یہ قبولیت عامہ کی دلیل ہے۔ دہریت نے اس کے مقابلہ میں بڑے زور لگائے۔ اور آج ہی نہیں۔ بلکہ پہلے سے لگا رہی ہے۔ مگر پھر بھی دہریت ہی مغلوب ہوتی رہی اور خدا کے ماننے والے ہمیشہ سے ہوتے رہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے۔ کہ دہرئے بھی مرتے وقت یہی کہتے رہے ہیں، کہ ہم خدا کی ہستی کا انکار نہیں کرتے ممکن ہے کہ خدا ہو۔ چنانچہ ولایت میں ایک دہریے نے مرتے وقت بہت بڑی جائداد اسبات کے لئے وقف کی۔ کہ اسکے ذریعہ خدا کی ہستی پر بحث جاری رہے۔ منکرین خدا کے متعلق تو اس قسم کی باتیں ثابت ہیں۔ مگر خدا کے ماننے والوں میں سے کبھی کسی نے مرتے وقت نہیں کہا۔ کہ شائد خدا نہ ہو۔

حضرت مسیح موعود سنایا کرتے تھے کہ ہمارے* ماموں میر محمد اسمٰعیل صاحب کے ساتھ ایک دہریہ پڑھا کرتا تھا۔ ایک دفعہ زلزلہ جو آیا۔ تو اس کے مُنہ سے بے اختیار رام رام نکل گیا۔ میر صاحب نے جب اس سے پوچھا کہ تم تو خدا کے منکر ہو۔ پھر تمنے رام رام کیوں کہا۔ کہنے لگا غلطی ہو گئی۔ یونہی منہ سے نکل گیا۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ دہریے جہالت پر ہوتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کے ماننے والے علم پر۔ اسلئے مرتے وقت یا خوف کے وقت دہریہ یہ کہتا ہے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ ورنہ اگر وہ علم پر ہوتا۔ تو اسکی بجائے

*ہمارے سے مراد حضرت خلیفۃ المسیح ثانی ہیں۔

یہ ہوتا کہ مرتے وقت دہریہ دوسروں کو کہتا۔ کہ خدا کے وہم کو چھوڑ دو کوئی خدا نہیں۔ مگر اس کے الٹ نظارے نظر آتے ہیں۔ پس خدا تعالےٰ کی ہستی کی یہ بہت زبردست دلیل ہے۔ کہ ہر قوم میں یہ خیال پایا جاتا ہے +

ہر قوم میں خدا کا خیال ہونے پر اعتراض

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ بے شک خدا کے ماننے کا عام خیال پایا جاتا ہے۔ مگر کوئی دو خیال آپس میں متفق دکھا دو۔ ایک اگر کہتا ہے۔ کہ ایک خدا ہے تو دوسرا کہتا ہے۔ دو ہیں۔ تیسرا کہتا ہے تین ہیں چوتھا کہتا ہے لاکھوں کروڑوں ہیں۔ پانچواں کہتا ہے ہر چیز خدا ہے۔ ایک وشنو اور شنو کو خدا مانتے ہیں۔ دوسرے ایک نور کا اور ایک تاریکی کا خدا مانتے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ یہ خیال یقین کی بنا پر نہیں۔ بلکہ وہم ہے +

جواب

اسکے متعلق ہم کہتے ہیں۔ اس خیال کا وہ حصہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں وہ باطل ہے۔ مگر جس حصہ کو سارے کے سارے مان رہے ہیں۔ وہ کیوں باطل قرار دیا جائے۔ سارے کے سارے یہ تو کہتے ہیں کہ خدا ہے سہی۔ اس کے آگے جو کچھ کہتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم کہینگے کہ ان کی یہ تشریحیں غلط ہیں۔ اور خدا ہے والا خیال درست ہے۔ جیسے ایک شخص کہے کہ مینے دس سوار دیکھے۔ دوسرا کہے میں نے بیس دیکھے تیسرا کہے مینے پچیس دیکھے۔ توکیا یہ کہیں گے۔ کہ کسی نے ایک بھی سوار نہیں دیکھا۔ اگر انہوں نے فریب اور شرارت نہیں کی۔ اور دھوکہ بنا کر نہیں لائے۔ تو یہی کہا جائیگا۔ کہ سوار تو ضرور تھے۔ آگے گننے اور اندازہ لگانے میں ان کو غلطی لگ گئی۔ اسی طرح دنیا کی مختلف قوموں کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اگر ان کی شرارت نہیں اور وہ دہوکہ نہیں دیتے تو بات یہی ہے کہ انہوں نے خدا کے متعلق دیکھا کچھہ ضرور ہے۔ مگر بھول جانے کی وجہ سے بعد میں کچھ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ ورنہ یہ غیر ممکن ہے کہ ہزاروں قومیں سینکڑوں ملکوں میں رہنے والی جن میں سے بعض کو آپس میں ملنے کا بھی کبھی اتفاق نہیں ہوا سب کی سب ایک زبان ہو کر اس امر کا اقرار کرنے لگیں کہ اس مخلوق کا ایک خالق ہے۔ یہ اتفاق اور اتحاد بلا کسی قوی وجہ کے بالکل ناممکن ہے +

ہستی باری کی دوسری دلیل

دوسری دلیل جو خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق قرآن کریم نے دی ہے، یہ ہے۔ قل ھو اللہ احد۔ کہو خدا ہے۔ اور ہے بھی ایک۔ اس آیت میں جو یہ دو دعوے کئے گئے ہیں۔ کہ (۱) خدا ہے اور (۲) ایک ہی۔ ان میں سے پہلے کا ثبوت تو دیا کہ اللہ الصمد اور دوسرے کے دو ثبوت دیئے۔ کہ (۱) لم یلد ولم یولد (۲) ولم یکن لہ کفواً احد۔ شرک دو قسم کا ہے۔ ایک تو یہ کہ کئی وجود خدا کی حیثیت رکھنے والے ہوں۔ چاہے اس سے چھوٹے ہوں یا بڑے۔ دوسرے یہ کہ خدا کے سوا باقی ہو تو مخلوق ہی مگر اسے خدائی کا درجہ دیا گیا ہو۔ تو ایک شرک فی الذات ہے۔ اور دوسرا شرک فی الصفات مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے تینوں امور کا ثبوت دیا ہے۔ اول خدا کی ذات کا دوسرے خدا کے واحد فی الذات ہونیکا۔ تیسرے واحد فی الصفات ہونیکا۔ چونکہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق بحث کر رہا ہوں اسلئے میں صرف اس آیت کو لیتا ہوں جس میں ہستی باری پر بحث ہے اور وہ اللہ الصمد کے الفاظ ہیں۔ یعنی خدا اپنی ذات میں کامل ہے۔ صمد کے معنے ہوتے ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو اور باقی چیزیں اسکی محتاج ہوں۔ اب اس حقیقت کو دنیا میں دیکھو کس طرح واضح طور پر ہر جگہ اسکا ثبوت ملتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز نہیں جو اپنی ذات میں کامل ہو ہر چیز اپنے وجود کے لئے دوسری اشیاء کی محتاج ہے اور بغیر ان کے قائم نہیں رہ سکتی +

خدا کے سوا ہر چیز دوسری کی محتاج ہے

حکمت صناع کے باریک سے باریک ذرات کی طرف چلے جاؤ۔ ہر ایک ذرہ کا دوسرے ذرہ پر اثر پڑ رہا ہے۔ کہیں نور کا اثر ہو رہا ہے۔ کہیں ایتھر کا اثر ہو رہا ہے۔ انسان کامل چیز سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ پانی۔ روٹی اور ہوا کا محتاج ہے۔ سورج ہے جو گیس کا محتاج ہے۔ اپنے جرم کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے سیاروں سے مواد لینے کا محتاج ہے۔ اور بیسیوں اشیاء کا محتاج ہے۔ زمین ہے تو وہ اپنے وجود کے قیام کیلئے کہیں دوسرے ستاروں کی کشش کی کہیں کہیں کرہ ہوا کی ایتھر کی نئے مادہ کی محتاج ہے۔ غرض کسی بڑی سے بڑی چیز کو لیکر باریک در باریک کرتے جاؤ۔ تو محتاج ہی محتاج ثابت ہوگی۔ پس جب ہر چیز

جو ہمیں دنیا میں نظر آتی ہے وہ اپنے وجود کے لئے دوسری اشیار کی محتاج ہے اور یہ احتیاج بتا رہی ہے کہ دنیا کا کارخانہ اپنی ذات میں قائم نہیں بلکہ اسکا چلانیوالا کوئی اور ہے کیونکہ محتاج الی الغیر چیز اپنی خالق آپ نہیں ہو سکتی نہ ہمیشہ سے ہو سکتی ہے +

کوئی کہہ سکتا ہے، کہ چیزوں کی یہ احتیاج موجودہ تحقیقات کی رو سے ہے۔ جب تحقیقات مکمل ہو جائیگی۔ تو شائد ثابت ہو جائے کہ بہ حیثیت مجموعی دنیا کسی کی محتاج نہیں۔ اوّل تو اس کا یہ جواب ہے کہ شائد نئی تحقیق سے دنیا کی احتیاج اور بھی واضح ہو جائے اور اسکے خالق کا وجود اور بھی زیادہ روشن ہو جائے۔ پس یہ کوئی اعتراض نہیں۔ اسوقت تک تحقیقات کے کئی دور بدلے ہیں مگر یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ قائم ہوا ہے کبھی اسکے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوئی پس ہر جدید تحقیق کے بعد اس اصل کا اور بھی زیادہ پختہ ہو جانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ آئندہ تحقیق اسے باطل نہیں کرے گی، بلکہ ثابت کریگی۔ لیکن اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ کوئی ایسا ذرہ معلوم ہو جائے جو اپنی ذات میں کامل ہو تو پھر بھی اسکے جوڑنے جاڑنے والے کی ضرورت رہیگی۔ لیکن درحقیقت یہ عقلاً محال ہے کہ کوئی ذرہ اپنی ذات میں کامل ہو بغیر بالارادہ ہستی کے اور قادر مطلق وجود کے یہ طاقت کسی میں نہیں پائی جا سکتی +

پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے، کہ وہ مادہ جسے اپنی ذات میں مکمل قرار دیا جائے اسکی لئے دوسری شکل اختیار کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ تغیر دوسری شئے سے ملنے سے ہوتا ہے اور ملنے کی طاقت اس میں ہوتی ہے جو نامکمل ہو کامل شے چونکہ تغیر قبول نہیں کرتی وہ کسی اور چیز سے حقیقی طور پر مل بھی نہیں سکتی۔ اس کا ملنا ایسا ہی ہو سکتا ہے جس طرح کہ کھانڈ کے ذرے آپس میں ملکر پھر کھانڈ کی کھانڈ ہی رہتے ہیں۔ پس اگر ایسا کوئی ذرہ فی الواقع ہے تو یہ دنیا اس سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ دنیا تو بے تعداد تغیرات کا مقام ہے غرض کائنات عالم پر غور کرنے سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کی ہر چیز تغیر پذیر ہے اور اپنی ہستی کے قیام کے لئے دوسروں کی محتاج۔ اسلئے کسی ایسی ہستی کا ماننا جو ان محتاج ہستیوں کو وجود میں لانیوالی ہو اور ایک قانون کے ماتحت چلانیوالی ہو ضروری ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک مخفی طاقت سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ مخفی طاقت بالارادہ ہے

یا بلاارادہ - اگر بلا ارادہ ہے تو وہ خود دوسری چیزوں سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ تمام طاقتیں دوسری چیزوں کی حرکت یا باہمی ترکیب سے پیدا ہوتی ہیں اور اگر بالارادہ ہے تو ہمارا دعویٰ ثابت ہے - ہم بھی تو ایسی ہی طاقت کو منوانا چاہتے ہیں - غرض کہ اللہ الصمد میں خدا تعالےٰ کے وجود کی ایک نہایت عجیب دلیل دی گئی ہے +

تیسری دلیل مسئلہ ارتقا

وہ مسئلہ جو خدا کے وجود کے خلاف سب سے زیادہ پیش کیا جاتا ہے - ارتقا کا مسئلہ ہے - یعنی یہ دنیا جو ہمیں نظر آتی ہے - پہلے دن سے اسی طرح نہیں چلی آئی بلکہ پہلے باریک ذرات تھے - جو لاکھوں سال بعد ایک سے دو ہوئے - دو سے تین - پھر چار - پانچ حتیٰ کہ اسی طرح بڑھتے گئے - ادھر نباتات اور حیوانات میں اسی طرح آہستہ آہستہ ترقی ہوتی گئی - جو بہتر نسل تھی - وہ اور زیادہ بہتر پیدا کرتی گئی - حتیٰ کہ بندر بن گیا - اور پھر اس سے اوپر بعض اور جانور اور پھر ان سے آدمی بنے - ہم اس بات کو تو تسلیم نہیں کرتے کہ بندر سے انسان بنے - مگر ہمیں قرآن کریم یہ ضرور بتاتا ہے - کہ دنیا کی پیدائش تدریجی تغیر کے ساتھ ہوئی ہے - قرآن کریم اس تغیر کے متعلق جو کچھ بتاتا ہے - اسکی مثال پہاڑوں سے دی جا سکتی ہے - پہاڑ کو جہاں بھی دیکھو اسکا ایک سلسلہ نظر آئیگا - پہلے چھوٹا ٹیلا آتا ہے - پھر اس سے اونچا - پھر اس سے اونچا - اور جب اونچائی انتہا کو پہنچ جاتی ہے - تو پھر چوٹیاں نیچی ہونی شروع ہو جاتی ہیں - یہانتک کہ آہستہ آہستہ اونچائی بہت کم ہو جاتی ہے - اسکے بعد پھر وہ اونچی ہونی شروع ہو جاتی ہیں - پھر نیچی ہونے لگتی ہیں - حیوانات کی پیدائش میں بھی اس قسم کا ارتقا ضرور ہوا ہے - یعنی قبض اور بسط کی تدریجی رَوئیں دنیا میں ضرور چلی ہیں - یہ نہیں کہ ایک ہی دن میں سب چیزیں پیدا ہو گئیں یا یہ کہ ایک ہی دن میں ایک شے پیدا ہو گئی - سب چیزیں بھی تدریجاً پیدا ہوئیں اور ایک ایک چیز بھی آہستہ آہستہ ہی کامل ہوئی +

بس یہ ٹھیک ہے - کہ دنیا میں زندگی کی مختلف رَوئیں چلی ہیں - پہلے چھوٹی پھر اس سے بڑی - پھر اس سے بڑی - مگر یہ سب اپنی اپنی جگہ مستقل رَوئیں تھیں - یہ نہیں تھا کہ ایک ہی رَو ترقی کرتے کرتے مختلف شکلیں اختیار کر گئی - غرض پہلے نہایت ادنیٰ قسم کی

مخلوق بنی پھر اس سے اعلیٰ بنی پھر اس سے اعلیٰ۔ مگر یہ ترقی الگ الگ ہوئی اور مستقل طور پر
اور یہ غلط ہے کہ ایک ہی ادنیٰ حیوان سے ترقی کرتے کرتے تمام مخلوق بنگئی۔ بات یہ ہے کہ
جب زمین اس قابل تھی، کہ چھوٹے چھوٹے جاندار اس پر زندہ رہ سکیں اس وقت اس قسم کے
جاندار اس میں پیدا ہوئے۔ جب زیادہ صفائی اس کی فضاء میں پیدا ہوگئی تو زیادہ اعلیٰ
قسم کے جاندار اس میں پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ فضاء بالکل صاف ہوگئی اور اس میں
انسان جو سب سے اعلےٰ جاندار تھا پیدا ہوا۔ اور بالکل قرین قیاس ہے کہ انسان کی
پیدائش کے بعد جس قسم کے جاندار ان سڑاندوں سے پیدا ہو سکتے تھے جو انسان کی پیدائش
کے بعد پیدا ہو سکتی تھیں۔ انسان کی پیدائش کے بعد پیدا ہوئے۔ غرض آدمی بیشک
ارتقاء کے اصول کے ماتحت ہی پیدا ہوا ہے۔ مگر ہر جنس کا ارتقاء مستقل تھا نہ کہ ایک
چیز دوسری سے پیدا ہوئی۔ لیکن یہ نہیں کہ بندر سے انسان بنے۔ بلکہ یہ کہ انسان انسان
سے ہی بنے۔ اور بندر بندر سے اور کُتّے۔ کُتّے سے۔ مگر ہم کہتے ہیں، خواہ کچھ مان لو۔ اس
ارتقاء کے مسئلہ سے دہریت باطل ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ جو لوگ ادنیٰ جانوروں سے
ترقی کر کے انسان کی پیدائش مانتے ہیں۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ پہلے کچھ حیوانات پیدا ہوئے پھر
انہوں نے ترقی کی اور اور پیدا ہوئے۔ اور اس ترقی کے ساتھ ساتھ دماغ کی بھی ترقی
ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اعلےٰ درجہ کا انسان پیدا ہوگیا۔ اس پر آکر جسمانی ترقی تو بند ہوگئی لیکن
انسانی دماغ کی ترقی جاری ہے۔ ہم کہتے ہیں۔ یہی خدا کے ہونیکا ثبوت ہے۔ کیونکہ اگر
نیچر ہی سب چیزوں کو پیدا کرنے والی ہوتی۔ خدا نہ ہوتا۔ تو جسمانی ترقی بھی جاری رہتی۔
اور انسان سے آگے کچھ اور بنتا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جسمانی تغیر بند ہوگیا ہے۔ اور اسکے مقابلہ
میں انسانی روح کو مضبوط اور ترقی یافتہ بنانے کا سلسلہ جاری ہوگیا ہے۔ کونسی عقل اس
امر کو تسلیم کرسکتی ہے کہ نیچر ایک مقصد قرار دیتی ہے اور اس مقصد کے حصول پر اپنا راستہ بدل دیتی
ہے۔ انسان کی پیدائش پر ارتقاء جسمانی کا سلسلہ بند ہو جانا اور عقلی اور ذہنی ترقی کا
سلسلہ رک جانا بتاتا ہے کہ اس تمام ارتقاء کا بانی اور اس کا ملانیوالا کوئی ایسا وجود ہے
جس نے اس تمام دنیا کو ایک خاص غرض اور مقصد کیلئے پیدا کیا ہے۔ جب وہ مقصد

پورا ہوگیا تو ارتقاء کی لہریں جو جاری تھیں اس نے بند کردیں۔ اگر خدا تعالےٰ نہیں تو چاہیئے تھا کہ انسان کی پیدائش کے بعد بھی برابر مخلوقات میں تبدیلی ہوتی رہتی اور نئے سے نئے حیوانات پیدا ہوتے رہتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب وہ حیوان پیدا ہوگیا جس کا ذہن اس قابل تھا کہ اللہ تعالےٰ کی صفات کو اپنے اندر جذب کرسکے اور روحانی ترقیات حاصل کرسکے تو ارتقاء کی لہر بالکل پلٹ گئی اور بجائے جسمانی ترقی کے خالص ذہنی ترقی شروع ہوگئی گویا مقصود پورا ہوگیا اور اب جسمانی ارتقاء کی ضرورت نہ رہی جسکے ذریعہ سے ایک جنس سے دوسری جنس پیدا کیجائے۔ چنانچہ اس تغیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاً انسان کے بچپن کا عرصہ غیر معمولی طور پر لمبا کردیا گیا اور اسکی وجہ یہی ہے کہ انسان کی پیدائش کی غرض چونکہ علوم کا حصول ہے جو لمبی تربیت کو چاہتا ہے۔ اسلیئے اسکے لئے بچپن کا زمانہ بھی لمبا بنایا گیا ہے تا وہ دیر تک ماں باپ کا محتاج رہے اور ان کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو اور ان کے علم اور تجربہ کو انکی صحبت میں سیکھے اور ان کی تربیت سے فائدہ حاصل کرے۔ اگر انسان بندر سے ترقی کرکے ایک اندھی نیچر کے قوانین کے ذریعہ سے بنا تھا تو کیا وجہ کہ بندر اور اس سے اوپر کے ترقی یافتہ جانوروں کے بچپن کا زمانہ جبکہ بہت ہی چھوٹا تھا اور وہ پیدا ہوتے ہی چلنے کے قابل ہو جاتے تھے اور چھ سات ماہ میں اپنے بچاؤ اور اپنی حفاظت کا سامان مہیا کرنے کے قابل ہو جاتے تھے تو انسان کے لئے یہ نئی بات پیدا ہوئی کہ وہ چھ سات ماہ تک ایک قدم اُٹھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہے اور چودہ پندرہ سال تک ماں باپ کی مدد اور اعانت کا محتاج رہتا ہے۔ یہ بچپن کے زمانہ کی لمبائی ان مجبوریوں کی وجہ سے نہیں ہے جو ارتقاء کے مسئلہ کے لازمی نتیجہ ہیں، ہو کہ ہم اسے اسکی طرف منسوب کردیں بلکہ یہ ایک علمی ترقی کی وجہ سے ہے جس کے لئے انسان میں مخفی قوتیں رکھی گئی ہیں پس یہ امر ایک بالا رادہ قادر ہستی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ نہ کہ ارتقاء کی عام رو کی طرف۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے دانت اس قسم کے اسلیئے ہوگئے کہ اس کی غذا مختلف قسم کی تھی۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی دم اسلیئے نہیں رہی کہ وہ بیٹھنے کا عادی ہے (گو یہ ایک بیہودہ دلیل ہے) یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی انگلیوں کی شکل اسلیئے بدل گئی کہ وہ اس قسم کا کام نہیں کرتا تھا

جو دوسرے جانوروں کو کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسکا بچپن کا زمانہ لمبا کیوں ہو گیا کیونکہ یہ تغیر مادی اسباب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ایک آیندہ پیش آنیوالے مقصد کے پورا کرنے کے لئے ہے اور آئندہ ضرورت کو اور پھر علمی ضرورت کو صرف بالارادہ ہستی ہی پورا کر سکتی ہے۔ اس جگہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کا بچہ چونکہ دیر میں علوم سیکھتا ہے۔ اور حیوان کا بچہ جلدی سیکھ لیتا ہے۔ اسلئے انسان کی بچپن کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ اور حیوان کی چھوٹی کیونکہ اول تو یہ ارتقاء کے خلاف ہو۔ اگر ارتقاء کا مسئلہ درست ہوا اور حیوان ہمیشہ ذہنی ترقی کی طرف قدم مارتا رہا ہے تو چاہیئے کہ انسان کا بچہ جلدی سیکھے اور حیوان کا دیر میں لیکن اگر اس وجہ کو فرضاً درست بھی سمجھ لیا جائے تو بھی یہی ماننا پڑیگا کہ دنیا کا پیدا کرنے والا ایک علیم و حکیم وجود ہے۔ کیونکہ نیچر اس امر کا فیصلہ کیا کر سکتی ہے کہ کون علم جلدی سیکھتا ہے اور کون دیر میں۔ اسکو یہ کام تو ایک بالارادہ اور علیم و حکیم ہستی ہی کر سکتی ہے ؞

دنیا کس طرح پیدا ہوئی؟ اب میں پیدائش عالم کے متعلق قرآنی اصل بیان کرتا ہوں۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ یہ بتاتے ہوئے کہ دنیا کو اس نے کس طرح پیدا کیا فرماتا ہے:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ۔ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَى السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ۔ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ (۴۱۔ ۸ تا ۱۱)۔

فرماتا ہے۔ یک غالب اور علیم خدا جس کو پتہ تھا کہ وہ کیا کرنے لگا ہے اور کیا کرنا چاہیئے اس نے اس دنیا کو پیدا کیا۔ اے منکرو! تم تو اس خدا کا انکار کرتے ہو۔ جس نے زمین کو دو وقتوں میں پیدا کیا ہے۔ اور تم اس کے شریک قرار دیتے ہو۔ وہ تو سب جہانوں کو آہستہ آہستہ نشو و نما دیکر کمال تک پہونچانیوالا ہے۔ اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بلند کئے ؞

یورپ کی تحقیقات کہتی ہے۔ کہ شروع میں پہاڑ نہیں تھے۔ بعد میں بنے۔ اور قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے۔ کہ خدا نے پہلے زمین بنائی۔ پھر اس پر پہاڑ بنائے۔ جو کہ زندگی کے لئے ضروری تھے +

پھر فرماتا ہے۔ وَبَارَكَ فِيهَا اور ہم نے اس زمین میں برکت دی۔ برکت کے معنے زیادتی۔ صلاحیت اور پاکیزگی کے ہوتے ہیں۔ پس اسکے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے اس میں نہ ختم ہونے والے ذخیرے پیدا کئے اور اسے پاک کیا۔ گویا دو خوبیاں اس میں رکھیں ایک تو اس میں کثرت سے ایسے سامان پیدا کئے جو آئندہ استعمال ہونے والے تھے چنانچہ سمندروں کی خلق سے اور بعض اندرونی اور بیرونی تغیرات کے قوانین کے ذریعہ سے زمین کے ذخائر میں ایسی کثرت پیدا ہو گئی ہے کہ نہ پانی ختم ہوتا ہے نہ غذا اور نہ دوسری ضروری اشیاء۔ دوسرے معنے بارک کے پاکیزہ کر دینے کے ہیں۔ پس اسکے یہ معنی ہونگے کہ اسیوقت اسکے فضاء میں ایسی صفائی اور پاکیزگی پیدا کی گئی کہ جسکے ذریعہ سے اس میں جاندار اشیاء کا رہنا ممکن ہو گیا +

اسکے بعد فرماتا ہے کہ ہم نے اس میں غذائیں پیدا کیں یعنے نباتات و حیوانات پیدا ہوئے جو بوجہ سانس پر زندہ رہنے کے جَوّ کی صفائی کے محتاج تھے اور اسوقت تک پیدا نہیں کئے جاسکتے تھے جبتک کہ پہلے جَوّ کی صفائی نہ ہو جائے۔ اور فرماتا ہے کہ یہ سب کچھ چار اوقات میں ہوا۔ پھر وہ روحانی سلسلہ پیدا کیا گیا۔ جو پیدائش کا موجب تھا اور جس کا مظہر انسان ہے اور اس میں انسان کی روحانی ترقیات کے سامان پیدا کئے گئے اور ان کی حفاظت کا انتظام کیا گیا +

غرض قرآن کریم بتاتا ہے۔ کہ دنیا کے پیدا کرنے میں تدریجی ترقی کو مدنظر رکھا گیا ہے پہلے آسمان زمین نباتات اور جانوروں کو پیدا کیا گیا۔ ان تمام تغیرات کے بعد جو لاکھوں بلکہ کروڑوں سالوں میں ہوئے۔ انسانوں کو پیدا کیا گیا۔ اسی لئے فرشتوں نے کہا۔ کہ بھیڑ بکری۔ گھوڑے۔ اونٹ وغیرہ تو فساد نہیں کرتے تھے۔ انسان کہیں گھوڑے کی سواری کریگا کہیں کسی سے کچھ کام لیگا۔ اور کسی سے کچھ۔ اور اس طرح فساد ہوگا +

تو دلیل ارتقائی جس کو خدا کی ہستی کے رد میں پیش کیا جاتا ہے، وہی خدا کی ہستی کا ایک بیّن اور روشن ثبوت ہے۔ چنانچہ ایک دوسری جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔ اے انسانو! سوچو تو کہ زمین اور آسمان کے درمیان جو چیزیں بھی ہیں یہ سب تمہارے نفع کے لئے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ پھر اس امر پر غور کر کے کیا تم اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے کہ ایک بالا رادہ ہستی نے یہ سب کچھ ایک پہلے سے تجویز کردہ سکیم کے مطابق کیا ہے ✦

منکرین خدا کے مسئلہ ارتقا پر اعتراض

جس رنگ میں منکرین خدا ارتقا کو مانتے ہیں۔ اس پر کئی اعتراض وارد ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ تم کہتے ہو کہ انسان کے پیدا ہو جانے کے بعد پھر کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں، تغیر کے لئے بڑے لمبے زمانہ کی ضرورت ہے، اور انسان پر چونکہ ابھی اتنا زمانہ نہیں گذرا۔ جو تغیر کے لئے ضروری ہے۔ اسلئے اس میں تغیر نہیں ہوا۔ مگر ہم کہتے ہیں موجودہ زمانہ کٹ کر شروع ہوا ہے۔ یا وہی چلا آرہا ہے۔ جو پہلے شروع ہوا تھا۔ اگر وہی چلا آرہا ہے، تو اگر فرض کرو چھ ہزار سال کے بعد بندر انسان بنگئے تھے۔ تو بندروں کے انسان بننے کے زمانہ پر چھ ہزار سال گذرنے پر اب کیوں بندر انسان نہیں بنے؟ ✦

اس کے مقابلہ میں ہم کہتے ہیں کہ انسان بننے کے بعد اس کی عقلی اور دینی ترقی ہوتی جارہی ہے۔ اور جس قسم کا ارتقاء ہم تسلیم کرتے ہیں اسکے مطابق کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر کامل وجود پیدا ہو جانے کی وجہ سے ترقی رک گئی ہے۔ تو ہم کہتے ہیں۔ اگر اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ سب حیوانات بدل کر کامل انسان بن گئے ہیں تو یہ غلط ہے۔ ہر قسم کے جانور ابتک موجود ہیں۔ اسلئے وہ تغیر جاری رہنا چاہئے۔ اور اگر یہ کہا جائے۔ کہ اب چونکہ بہتر مخلوق پیدا ہو گئی ہے۔ اسلئے تغیر کی ضرورت نہیں۔ تو ہم کہتے ہیں۔ کہ ضرورت نہیں کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ کسی بالا رادہ ہستی نے ایک مقصد کے لئے دنیا کو پیدا کیا تھا جب وہ مقصد پورا ہو گیا تو ایسے تغیرات جو اُس مقصد کے حصول کیلئے ضروری تھے انہیں ترک کر دیا گیا ہے اور یہی دلیل ہستی باری کو ثابت کرتی ہے ✦

چوتھی دلیل سبب اور مسبب کی

چوتھی دلیل ہستی باری تعالیٰ کے متعلق سبب اور مسبب کی ہے جو عام طور پر استعمال کیجاتی ہے۔ اور جسے ایک ان پڑھ آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ اسلئے بہت کار آمد ہے۔ کہتے ہیں کسی فلاسفر کو کوئی انپڑھ زمیندار مل گیا۔ وہ بدوی تھا۔ فلاسفر نے اس سے پوچھا کہ کیا تم خدا کو مانتے ہو؟ اسنے کہا ہاں مانتا ہوں۔ فلاسفر نے کہا خدا کے ہونے کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ اسنے کہا البعرۃ تدل علی البعیر و آثار الاقدام علی السفیر والسماء ذات البروج والارض ذات الفجاج کیف لا تدل علی اللطیف الخبیر جب جنگل میں مینگنی کو دیکھکر اونٹ کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اور پاؤں کے نشان سے چلنے والیکا تو یہ ستاروں والا آسمان اور یہ زمین جس میں راستے بنے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھکر کیوں نہ سمجھوں کہ خدا ہے؟

یہ دلیل جو ایک بدوی نے دی۔ پہلے لوگوں کی عقل یہاں تک ہی پہنچی ہے۔ دنیا ایک بڑا مقام ہے جس کے پیدا کرنے والا کوئی ہونا چاہئے۔ یہ خیال انکے لئے کافی تھا۔ یہ دلیل گو ہے تو صحیح مگر اسپر اعتراض بھی بہت سے پڑتے ہیں۔ لیکن چونکہ عام دلیل ہے اور حقیقتاً صحیح ہے اسلئے قرآن کریم نے بھی اس دلیل کو لیا ہے۔ جیسا کہ آتا ہے۔ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اے لوگو! کیا تمہیں اس خدا میں شک ہے جس نے آسمانوں اور اس زمین کو پیدا کیا ہے؟ گو یہ دلیل عام ہے لیکن تعجب ہے کہ سب سے زیادہ اسپر اعتراض لوگ جماتے ہیں۔ اور بالکل ممکن ہے کہ اعتراضوں کی کثرت کا موجب اس کا عام ہونا ہی ہو۔

پیدائش دنیا کے متعلق لوگوں کے خیال

جن لوگوں نے حقیقت عالم پر غور کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ دنیا کو دیکھکر خدا کی ہستی کا نتیجہ نکالنا درست نہیں پہلے سب قسم کے خیالات کو لینا چاہیئے جو دنیا کے وجود میں آنیکے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں پھر انکا موازنہ کر کے نتیجہ نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں دنیا کی ابتدا کے متعلق تین خیال پیدا ہو سکتے ہیں (۱) یہ کہ دنیا آپ ہی آپ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ (۲) یہ کہ دنیا نے اپنے آپکو آپ پیدا کیا۔ (۳) یہ کہ کسی نے دنیا کو پیدا کیا۔ پہلے خیال کے یہ معنی ہوئے کہ دنیا کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہمیشہ سے آپ ہی آپ چلی آرہی ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکلے گا۔ کہ غیر محدود زمانہ کو ماننا پڑیگا اور یہ ناقابل

عقل کیلئے محال ہے۔ کیونکہ غیر محدود محدود میں نہیں سما سکتا۔

دوسرا خیال کہ دنیا نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا۔ یہ بھی انسانی دماغ میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اگر اسباب کو تسلیم کیا جائے تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ کسی مخفی ضرورت یا خواہش کے ماتحت ممکن الوجود نے وجود کا جامہ پہن لیا اور اس بات کا تسلیم کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ اس صورت میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کوئی چیز طاقت خلق بالقوۃ رکھتی تھی پھر وہ بالفعل ظاہر ہو گئی اور اگر اس بات کو مانا جائے تو دو سوال پیدا ہو جاتے ہیں۔

پہلا سوال یہ کہ جو چیز اپنے اندر ظہور کی طاقت رکھتی تھی۔ اگر وہ کوئی چیز تھی تو دنیا کی پیدائش کی حقیقت پھر بھی حل نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ سوال پھر بھی باقی رہیگا کہ وہ چیز کس طرح پیدا ہوئی؟ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مخفی ضرورت یا خواہش کے ماتحت اسنے آپکو ظاہر کر دیا وہ ضرورت یا خواہش کس نے پیدا کی۔ اگر اس کا کوئی اور خالق تھا تو اسے کس نے پیدا کیا تھا اور اگر نہیں تھا تو وہ پیدا کیونکر ہو گئی۔ اگر کہو کہ آپ ہی آپ۔ تو پھر دنیا کے متعلق ہی کیوں نہ مان لیا جائے کہ وہ آپ ہی آپ پیدا ہو گئی ہے۔ اگر کہیں کہ پہلی حالت عدم کی تھی نہ کہ وجود کی اسلیئے اسکے پیدا کرنے سے سلسلۂ سوالات نہیں چلتا تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اگر ظہور کی مخفی طاقت عدم میں تھی تو ماننا پڑیگا کہ عدم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ عدم جس میں ظاہر ہونے کی قابلیت ہوتی ہے۔ اور ایک وہ جس میں یہ قابلیت نہیں ہوتی۔ لیکن انسانی ذہن اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ اگر جو چیز محض عدم ہو اس میں کوئی طاقت خواہ مخفی ہو خواہ ظاہری رہ نہیں سکتی۔

تیسرا خیال یہ ہے۔ کہ دنیا کو کسی اور وجود نے پیدا کیا ہے اور یہی خیال مذہبی لوگوں اور فلاسفروں کا ہے۔ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا ایک صفت کی طرح ہے مگر یہ خیال بھی درست نہیں کیونکہ (۱) دنیا صفت نہیں بلکہ اس میں ایک ارتقاء ہے ایک چیز ہمیں نظر آتی ہے جو برابر ترقی کرتی جاتی ہے۔ پس اسے صفت قرار دینا بالکل

غلط ہے۔ صفت تو وہ تب ہوتی اگر یکدم بنتی۔ لیکن جب کہ وہ بعض قوانین کے مطابق ترقی کرتے کرتے اسحالت کو پہنچی ہے تو معلوم ہوا کہ وہ آپ ہی آپ ہو کسی اور ہستی کی پیدا کردہ نہیں ہے ✦

(۲) پھر یہ سوال ہے کہ اسنے اس دنیا کو کس چیز سے پیدا کیا ہے؟ صناع لوہے چاندی کی چیزیں تو بنا سکتا ہے مگر وہ لوہا، چاندی نہیں بنا سکتا۔ پھر اس دنیا کے صناع نے دنیا کو کس چیز سے بنایا؟ اگر مصالح پہلے سے موجود تھا تو پھر وہی اعتراض موجود ہے کہ وہ کیونکر بنا؟ اور اگر وہ آپ ہی آپ بنا ہوا تھا تو کیوں آپ ہی آپ نجز نہیں سکتا تھا۔ اور اگر اسے کسی اور ہستی نے پیدا کیا ہے تو اسے عقل تسلیم نہیں کرتی ✦

(۳) فضاء کو بھی مخلوق ماننا پڑیگا کیونکہ اگر مادہ بعد میں پیدا ہوا ہے تو ضرور ہے کہ خلا بھی بعد کی ہی بنے ہو اور جہات بھی بعد کی مخلوق ہوں۔ مگر خلا سے خلو اور جہات سے آزادی انسانی ذہن میں نہیں آسکتی ✦

(۴) اسی طرح پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا۔ کہ جس نے اس دنیا کو پیدا کیا ہے اسے کس نے پیدا کیا ہے؟

(۵) پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ محدود ہے کہ غیر محدود ہے۔ جس طرح کہ مادے کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور دونوں جوابوں میں سے کوئی جواب بھی دیا جائے اسپر ایک لمبا چکر سوالوں کا شروع ہو جائیگا ✦

(۶) پھر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ وہ ہستی غنی ہے۔ اگر غنی نہ مانینگے تو اسکے سوا اور وجود ماننے پڑینگے۔ اور اگر ہم غنی مانینگے تو پھر اسے اندرونی تغیرات سے بھی محفوظ ماننا پڑے گا اور اگر اسے تغیرات سے محفوظ مانا جائیگا تو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ وہ دنیا کی علت العلل بھی نہیں ہے اور اس صورت میں اسے وجود کے تصور کی بھی کوئی حاجت نہ رہیگی ✦

بس یہ خیال بھی غلط ہوا۔ لیکن چونکہ تینوں صورتیں جو دنیا کی پیدائش کے متعلق ممکن تھیں ناممکن ثابت ہوئیں تو پھر ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان ذہن میں نہ آنیوالی صورتوں میں سے ایک نہ ایک درست ہے۔ اور چونکہ جو اعتراض سب صورتوں میں پڑتا ہے وہ یہ ہے

کہ یہ آپ ہی آپ کس طرح ہو گئیں۔ اسلئے باوجود اس اعتراض کے ایک نہ ایک صورت کو صحیح تسلیم کرنا ہوگا اور یہ ماننا ہوگا کہ گو یہ اعتراض پڑتا ہے مگر چونکہ دنیا موجود ہے اور اسکے وجود میں کچھ شک نہیں اسلئے باوجود اس اعتراض کے دنیا کی پیدائش مذکورہ بالا صورتوں میں سے کسی ایک صورت سے ہوئی ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچکر ہر اک شخص کو یقین کرنا پڑیگا کہ وہ صورت اول ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ دنیا آپ ہی آپ ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ کیونکہ دوسری اور تیسری صورت میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی علت آپ ہی آپ کیونکر ہو گئی پس جب آگے چل کر پھر اس سوال سے واسطہ پڑتا ہے تو کیوں نہ تسلیم کرلیں کہ دنیا ہی خود بخود پیدا ہو گئی ہے۔

پیدائش دنیا پر لوگوں کے خیالات پر بحث

سب سے پہلے تو ان معترضین کے اس خیال کو میں رد کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کا خیال اسی سبب سے پیدا ہوا کہ دنیا کا خالق دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ خدا تعالیٰ کا وجود جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں الہام سے پیدا ہوا۔ پھر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف تو یہی معترضین کہتے ہیں کہ خدا کا خیال لمبے ارتقاء کے بعد پیدا ہوا ہے۔ پہلے تو انسانوں نے بعض چیزوں سے ڈر کر انکے آگے ہاتھ جوڑنے شروع کئے تھے۔ آہستہ آہستہ خدا اور عبادت کا مسئلہ بنگیا اور دوسری طرف اس خیال کی ایک خالص فلسفیانہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ اس کا خیال دنیا کی پیدائش کے سوال کے حل نہ ہونیکے سبب سے پیدا ہوا۔ حالانکہ دونوں خیال متضاد ہیں۔ اب میں معترضین کے مقرر کردہ اصول کو لیتا ہوں اور تسلیم کرتا ہوں کہ پہلی اور دوسری توجیہ پر جو اعتراض کئے گئے ہیں۔ ایک حد تک درست ہیں لیکن تیسری توجیہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض ایک دھوکا ہے۔ کیونکہ جب کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کسی کی پیدا کردہ ہے۔ تو اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ ایک مکان کی طرح بنائی گئی۔ بلکہ اس سے مراد یہی ہے کہ خدا تعالےٰ نے ایک مادہ پیدا کیا۔ اور اسمیں ایک قانون کو جاری کیا تاکہ اسکے مطابق وہ ترقی کرے۔ پس ارتقاء ہرگز دنیا کی پیدائش کے خیال کے مخالف نہیں۔ بلکہ صانع کی نادر صنعت گری پر دلالت کرتا ہے۔ اور ہر ٹکڑہ اس

ارتقاء کا اپنے خالق پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کسی اور کو خالق ماننے کی صورت میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اسنے مادہ کہاں سے لیا؟ اس سوال کا جواب میں آگے چل کر دونگا۔ فی الحال اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر خدا کو نہ مانا جائے تو بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ مادہ کہاں سے آیا۔ پس جب یہ سوال دنیا کو خود بخود مان کر بھی باقی رہتا ہے۔ تو پھر یہ خدا کے وجود کے لئے بطور شبہ کے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

رہا یہ سوال کہ فضا کو کس نے پیدا کیا؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ وہمی وجود ہے جو ہمارے دماغ سے تعلق رکھتا ہے۔ خدا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ فضا اور جہات نسبتی امور ہیں اور انکا تعلق یا مادہ سے ہے یا دماغ سے۔ پس انکی بحث خدا تعالےٰ کے سوال میں آ ہی نہیں سکتی۔ اور یہ جو سوال ہے کہ خدا محدود ہے یا غیر محدود۔ یہ لغو سوال ہے۔ کیونکہ اگر یہ مانیں کہ دنیا آپ ہی آپ ہے۔ تو یہ سوال دنیا پر بھی پڑے گا۔ کہ وہ محدود ہے کہ غیر محدود اور دونوں ممکن صورتوں میں سے کسی ایک کو ماننا مشکل ہوگا۔ اور اس پر بہت سے اعتراض پڑینگے۔ پس اگر دنیا کے آپ ہی آپ ہونیکی صورت میں بھی بلکہ قطع نظر اس کی ابتداء کے سوال کے اس کی موجودہ صورت میں بھی اسپر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ وہ محدود ہے کہ غیر محدود۔ جو دونوں صورتیں ناممکن ہیں تو پھر یہی سوال اگر خدا تعالیٰ کو مان کر پڑے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ ہم کہیں گے کہ دنیا کی پیدائش کی کوئی صورت بھی فرض کریں۔ یہ اعتراض قائم رہتا ہے۔ اسلئے معلوم ہوا کہ یہ اعتراض نہیں ہے بلکہ ایسا سوال ہے کہ جسے انسانی دماغ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یا یہ کہ وہ نقطۂ نگہ ابھی دریافت نہیں ہوا جس کی مدد سے اس سوال کو حل کیا جا سکے۔ اور ان دونوں صورتوں میں اس دنیا کا خالق کسی وجود کو ماننا خلاف عقل نہیں کہلا سکتا۔

اب میں چوتھے سوال کو لیتا ہوں۔ کہ اگر اس دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ خیال کہ خدا کے پیدا کرنے والا بھی کوئی ہونا چاہیئے۔ مادی تجربات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ جو چیز غیر مادی ہو اسکے متعلق

ہم مادی قوانین کو جاری نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض صورتوں میں ایک مادی چیز کا قیاس دوسری مادی چیز پر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پس مادی چیز کا غیر مادی پر قیاس تو بالکل قیاس مع الفارق ہے۔ مثلاً پانی ہے۔ اسے اگر گول برتن میں ڈالا جائے تو گول ہو جاتا ہے۔ اور اگر چپٹے برتن میں ڈالا جائے۔ تو چپٹا۔ اس پر قیاس کر کے اگر کوئی کہے کہ لوہا کیوں اس طرح نہیں ہوتا، تو ہم اسے یہی کہیں گے، کہ یہ قانون پانی کیلئے ہے۔ لوہے کیلئے نہیں۔ یا اگر کوئی کہے۔ کہ پانی اپنی ایک ہی شکل کیوں نہیں قائم رکھتا؟ جس طرح لوہا رکھتا ہے۔ تو اسے بھی یہی کہا جائیگا۔ کہ یہ بات لوہے سے تعلق رکھتی ہے پانی سے نہیں۔ پس جب ایک مادی چیز کا قیاس دوسری مادی چیز پر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تو ایک مادی چیز کو غیر مادی شئے پر کس طرح قیاس کر سکتے ہیں۔ چونکہ دنیا میں ہمیں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی۔ جو آپ ہی آپ ہو۔ اسلئے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ کوئی چیز آپ ہی آپ نہیں ہو سکتی۔ لیکن جو اشیاء کہ مادی نہیں ہیں ان کے متعلق ہم کوئی ایسا قانون مادی اشیاء کی بناء پر نہیں بنا سکتے۔ اور نہ ان کی کیفیت اور حقیقت ہمارے ذہن میں آسکتی ہے۔ اگر ہم یہ مانیں کہ دنیا آپ ہی آپ بنگئی ہے تو اسپر یہ سوال بے شک پڑیگا۔ کیونکہ مادہ کے متعلق ہمیں تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ اسکے تغیرات یا اس کی پیدائش آپ ہی آپ نہیں ہوتے بلکہ سبب اور مسبب کا قانون اسپر حاوی ہے۔ پس ہم یہ ہرگز نہیں مان سکتے کہ مادہ آپ ہی آپ ہو گیا۔ یا یہ کہ مادہ سے آپ ہی دنیا بنگئی ❊

آخری اعتراض کہ اگر کوئی اس دنیا کا پیدا کرنے والا ہے تو وہ غنی ہونا چاہئے اور اگر غنی ہے تو وہ علت کیونکر بنا یہ سوال جس طرح خدا کے وجود پڑتا ہے۔ اسی طرح دنیا پر۔ کیونکہ اگر وہ محتاج ہے تو آپ ہی آپ کیونکر ہوئی ہے اور اگر غنی ہے تو اس میں تغیر کیونکر ہوا اور وہ اس شکل میں کس طرح بدل گئی۔ اور اگر اس شکل کے باوجود دنیا کو آپ ہی آپ مانا جا سکتا ہے تو کیوں اس کا خالق ایک اور وجود کو نہیں مانا جا سکتا۔

دنیا کے بننے کا طریق نہ معلوم ہونے پر خدا کے ماننے کا فائدہ

یہاں پہنچکر منکرین اور پہلو بدلتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ اچھا چلو مان لیا۔ کہ خدا ہے۔

مگر یہ بات کہ دنیا کس طرح بنی یہ تو حل نہ ہوا۔ پھر خدا کے ماننے کا کیا فائدہ ہوا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ (۱) یہ اعتراض پیدا ہی ایک غلط خیال سے ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تلاش اسلیئے کیجاتی ہے کہ تا معلوم ہو کہ دنیا کیونکر پیدا ہوئی۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔

(۲) اگر یہ درست بھی ہو کہ خدا تعالیٰ کے وجود کی تلاش صرف اسوجہ سے تھی کہ تا دنیا کی پیدائش کی حقیقت معلوم ہو جائے تو پھر ہم کہتے ہیں کہ وہ سوال حل نہ ہوا تو نہ سہی ایک نئی حقیقت تو دنیا کو معلوم ہو گئی اور علم کی ترقی بہر حال مفید ہوتی ہے۔ اگر ایک سوال کے حل کرنے میں ہمیں ایک اور حقیقت معلوم ہو جائے تو کیا ہم اس حقیقت کو اسلیئے ترک کر دینگے کہ جس سوال کو ہم حل کر رہے تھے وہ حل نہیں ہوا۔

(۳) جواب یہ ہے۔ کہ ہمنے فرض کیا ہے۔ کہ دنیا آپ ہی آپ آئی ہے۔ اس میں بھی تو یہ سوال حل نہ ہوا۔ اگر اب بھی نہ ہو۔ تو کیا حرج ہے۔ (۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ انسان کو اسی علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کہ فلاں کام کس طرح ہوا۔ بلکہ اس علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ فلاں کام کس نے کیا۔ پیشوں کے متعلق ہی دیکھ لو اگر ایک شخص خوبصورت چھڑی دیکھتا ہے تو وہ یہی سوال نہیں کرتا کہ یہ کس طرح بنی بلکہ اکثر اوقات وہ یہ دریافت کرتا ہے کہ یہ کس نے بنائی ہے۔ اور کہاں بنی ہے۔ اگر انسان کو ان دونوں سوالوں کا صحیح جواب ملجائے تو اوّل تو وہ بنانے والے کی قدر کر سکیگا۔ اور دوسرے اگر چھڑی خریدنا چاہیگا تو چھڑی خرید سکیگا۔ اسی طرح اگر یہ نہ معلوم ہو سکے کہ دنیا کیونکر بنی ہے اور یہی معلوم ہو جائے کہ کس نے بنائی ہے تو بھی یہ علم بہت مفید ہوگا۔ کیونکہ اگر یہ معلوم ہو جائے۔ کہ اس دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ تو اس سے کئی راستے فکر کے نئے کھل جائینگے۔ مثلاً۔

اوّل یہ کہ اگر ہم کو معلوم ہو جائے۔ کہ یہ دنیا خدا نے پیدا کی ہے۔ تو ہم دیکھیں گے کہ آیا ہم اس سے کوئی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ یا نہیں؟۔

دوم۔ یہ کہ ہمیں جو تکالیف پہنچتی ہیں۔ کیا اس کے ذریعہ ہم ان سے بچ سکتے ہیں یا نہیں +

سوم یہ کہ اگر اس نے ہم کو پیدا کیا ہے تو کس لئے؟ اور کس مقصد سے؟ تاکہ ہم اپنی پیدائش کی غرض اور مقصد کو پورا کر سکیں۔

چہارم۔ ممکن ہے کہ اسکے ساتھ تعلق رکھنے سے ہمیں یہ بھی پتہ لگ جائے۔ کہ دنیا کو اس نے کس طرح پیدا کیا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کے بنانے والے سے تعلق رکھنے پر جو چیز اس نے بنائی ہو۔ اسکی حقیقت کا بھی پتہ لگ جاتا ہے۔

یہ چار ایسے عظیم الشان سوال ہیں۔ کہ ان کے حل ہونے پر ہماری حالت کچھ سے کچھ بن سکتی ہے۔ پس یہ کہنا کہ خدا کے ماننے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بالکل غلط اور باطل ہے۔

پانچویں دلیل دلیل انتظامی

اب میں پانچویں دلیل لیتا ہوں۔ پانچویں دلیل جسکو دلیل انتظامی کہنا چاہئے۔ اور جو چوتھی دلیل کی ہی درحقیقت ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور اس میں دنیا کے وجود سے کسی خالق پر استدلال نہیں کیا جاتا بلکہ دنیا کے انتظام سے خالق پر استدلال کیا جاتا ہے دنیا کا انتظام ہستی باریتعالےٰ پر ایک بہت زبردست دلیل ہے۔ بے شک کوئی شخص فرض کرے۔ کہ زمین اتفاقاً پیدا ہو گئی۔ لیکن اس کائنات میں اکیلا ہی کرہ نہیں۔ اسکے علاوہ اور بھی کرے ہیں۔ اور وہ سب الگ کام نہیں کر رہے بلکہ ایک قانون کے ماتحت اور تقسیم عمل کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ ایک چیز کے بغیر دوسری مکمل نہیں۔ اور ایک کے کام میں دوسری دخل نہیں دیتی۔ یہ بھی فرض کر لو کہ انسان آپ ہی پیدا ہو گیا۔ مگر اس امر کو کس طرح فرض کر لیا جائے کہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی تمام عالم کو بھی اسی مناسبت پر پیدا کیا گیا ہے کہ وہ انسان کی ضروریات کو خواہ وہ کس قدر ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں پورا کر رہا ہے۔

پھر جزئیات کو لو۔ انسان کو پیدا کیا گیا۔ اسکے ساتھ ہی انسان کے ہاتھ ایسے ہیں۔ جو لکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ انسان کو ایسا دماغ ملا تھا جو علم کو محفوظ کرنیکا خواہشمند تھا۔ اسے ہاتھ بھی ایسے دیئے گئے جو لکھنے کے لئے بہترین آلہ ہیں۔ اگر اتفاق سے

انسان پیدا ہو گیا تھا تو چاہئے تھا کہ اسے دماغ تو وہ ملتا جو علم کے محفوظ رکھنے کا خواہشمند ہوتا۔ مگر ہاتھ مثلاً ریچھ کے سے ہوتے۔ دماغی ترقی کے بالکل مناسب حال جسمانی بناوٹ اسی طرح بدلتی گئی ہے کہ اسکا طبعی بناوٹ کی ضرورت یا عدم ضرورت کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں یہ محض اتفاق کیونکر کہلا سکتا ہے؟۔ اسی طرح مثلاً انسان کو آنکھیں ملی ہیں تو دوسری طرف دیکھو کروڑوں کروڑ میل پر سورج بھی پیدا کیا گیا ہے جسکی روشنی میں یہ آنکھوں سے کام لے۔ انسان کی پیدائش کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اسے اگر بیماری اور شفا کا مورد بنایا گیا ہے تو ساتھ ہی سب بیماریوں کا علاج بھی مہیا کیا گیا ہے۔

آخر تمام عالم میں ایک نظام اور چھوٹے سے چھوٹی چیز ضرورت کے پورا کرنیکا سامان جو کروڑوں اشیاء کی پیدائش اور لاکھوں حالتوں میں واقعات کے مناسب بدلجانے والے قانون کو چاہتا تھا۔ اتفاقاً کس طرح ہو سکتا ہے۔ انسانی دماغ اسکو باور کس طرح کر سکتا ہے کہ اس قدر وسیع نظام آپ ہی آپ اور اتفاقاً ہو گیا۔ یہ نظام بغیر کسی بالارادہ ہستی اور وہ بھی بغیر کسی عالم الغیب اور قادر ہستی کے کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ قرآن کریم نے اس دلیل کو بھی پیش کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (ملک ع ۱) وہ خدا جسکے ہاتھ میں سب بادشاہت ہے۔ بہت برکت والا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت و زندگی کو پیدا کیا ہے تاکہ دیکھے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔ اور وہ غالب اور بہت بخشنے والا ہے۔ وہ جس نے سات آسمان پیدا کئے جو ایکدوسرے کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ تو خدا کی پیدا کردہ چیزوں میں کوئی رخنہ نہیں دیکھیگا۔ اس امر کو دیکھ اور پھر اپنی نظر کو پھرا پھرا کر دیکھ کیا تجھے

کوئی بھی نقص نظر آتا ہے (یعنے صحیح حاجت ہو اور اسکے پورا کرنیکا سامان نہ ہو) پھر دوبارہ اپنی نظروں کو چکر دے مگر وہ پھر بھی ناکام اور تھک کر واپس آجائینگی۔ یعنے کل کائنات عالم میں ایک ایسا نظام معلوم ہوتا ہے جس میں کوئی بھی نقص نہیں۔ ایک لمبا سلسلہ قوانین کا جاری ہے جو کہیں بھی ٹکراتا نہیں۔ کیا یہ آپ ہی آپ ہو سکتا ہے؟ نہیں بلکہ یہ نظام دلیل ہے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جو بالارادہ خالق ہے اور مالک ہے اور غالب ہے اور بخشنے والی ہے +

پہلا اعتراض اس دلیل کے متعلق بعض اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں اول بعض چیزوں کے متعلق تو انتظام پایا جاتا ہے۔ مگر بعض میں نہیں۔ مثلاً یہ درخت جو جنگلوں میں اُگے ہوئے ہیں۔ یا یہ جانور جو چلتے پھرتے ہیں اور یہ پرندے جو اڑتے پھرتے ہیں۔ یہ انسان کیلئے کیا کر رہے ہیں۔ ان میں سے دو چار کھانے کے قابل ہیں۔ لیکن باقی لغو ہیں۔ سانپ۔ بچھو یا اور ایسے ہی موذی جانور۔ زہریلے درخت اور پودے کیا کرتے ہیں؟ ان کا انسان کے فائدہ کے لئے کوئی کام نہیں ہے +

جواب اس اعتراض کا مفصل جواب تو صفات باری کے بیان میں آئیگا یہاں مجمل طور پر بتاتا ہوں۔ کہ ان جانوروں کی پیدائش بے انتظامی نہیں۔ بلکہ یہ انسان کیلئے خزانے ہیں۔ جو ضرورت کے وقت کام آتے ہیں۔ اور یہ جانور وغیرہ جن کو لغو کہا جاتا ہے ضرورت پر بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً سانپ ہی ہے۔ اس کا زہر دوائیوں میں کام آتا ہے۔ اسی طرح بچھو سے دوائیاں بنتی ہیں اور کئی ایسی چیزیں ہیں جن کو پہلے لغو اور فضول سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب ان کو بہت مفید سمجھا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کی چیزیں انسان کے لئے خزانے ہیں جن میں سے کوئی ہوا میں رکھدیا گیا ہے۔ کوئی سمندر میں کوئی زمین میں۔ تاکہ انسان علمی ترقیاں کر کے انہیں حاصل کرے۔ اور فائدہ اُٹھائے۔ کچھ جو ان کے متعلق دریافت ہو چکا ہے وہ لاکھوں فوائد پر دلالت کرتا ہے جو حال ابھی نہیں کھلا اُسے ہم معلوم پر قیاس کر سکتے ہیں +

دوسرا اعتراض دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ ہزارہا بوٹیاں خشکی اور تری

میں ایسی پیدا ہوتی ہیں۔ جو یونہی تباہ ہو جاتی ہیں۔ اور ہزار ہا جانور خشکی و تری میں ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ جو پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ یونہی ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی خالق بالا ارادہ ہوتا تو ان اشیاء کو یونہی ضائع ہونے دیتا؟

جواب ہم کہتے ہیں۔ کہ یہ چیزیں انسان کی علمی اور ذہنی اور جسمانی اور روحانی ترقی کے لئے پیدا کی گئی ہیں ان کا اس طرح پیدا ہونا اور تباہ ہونا بھی تو انسان کی توجہ کو پھیرتا ہے۔ بس فائدہ تو ہوا۔ گو براہِ راست فائدہ نہ اٹھایا گیا مگر یہ فائدہ اٹھانا تو انسان کا کام ہے۔ اگر وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو یہ اس کا قصور ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح ان چیزوں کی پیدائش میں حکمت ہے خدا معلوم ان کی اس طرح ہلاکت میں کیا کیا حکمتیں ہیں جن تک ابھی انسان کا دماغ نہیں پہنچا۔ آخر ہم دیکھتے ہیں کہ کئی چیزیں جلا کر اور راکھ کر کے زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ بے شک بعض چیزیں انسان کے لئے ضائع ہو جاتی ہوں مگر خدا تعالیٰ کی نسبت یہ لفظ کیونکر بولے جا سکتے ہیں۔ مرنیوالے جانور یا سڑ جانیوالی بوٹیاں انسان کے لئے تو ضائع ہو گئیں۔ کیا خدا کے لئے بھی ضائع ہو گئیں۔ کیا وہ بھی ان سے فائدہ اٹھاتا تھا کہ اسکے لئے ضائع ہوئیں۔ دوسرے جب وہ ان اشیاء کا خالق ہے تو وہ جس حال میں ہوں وہ اسکے قبضہ میں ہیں وہ اسکے لئے ضائع ہو کس طرح سکتی ہیں؟ خدا کے ہاتھ سے نکل کر کوئی چیز کہاں جا سکتی ہے۔ ان چیزوں کی ہلاکت کی مثال تو یہ ہے کہ ایک مکان کی اینٹیں اکھڑ لی جائیں۔ وہ مکان بے شک گر جائیگا۔ لیکن اینٹیں گھر میں ہی رہیں گی۔ جو دوسرے مکان میں استعمال ہو جائینگی۔ اسی طرح پیدا کرنا اور مارنا درحقیقت استعمال کے تغیر کا نام ہے۔ خدا تعالےٰ کے لئے مخلوق کا مرنا اور پیدا ہونا نہ حقیقتاً مرنا ہے نہ پیدا ہونا ہے*

تیسرا اعتراض اور جواب ایک اور بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ یہ غلط ہے کہ انسان جو پیدا ہوا۔ اسے اس قسم کی انگلیاں اسلئے دیگئیں۔ کہ وہ لکھ سکے۔ یا اور جو اعضاء اسے دیئے گئے ہیں۔ وہ اسلئے دیئے گئے۔ کہ دوسری چیزوں سے فائدہ اٹھائے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ انسان اسلئے ایسا پیدا ہوا کہ ارتقاء کا دوسرا قدم ایسے ہی انسان پیدا

کرنیکی طرف اٹھ رہا تھا جیسے جس قسم کے برتن میں پانی ڈالا جائے ویسی ہی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک جانور کی لمبی گردن مثلاً اسلئے ہوگئی کہ اس کی غذا اونچے درخت پر تھی۔ اسی طرح جانوروں کی کھالوں نے ویسے رنگ اختیار کر لئے جیسے کہ انکے گرد و پیش کے رنگ تھے۔ یا جن رنگوں کی مدد سے وہ اپنے دشمنوں سے بچ سکتے تھے۔ غرض یہ مناسبت ضرورت سے پیدا ہوئی ہے اور مجبوری کا نتیجہ ہے نہ کہ پہلے سے فیصل شدہ قانون کا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آخر پھر بھی تو سوال ہے کہ یہ قانون کس نے پیدا کیا ہے کہ جو چیز جس رنگ میں زندہ رہ سکے اس قسم کے تغیر اپنے اندر پیدا کر سکتی ہے۔ یہ قانون بھی تو کسی بالارادہ ہستی پر ہی دلالت کرتا ہے اندھی نیچر آپ ہی آپ اس قسم کا پیچیدہ قانون کس طرح تیار کر سکتی تھی؟

چھٹی دلیل
دلیل اخلاقی

اب میں چھٹی دلیل بیان کرتا ہوں۔ اسے دلیل اخلاقی کہنا چاہیئے جس سے یہ مراد ہے کہ انسان کی اخلاقی طاقتیں بھی ایک خدا پر دلالت کرتی ہیں۔ انسان فطرتاً نیکی کا خواہشمند اور اس کی طرف مائل ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اچھی باتیں اس میں پائی جائیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس دلیل کو اس طرح پیش فرمایا ہے۔ لا اقسم بیوم القیامۃ و لا اقسم بالنفس اللوامۃ۔ تمہارے یہ خیالات کہ کوئی محاسبہ کرنیوالی ہستی موجود نہیں ہے بالکل باطل ہیں۔ ہم اسکے ثبوت میں جزا و سزا کے وقت کو اور خود انسان کے نفس لوامہ کو پیش کرتے ہیں۔ یعنی انسان کے اندر کی اس مخفی طاقت کو جو ہر برے فعل پر اندر سے ملامت کرتی ہے اور جبتک وہ بار بار گناہ کا مرتکب ہو کر اسکو مار نہیں دیتا وہ برابر ملامت کرتی رہتی ہے۔ بلکہ جب وہ بظاہر مری ہوئی ہوتی ہے تب بھی کبھی اس میں حرکت ہو جاتی ہے اور وہ انسان کو نیکی کی طرف کھینچتی ہے۔ اگر خدا نہیں ہے۔ تو انسان کے اندر بدیوں سے رکنے کا احساس کیوں ہے۔ پھر تو انسان جو چاہے کرتا رہے۔ یہ نیکی بدی کی پہچان خدا نے بندے کے اندر اپنی ذات پر دلالت کرنے کیلئے ہی رکھی ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے فالھمھا فجورھا و تقوٰھا۔ ہمنے انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی نیکی بدی کی پہچان اسکے اندر رکھدی ہے +

اے۔ جی بلفور ایک بہت مشہور فلاسفر گذرا ہے۔ اس نے اسی دلیل کو لیا ہے

وہ کہتا ہے کہ بعض ایسی چیزیں ہیں جنکو ہم خوبصورت سمجھتے ہیں۔ اور خوبصورت چیزوں کے حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مگر پتہ نہیں کہ کیوں یہ خواہش انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور ہستی ہے۔ جس نے انسانوں میں یہ خواہش رکھی ہے۔ اسکا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہستی کی یہی ایک زبردست دلیل ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ مسیحی ہے۔ اور مسیحی تعلیم کے مطابق تو انسان کی فطرت مسخ شدہ اور گندی ہے پھر نہ معلوم وہ اس سے خدا تعالیٰ کی ہستی پر کس طرح استدلال کرتا ہے۔ یہ دلیل تو ایک مسلمان پیش کر سکتا ہے جس کی الہامی کتاب میں یہ دلیل آج سے تیرہ سو سال پہلے بیان کی گئی ہے اور جس کی الہامی کتاب انسان کی فطرت کو پاکیزہ اور لاانتہا ترقیات کی قابل قرار دیتی ہے +

حضرت خلیفۃ المسیح اول فرمایا کرتے تھے کہ ایکدفعہ مینے ایک چور سے پوچھا۔ کہ چوری کا مال کھانا تمہیں برا نہیں معلوم ہوتا؟ اس نے کہا برا کیوں معلوم ہو۔ کیا ہم محنت کر کے نہیں لاتے؟ فرماتے تھے میں نے اس بات کو چھوڑ دیا۔ اور اور باتیں کرنے لگ گیا۔ پھر جب مینے سمجھا کہ اب یہ پہلی بات بھول گیا ہوگا۔ مینے اس سے دریافت کیا۔ اور باتیں کرتے کرتے کہا چوری کتنے آدمی مل کر کرتے ہیں؟ اس نے کہا کم ازکم چار پانچ ہوتے ہیں۔ اور سنار کا ہونا بھی ضرور ہوتا ہے۔ جو مال کو پگلا دے۔ اور اس کی شکل بدل دے۔ آپنے کہا کیا تم مال سنار کو دیدیا کرتے ہو؟ اگر وہ اس میں سے کچھ مال کھا جائے۔ تو کیا کرتے ہو؟ اس پر وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگا کہ اگر سنار ہمارا مال کھا جائے۔ تو ہم ایسے بے ایمان کو مار دیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسانی کے اندر نیکی کا میلان اس طرح راسخ ہے کہ انسان خواہ کس قدر بھی بگڑ جائے وہ میلان اسکے اندر باقی رہتا ہے اور جب بھی کسی محرک کے ذریعہ سے یا نقطۂ فکر کے بدل دینے سے اسے زندہ کیا جائے وہ زندہ ہو جاتا ہے اور نئی طاقت کے ساتھ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پس فطرت میں برائی سے نفرت اور نیکی کی خواہش کا ہونا بھی خدا کی ہستی کی بہت بڑی دلیل ہے +

اعتراضات کا جواب اس دلیل پر بھی اعتراض کئے جاتے ہیں مثلاً یہ کہ جن کو

اخلاق کہا جاتا ہے وہ فطری اخلاق نہیں بلکہ ورثے کے طور پر کچھ باتیں ہیں۔ ہمارے ماں باپ نے تجربہ کر کے جن باتوں کو نقصان دہ پایا ان کو ہم برا سمجھتے ہیں۔ اور جن کو مفید پایا۔ ان کو اچھا۔ مثلاً چوری ہے۔ انسان جانتا ہے کہ میں نے کسی کا مال چرایا تو وہ بھی ہمارے مال کو چرالیگا۔ اور اس سے خواہ مخواہ کی پریشانی ہی ہوگی اسلیئے اس خوف سے جو انسان کے دل میں اس فعل کے نتائج کے متعلق پیدا ہوا یہ بات اسے اچھی نظر آئی اور آہستہ آہستہ یہ خیال بطور ورثہ کے اگلی نسلوں میں منتقل ہوتا چلا گیا پس بدی سے نفرت درحقیقت اس تجربہ کا ورثہ ہے جو انسان کو اپنے آباء سے ملا ہے۔ اس کا فطرت انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ کسی بالا ہستی نے یہ میلان انسان کے اندر رکھا ہے اور اسلئے یہ ہستی باری کا ثبوت نہیں کہلا سکتا۔

اعتراض پر اعتراض مگر اس اعتراض پر ہمارا یہ اعتراض ہے۔ کہ تم کہتے ہو۔ یہ باتیں ماں باپ سے ورثہ میں چلی آتی ہیں۔ مگر یہ بتاؤ کہ ماں باپ کے دل میں کس طرح یہ احساس پیدا ہوئے؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ انہوں نے تجربہ سے ان اخلاق کو معلوم کیا۔ اور جن چیزوں نے نقصان دیا۔ ان کو برا قرار دیدیا۔ اور نفع دینے والی چیزوں کو اچھا۔ اور اپنا نفع نقصان ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ کسی کے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن چیزوں کو اچھا کہا جاتا ہے۔ وہ سب کی سب مفید ہیں۔ اور جن کو برا کہا جاتا ہے۔ وہ سب کی سب مضر۔ اگر نیکیاں ایسی باتیں ہوتیں۔ کہ جنکا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اور پھر لوگ انہیں کرتے۔ تو کہتے خدا نے دل میں ڈالی ہیں۔ اور نقصان رساں چیزوں سے نقصان نہ ہوتا۔ اور پھر ان سے لوگ بچتے۔ تو سمجھتے خدا نے یہ سکھایا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اسلئے یہی کہا جائیگا۔ کہ لوگ اچھی باتوں کو ان کے فائدہ کی وجہ سے کرتے۔ اور بری باتوں کو ان کے نقصان کی وجہ سے چھوڑتے ہیں۔

گو اسکا حقیقی اصلی جواب تو اور ہے مگر بوجہ طوالت میں اسے چھوڑتا ہوں اور صرف اس جواب پر اکتفا کرتا ہوں کہ بعض نیکیاں ایسی بھی ہیں۔ کہ انسان کا ان کے کرنے میں بظاہر کوئی فائدہ نہیں نظر آتا۔ مگر وہ کرتا ہے۔ حتی کہ دہریہ بھی کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ماں باپ

بچّے سے جو سلوک کرتے ہیں وہ اسکے بچپن میں ہی کر چکتے ہیں۔ مگر ایک دہریہ بھی اس بات کا اعتراف کریگا۔ کہ ان کی عزت کرنی چاہیئے۔ حالانکہ انسان کے لئے اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اور اسکے خلاف کرنے کا اگر کوئی نقصان ہو سکتا ہے۔ تو یہی کہ لوگ آئیندہ بچوں کی پرورش کرنا چھوڑ دیں۔ مگر اس میں ان لوگوں کا کیا نقصان ہوگا۔ جو جوان ہو چکے ہیں۔ اور اپنا گھر بار رکھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی غلط ہے کہ ماں باپ آئیندہ بچّوں کی پرورش کرنا چھوڑ دیں۔ وہ کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ کسی کو یہ کہکر تو دیکھو۔ کہ میاں تم بوڑھے ہو بچّہ کے جوان ہونے تک مر جاؤ گے۔ پھر اس کی پرورش کرنے سے تمہیں کیا فائدہ؟ اسے چھوڑ دو۔ یہ کہنے پر تمہیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ وہ کیا کہتا ہے +

غرض ماں باپ کی عزت و توقیر کرنا ایسی نیکی ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں نظر آتا۔ مگر اس کے نیکی ہونے کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ اسی طرح ساری قوموں میں مُردوں کا احترام ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کا کیا فائدہ ہے۔ اور اس سے کیا نفع ہو سکتا ہے۔ اگر مردہ کو کتے کھا جائیں۔ یا اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے جا کر پھینک آئیں۔ تو کیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس طرح پھینکنے سے سڑ کر بدبو پیدا ہو جائیگی یہ ٹھیک ہے۔ اور اسلیئے دبانا ضروری ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں۔ اسے دبانے کے لئے بہت سے آدمی جمع ہو کر کیوں لیجاتے ہیں؟ رسّی اسکے پاؤں میں باندھو اور گھسیٹ کر لیجاؤ۔ ایسا کیوں نہیں کیا جاتا۔ اور مردے کو با احترام دفن کرنے میں کونسا فائدہ ہے؟ بظاہر اس میں کوئی فائدہ نہیں سوائے اسکے کہ فطرت انسانی اس فعل کو پسند کرتی ہے۔ اور مُردے کی بیحرمتی اسپر شاق گذرتی ہے +

غرض بہت سی نیکیاں ملتی ہیں جنہیں سب نیکیاں سمجھتے ہیں۔ اور ان کو عمل میں لاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دہریے بھی انپر عمل کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بظاہر کوئی مادی فائدہ نہیں ہوتا صرف احساسات کا سوال ہوتا ہے۔ وطن کی خاطر لڑائی میں مرنا بھی ایسے ہی اخلاق میں سے ہے۔ سب دنیا کے نزدیک یہ ایک قابل عزت بات سمجھی جاتی ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کیوں لوگ اپنی عزت و آبرو کے لئے مرنا اچھا سمجھتے ہیں؟ اور کیا کوئی ملک ہے۔ جس میں

اپنی عزت۔ اپنی آبرو۔ اپنے ملک کے لئے جان دینا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس فعل سے جان دینے والے کو کیا نفع ہو سکتا ہے؟ جب اسنے جان دیدی تو اسے کیا فائدہ؟ مگر کیا باوجود اس حقیقت کے ایسے مواقع پر جہاں موت یقینی ہوتی ہے لوگ ملک و وطن کے لئے جان نہیں دیتے؟ حالانکہ وہ یقینی طور پر جانتے ہیں کہ ہمارے اس فعل سے ہمیں کوئی نفع نہیں پہونچیگا۔

غرض ہر ملک ہر قوم میں یہ اور اسی قسم کی اور باتوں کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ مگر ان کے ایسے فائدہ نہیں ہیں جو کرنے والے کی ذات کو پہنچ سکیں۔ اسلئے معلوم ہوا کہ یہ فطرتی نیکیاں ہیں۔ اور نیکی کیطرف میلان خدا نے ہی فطرت میں رکھا ہے۔

ساتویں دلیل
دلیل شہادت

ساتویں دلیل اسبات کی کہ خدا ہے۔ دلیل شہادت ہے۔ اور دنیا میں سارے فیصلے شہادت پر ہی ہوتے ہیں۔ شاید ۹۹ فیصدی فیصلے اس کے ذریعہ ہوتے ہوں گے۔ نہ صرف مقدمات میں بلکہ تمام علوم میں۔ دنیا کا ہر شخص جس قدر باتیں جانتا ہے اور جس قدر باتوں کو وہ صحیح مانتا ہے ان کے متعلق دریافت کر کے دیکھ لو عالم سے عالم آدمی بھی ان میں سے ننانوے فیصدی کو صرف شہادت کی بناپر تسلیم کرتا ہے نہ کہ اپنے ذاتی تجربہ کی بناپر اور مشاہدہ پر۔ تمام علوم جو یقینی سمجھے جاتے ہیں انکا بھی یہی حال ہے۔ علم طب ہو کہ علم ہیئت۔ علم کیمیا ہو کہ علم انجینئرنگ تمام علوم کا بیشتر حصہ شہادت پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے تجارب کئے ہوتے ہیں دوسرے ان کی تحقیق پر اپنے علم کی بنیاد رکھدیتے ہیں۔ خود تجربہ کر کے نہیں دیکھتے۔ پس جب دنیا میں ہر بات اور ہر علم کا فیصلہ شہادت پر ہوتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہستی باری کے معاملہ میں یہ دلیل باطل سمجھی جائے۔ ہم مانتے ہیں کہ شہادت فی الواقع شہادت ہونی چاہئے۔ یونہی سُنی سُنائی بات نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن اگر شہادت کے اصول کے مطابق کوئی شہادت ملجائے تو پھر اسے ماننا پڑیگا۔ دلیل ہمیشہ شہادت ہوتی ہے نہ کہ عدم شہادت۔ اگر ایک بڑی جماعت سچے اور راستباز لوگوں کی ایک امر کے متعلق شہادت دیں کہ انہوں نے اسے دیکھا یا موجود پایا ہے تو جو لوگ اپنی لاعلمی ظاہر کریں انکا قول ان گواہوں کے مقابلہ پر ہرگز سنا نہیں جائیگا۔

کیونکہ لاعلمی شہادت نہیں ہوتی اور ان شاہدوں کی شہادت کے مطابق فیصلہ کیا جائیگا۔

خدا کی ہستی کی شہادت دینے والوں کی اعلےٰ زندگی

اب ہم اس معیار کے مطابق ہستی باری کے سوال پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے موجود ہونے کی شہادت ہزاروں لاکھوں لوگ دیتے ہیں اور وہ لوگ بھی ایسے ہیں کہ ان سے بہتر چال چلن والا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ قرآن کریم اس دلیل شہادت کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون۔ یعنے اے رسول تو اپنے مخالفوں سے کہدے کہ میںنے تمہارے اندر ایک عمر بسر کی ہے پھر تم عقل نہیں کرتے اور میرے دعوےٰ کو جھوٹا کہتے ہو۔ کیا اس لمبی عمر میں جو میںنے تم میں بسر کی ہے تمنے میری صداقت مشاہدہ نہیں کی؟ اگر تم نے یہ دیکھا ہے کہ میں کسی حالت میں بھی جھوٹ نہیں بولتا تو اب یہ بات جو میں کہتا ہوں کہ مجھے خدا نے مبعوث کیا ہے تاکہ میں اس کی طرف تمہیں بلاؤں اس میں تم کیوں شک کرتے ہو۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں جو ہر خطرہ کو برداشت کر کے سچائی کو قائم رکھتا آیا ہوں اور جس کے چال چلن کی خوبی اور مضبوطی کا دوست دشمن معترف ہے۔ یکدم اور ایک ہی رات میں اسقدر بگڑ گیا ہوں کہ اتنا بڑا جھوٹ میںنے بنالیا ہے کہ دنیا کے خالق نے مجھے دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا ہے +

قرآن کریم میں ایک دوسرے نبی کے متعلق آتا ہے کہ اسوقت کے لوگ اس کی نسبت کہتے تھے یٰصلح قد کنت فینا مرجوًا قبل ھٰذا (۱۱-۶۵) اے صالح ہمیں تو تم سے اس سے پہلے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ تم بہت اچھے تھے۔ مگر اب تمہیں کیا ہو گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام بھی اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہتے ہیں کہ مجھ میں کوئی عیب تو پکڑو۔ غرض جس قدر انبیاء دنیا میں گذرے ہیں وہ اپنے چال چلن اور صداقت کی معیت کی وجہ سے ایسے مقام پر تھے کہ ان کے دشمن بھی ان پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں پاتے تھے۔ اور اسی طرح ان کے اتباع میں سے لاکھوں صاحب کشوف و الہام لوگ ہوئے ہیں کہ جن کا چال چلن بھی ہر قسم کے شبہ سے بالا تھا اور ان کی راستبازی کا اعتراف ان کے دشمن بھی کرتے تھے +

حضرت موسیٰ کی پاک زندگی

دیکھو فرعون حضرت موسیٰ کا کتنا سخت دشمن تھا۔ مگر اس میں بھی یہ جرأت نہ تھی۔ کہ ان پر جھوٹ کا الزام لگائے۔ اسنے یہ تو کہا کہ یہ پاگل ہوگیا ہے۔ یونہی باتیں بتاتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکا کہ انکا چال چلن خراب ہے۔ حالانکہ وہ اسکے گھر میں پلے تھے۔ اگر ان میں کوئی خرابی ہوتی تو وہ ضرور بتاتا کہ انمیں یہ خرابی ہے +

رسول کریم صلعم کی پاک زندگی۔

اسی طرح ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دیکھتے ہیں کہ آپ کے دشمنوں نے اقرار کیا کہ آپؐ صادق اور امین تھے۔ اور آپؐ پر انہوں نے کوئی الزام نہ لگایا۔ بلکہ دشمن سے دشمن نے بھی آپکی طہارت اور پاکیزگی کی شہادت دی۔ چنانچہ مکہ میں ایک مجلس ہوئی۔ کہ باہر سے جب لوگ مکہ میں آئینگے اور محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق پوچھینگے تو ان کو کیا جواب دینگے۔ سارے ملکر ایک جواب بنالو تاکہ اختلاف نہو۔ آگے ہی ہم بدنام ہورہے ہیں۔ کہ ایک کچھ کہتا ہے اور دوسرا کچھ کہتا ہے اسلئے حج پر جو لوگ آئیں گے انہیں کہنے کیلئے ایک بات کا فیصلہ کرلو۔ اس پر ان میں سے ایک نے کہا۔ یہ کہدینا کہ جھوٹ کی عادت ہے۔ جو کچھ کہتا ہے سب جھوٹ ہے۔ یہ سن کر ایک شخص جس کا نام نضر بن حارث تھا۔ کھڑا ہوا۔ اور اس نے کہا۔ یہ بات نہیں کہنی چاہیئے۔ اگر یہ کہوگے تو کوئی نہیں مانیگا۔ اور لوگ تمہیں جواب دینگے کہ کان محمد فیکم غلاما حدثا ارضاکم فیکم واصدقکم حدیثا واعظمکم امانۃ حتی اذا رئیتم فی صدغیہ الشیب و جاءکم بما جاءکم قلتم ساحر واللہ ماھو ساحر۔ محمد نے تم میں جوانی کی عمر بسر کی ہے اور اسوقت وہ تم ہم سب سے زیادہ نیک عمل سمجھا جاتا تھا اور سب سے زیادہ سچا سمجھا جاتا تھا اور سب سے زیادہ امانت کا پابند تھا یہانتک کہ جب اسکی کنپٹیوں میں سفید بال آگئے اور وہ تمہارے پاس وہ تعلیم لایا جو وہ لایا ہے تو تم کہنے لگ گئے کہ وہ جھوٹا ہے۔ خدا کی قسم ان حالات میں وہ جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس شخص کے اس جواب پر سب نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور اس اعتراض کی بجائے اور بات سوچنے لگے +

کیسی سچی بات تھی جو اس شخص نے پیش کی۔ اگر پہلے کبھی رسول کریمؐ کی طرف انہوں نے

جھوٹ منسوب کیا ہوتا۔ تو اب کوئی مان سکتا تھا۔ لیکن جب پہلے وہ ساری عمر آپکو صادق کہتے رہے تھے۔ تو پھر یکدم جھوٹ کے الزام کو کون سچا مان سکتا تھا؟

اسی طرح ہرقل نے جب ابوسفیان سے رسول کریم صلعم کے متعلق پوچھا۔ کہ انہوں نے کبھی جھوٹ بولا ہے۔ تو اسنے کہا آجتک تو نہیں بولا۔ اور کہتا کہ آجتک کا لفظ مینے اسلئے لگایا تاکہ شبہ پڑسکے۔ کہ شاید آئندہ بولے۔

اسی طرح ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہاڑ پر چڑھکر لوگوں کو بلایا اور جب وہ جمع ہو گئے تو فرمایا۔ کیا اگر میں تمہیں کہوں کہ فلاں وادی میں ایک فوج جمع ہے۔ جو تم پر حملہ کرنیوالی ہے۔ تو مان لوگے؟ انہوں نے کہا ہاں مان لینگے۔ حالانکہ مکہ والوں کی بیخبری میں اس قدر فوج اس قدر قریب جمع نہیں ہوسکتی تھی۔ پس ان لوگوں کا اس قسم کی بات بھی جو بظاہر ناممکن الوقوع ہو آپ کے منہ سے سنکر ماننے کے لئے تیار ہو جانا بتاتا ہے کہ آپ کی صداقت پر ان لوگوں کو اس قدر یقین تھا کہ وہ یہ ناممکن خیال کرتے تھے کہ آپ جھوٹ بول سکیں یا دھوکہ دے سکیں۔

اس طبقہ اور اس درجہ کے لوگ ہیں جو اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے خدا سے الہام پایا ہے اور اللہ تعالے نے ان کو دنیا کی اصلاح کے لئے مبعوث کیا ہے یہ لوگ دنیا کے سب سے بڑے مصلح گزرے ہیں۔ اور اپنے اخلاق کی خوبی اور مضبوطی کی وجہ سے انہوں نے لاکھوں آدمیوں کے دلوں پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ وہ لوگ اپنی جانیں اور اپنے مال ان کی راہ میں قربان کرنے بہترین نعمت خیال کرتے تھے۔ اور پھر دنیا کے ذہنی ارتقاء میں جو ان لوگوں نے یا ان کے اتباع نے حصہ لیا ہے اور کسی نے اس قدر حصہ نہیں لیا۔ پس ان لوگوں کی ایسی کھلی کھلی اور زبردست شہادت کی موجودگی میں کسطرح انکار کیا جاسکتا ہے کہ ایک زبردست ہستی ہے جو اس دنیا کی خالق اور اسکی مالک ہے۔ اگر ایسی زبردست شہادت کو رد کیا جائے تو اصول شہادت کا بالکل ستیاناس ہوجاتا ہے اور کوئی علم بھی دنیا میں ثابت نہیں ہوسکتا۔ اور عقل سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرتی کہ معمولی معمولی شہادتوں کو تو قبول کیا جائے مگر اس قدر زبردست شہادتوں کو رد

کر دیا جائے +

دلیل شہادت پر اعتراض اور اس کا جواب

کہا جا سکتا ہے کہ کیا پتہ ہے کہ ان لوگوں نے فی الواقعہ ایسی شہادت دی ہے کہ کوئی خدا ہے جس نے انہیں مبعوث کیا ہے اور ان کے بعد لوگوں نے اپنے پاس سے بات بنا کر انکی طرف منسوب کر دی۔ اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ جس طرح ان کی شہادت تواتر سے پہنچتی ہے اور دنیا کی کوئی شہادت تواتر سے نہیں پہنچتی۔ کروڑوں آدمی نسلاً بعد نسلٍ اور ہزاروں کتب انکی شہادت کو پیش کرتی چلی آئی ہیں۔ پس انکی شہادت کے متعلق کسی قسم کا شبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ کہ شہادت کسی خاص زمانہ سے مختص نہیں ہے۔ زمانہ میں ایسے شاہد گذرے ہیں اور اسوقت بھی ایک شخص گذرا ہے جس نے اس شہادت کو تازہ کیا ہے۔ اور اپنی راستبازانہ زندگی کے متعلق اسنے آریوں۔ ہندوؤں۔ مسلمانوں۔ مسیحیوں۔ سب قوموں کو چیلنج دیا لیکن کوئی قوم بھی باوجود اسکے کہ سب قوموں کے لوگ اس کے اردگرد بستے تھے یہ نہ کہہ سکی کہ اس کی زندگی فی الواقع تقوٰے اور راستبازی کا نمونہ نہ تھی بلکہ اسکو خطرناک دشمنوں تک نے یہ شہادت دی کہ وہ اپنی راستبازی میں سارے زمانہ میں بے مثل تھا۔ یہاں تک اسکی صداقت اور راستبازی کے لوگ معترف تھے۔ کہ مخالفین نے ان جھگڑوں میں جو اسکے خاندان کے ساتھ تھے تسلیم کر لیا کہ جو وہ کہدے ہم اسے مان لیں گے۔ یہ شخص حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام مسیح موعود و مہدی معہود تھے۔ پس جبکہ ہر زمانہ میں اس قسم کے شاہد موجود ہیں تو اس شہادت میں کچھ بھی شک نہیں کیا جا سکتا +

آٹھویں دلیل

اب میں آٹھویں دلیل بیان کرتا ہوں۔ یہ ان دلیلوں سے جنہیں میں ابتک بیان کر چکا ہوں مختلف ہے اور اس دلیل سے ایک نیا سلسلہ دلائل کا شروع ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں اور پہلے سلسلہ دلائل میں یہ فرق ہے کہ پہلی دلیلوں میں تو ہستی باری کا ثبوت صرف عقلاً ملتا تھا اور عقل اپنے فیصلہ میں بعض دفعہ غلطی بھی کر جاتی ہے۔ اس دلیل سے سلسلہ دلائل مشاہدات سے تعلق رکھتا ہے جنمیں غلطی ناممکن ہو جاتی ہے۔ گو یہ ایک لمبا سلسلہ دلائل کا ہے مگر میں گنجائش کی قلت کی وجہ سے مختصر پیرایہ میں ایک ہی دلیل

کی صورت میں اس سارے سلسلہ پر روشنی ڈالتا ہوں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا نے اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لئے ایک دو نہیں چار نہیں دس بیس نہیں۔ بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں دلیلیں رکھی ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ہر صفت اس کی ہستی کا ثبوت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خدا رحیم۔ کریم۔ قدیر۔ سمیع۔ بصیر ہے۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ انسان سے بالا ایک ہستی ہے جو رحیم ہے اور رحم کرتی ہے۔ کریم ہے۔ کرم کا سلوک کرتی ہے۔ ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ دکھوں اور تکلیفوں کے وقت ہماری حفاظت کرتی ہے۔ عام قانون کے ذریعہ سے بھی اور خاص اسباب پیدا کر کے بھی۔ تو یہ ماننا پڑیگا کہ خدا ہے۔ مخالفین تو ہم سے خدا کی ہستی کی ایک دلیل پوچھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر اس کی صفات کی جلوہ گری پر غور کر کے دیکھو تو اس کی ہستی کے لاکھوں ہزاروں ثبوت موجود ہیں ◆

صفات الٰہی

دہریہ کہتے ہیں کہ جس طرح خدا موہوم ہے اسکی صفات بھی موہوم ہیں۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ کوئی علیم ہستی موجود ہے؟ کیا ثبوت ہے کہ کوئی سمیع ہستی موجود ہے؟ کیا ثبوت ہے کہ وہ ہستی لوگوں سے کلام کرتی ہے؟ کیا ثبوت ہے۔ کہ وہ قدیر ہے؟۔ اس اعتراض کے جواب میں دو قسم کے امور پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو ساری دنیا کو نظر آتے ہیں۔ اور ایک خاص دلائل ہیں جو ہر انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً عفو کی صفت ہے۔ اس کا اثر وہی انسان محسوس کر سکتا ہے۔ جسپر اس کا ظہور ہو۔ اور بخشنے کی حالت کو وہ خود ہی محسوس کریگا۔ مثلاً تم کوئی گناہ کرتے ہو خدا چونکہ ستار ہے۔ اسکے نتیجہ اور سزا سے تمہیں بچا لیتا ہے۔ اور اسکے لئے ایسے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ کہ جنہیں انسانی عقل نہیں پیدا کر سکتی۔ اسلئے معلوم ہوا کہ خدا ہے۔ ایسے امور انسان کے نفس کے اندر ہی پیدا ہو سکتے ہیں اور ان کو وہی سمجھ سکتا ہے ہاں دوسری قسم کے امور کو سب لوگ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اور میں انہی کو لیتا ہوں۔ کیونکہ جو بات اپنے ہی ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اسکے متعلق ذکر مفید نہیں ہو سکتا۔ اسے تو وہی سمجھ سکتا ہے جس سے وہ تعلق رکھے ◆

خدا کی صفت عزیز کا ثبوت

ہیں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کو بطور

مثال اسوقت پیش کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ اس دنیا کے اوپر ایک ہستی ہے جس کے ارادہ کے ماتحت سب دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز کو لیتا ہوں۔ اگر یہ صفت اپنا کام کرتی ہوئی ثابت ہو جائے تو معلوم ہو جائیگا۔ کہ خدا ہے۔ عزیز کے معنے غالب کے ہیں۔ اور اس کی صفت کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی ان اللہ قوی عزیز میں نے یہ مقرر کردیا ہے۔ کہ میں اور میرے رسول ہمیشہ غالب ہونگے۔

ادھر تو اللہ تعالیٰ یہ اعلان کرتا ہے کہ میرے دین کی تائید کیلئے جو لوگ کھڑے کئے جائیں گے وہ ہمیشہ غالب رہینگے اور دوسری طرف اس کی یہ سنت ہے کہ بادشاہوں اور طاقتور لوگوں کو نبی نہیں بناتا۔ الاماشاء اللہ بلکہ انہی لوگوں میں سے نبی بناتا ہے جو ضعیف اور کمزور ہوتے ہیں۔ جنکے پاس نہ کوئی فوج ہوتی ہے۔ نہ ہتھیار نہ دولت ہوتی ہے نہ جھتہ ان کو بھیجکر ان کے ذریعہ دنیا کو مفتوح کراتا ہے۔ اور اس طرح دکھا دیتا ہے۔ کہ لاغلبن انا ورسلی بالکل درست اور صحیح ہے جن حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کو فتح کیا ہے۔ ان کو سامنے رکھکر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ خدا کی مدد کے سوا آپکو یونہی غلبہ حاصل ہو سکتا تھا۔ آپکے پاس نہ مال تھا۔ نہ دولت علم آپ نہ پڑھے ہوئے تھے۔ مال کی یہ حالت تھی۔ کہ ایک ایسی مالدار عورت سے آپنے شادی کی جو نیک تھی اس نے اپنا مال آپ کو دیدیا۔ اور آپنے وہ بھی خدا کی راہ میں صرف کردیا۔ ایسے انسان کو خدا نے رسول بنا دیا۔ اور رسول کیلئے یہ شرط رکھدی۔ کہ لاغلبن انا ورسلی کہ رسول ضرور ضرور غالب ہوگا۔ اگر خدا ہے تو ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اب دیکھو دنیا نے رسول کریم کے ساتھ کیا کیا۔ آپکے خلاف سارے لوگوں نے زور مارے۔ مگر کیا نتیجہ نکلا۔ ان کی تمام کوششوں کا نتیجہ یہی نکلا۔ کہ آخر آپ نہایت شان کیساتھ دس ہزار قدوسیوں سمیت مکہ میں پہنچے۔ اور وہی سردار جو آپ پر اتنا ظلم کرتے تھے۔ کہ جب آپ نماز کیلئے خانہ کعبہ میں جاتے تو آپ کو ڈانٹتے۔ آپ پر سیلا ڈالتے۔ اسوقت یہ سب آپکے رحم پر تھے۔ ایکدفعہ آپ پر اتنا ظلم کیا گیا کہ طائف والوں نے پتھر مار مار کر آپکا جسم لہولہان کردیا۔ پھر آپ کے مدینے کی

یہ حالت تھی، کہ ان کا بازاروں میں چلنا مشکل تھا۔ پس اس بے سروسامانی میں آپنے خدا تعالیٰ کی طرف سے آنیکا دعویٰ کیا اور اعلان کردیا کہ میں کامیاب ہو کر رہونگا اور دنیا پر غلبہ پاؤنگا۔ خدا تعالےٰ میری مدد کریگا اور مجھے فتح دیگا۔ اگر قوم اس دعویٰ کو آسانی سے قبول کرلیتی تو کہا جاتا کہ جب قوم نے قبول کرلیا تو غلبہ میں کسی غیر معمولی اعانت کا ہاتھ کیوں سمجھا جائے۔ مگر آپکے ساتھ قوم نے محبت کا سلوک نہیں کیا۔ قبولیت کے ہاتھ آپ کی طرف نہیں بڑھائے۔ اطاعت کی گردن آپکے آگے نہیں جھکائی۔ بلکہ ساری کی ساری قوم آپکے خلاف کھڑی ہو گئی۔ اور معمولی مخالفت نہیں کی بلکہ مخالفت میں قوم نے سارا ہی زور خرچ کردیا۔ قتل کرنے کی کوشش کی ساتھیوں میں سے کئی کو شہید کردیا۔ حتیٰ کہ صحابہ کو ملک سے نکلنا پڑا اور آخر میں خود آپکو بھی ملک چھوڑنا پڑا۔ لیکن وہی شخص جسے چند سال پہلے صرف ایک ساتھی کے ساتھ رات کے اندھیرے میں اپنے عزیز وطن کو چھوڑنا پڑا تھا چند سال بعد فاتحانہ حیثیت میں واپس آتا ہے۔ اور آکر ان ظالموں سے جنہوں نے انتہائی درجہ کے ظلم اس سے اور اسکے ساتھیوں سے کئے تھے پوچھتا ہے کہ بتاؤ تو میں تم سے کیا سلوک کروں؟ اور جب وہ شرمندگی سے اسکے سامنے گردن ڈالدیتے ہیں، تو فرماتا ہے کہ جاؤ میںنے تم سب کو معاف کردیا۔ کوئی یہ کہسکتا ہے کہ اتفاقاً بعض کمزوروں کو طاقت ملجاتی ہے مگر رسول کریم کے معاملہ میں فتح اور غلبہ اتفاقاً نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ آپنے اپنی کمزوری کی حالت میں پیشگوئی کردی تھی کہ مجھے غلبہ ملیگا اور پھر اس دعویٰ کے مطابق آپکو غلبہ ملا اور پھر آپکا غالب ہو کر اپنے دشمنوں کو معاف کردینا بھی بتاتا ہے کہ ایک زبردست طاقت پر آپکو یقین تھا اور کامل یقین تھا کہ میرے غلبہ کو کوئی شکست سے بدل نہیں سکتا تبھی تو آپنے ایسے خطرناک دشمنوں کو بلاشرط معاف کردیا۔ اس قسم کے غلبہ کی مثال دنیا میں اور کہاں ملتی ہے؟ +

موجودہ زمانہ میں خدا کی صفت عزیز کا ثبوت

پھر اسی زمانہ میں دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے کھڑا کیا جن کے متعلق مولوی محمد حسین بٹالوی نے جو اسوقت ہندوستان میں سے باروسوخ عالم تھے کہا کہ میںنے ہی اس کو

بڑھایا ہے۔ اور میں ہی اسے تباہ کرونگا۔ مگر دیکھو کون مٹ گیا اور کون بڑھا۔ مولوی محمد حسین صاحب کا اب کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ حالانکہ یہی مولوی محمد حسین صاحب جب مسیح موعود علیہ السلام کی مخالفت سے قبل کہیں جاتے تھے تو لوگ سڑکوں پر جمع ہو جاتے تھے۔ اور کھڑے ہو ہو کر تعظیم کرتے تھے۔ غرض انہوں نے مخالفت کی۔ اور سب کو مخالفت کے لئے بھڑکایا۔ شروع شروع میں گورنمنٹ بھی ناراض تھی۔ کیونکہ آپ نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اور مہدی کے متعلق مسلمانوں نے جو غلط خیال بنائے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے گورنمنٹ آپ پر بہت بدظن تھی۔ غرض ہر طرف سے آپ کی مخالفت ہوتی تھی۔ مولویوں نے اپنی طرف سے زور لگانے میں کسر نہ رکھی۔ اور عوام نے اپنی طرف سے کمی نہ کی۔ مگر خدا تعالیٰ نے یہ کہہ رکھا تھا کہ لاغلبن انا و رسلی میں اور میرے رسول ضرور غالب ہو کر رہیں گے پھر اس کلام کے ماتحت دیکھو لوگوں کی مخالفت کا کیا نتیجہ نکلا؟ یہی نہ کہ بہت سے ایسے لوگ جو شروع میں آپ کو گالیاں دیتے تھے۔ آج لاغلبن انا و رسلی کی رسّی میں بندھے ہوئے یہاں بیٹھے ہیں۔ لوگوں نے حضرت مسیح موعود کو کیا کیا دکھ نہ دیئے۔ کیا کیا تکلیفیں نہ پہنچائیں آپکے رستہ میں کیا کیا روکاوٹیں نہ ڈالیں۔ مگر کیا کر لیا؟ وہ جو غالب سمجھے جاتے تھے۔ آخر مغلوب ہو گئے اور وہ جو بڑے سمجھے جاتے تھے۔ چھوٹے ہو گئے۔ اور اس طرح لاغلبن انا و رسلی کی پیشگوئی پوری ہوئی ؂

قلوب پر قبضہ زیادہ مشکل ہے

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تلوار اور طاقت کے ذریعہ جسموں پر غلبہ حاصل کرنا اور بات ہے۔ اور قلوب پر قبضہ کرنا اور بات دلوں پر قبضہ کرنیکا کام نہایت مشکل کام ہے۔ کہتے ہیں ابن سینا کوئی مسئلہ بیان کر رہا تھا۔ ایک شاگرد کو جو اسکی بات بہت پسند آئی۔ تو جھوم کر کہنے لگا۔ آپ تو محمد صلعم جیسے ہیں۔ اگرچہ ابن سینا فلسفی تھا۔ اور دین سے اسے تعلق نہ تھا۔ مگر آخر مسلمان تھا۔ اسے یہ بات بہت بُری لگی۔ جہاں بیٹھے تھے اسکے قریب ہی ایک حوض تھا اور سردی کے موسم کی وجہ سے یخ بن رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ابن سینا نے اسی شاگرد سے کہا کہ اس حوض میں کود جاؤ۔ شاگرد نے کہا۔ کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں؟ اسقدر سردی پڑ رہی ہے اور اتنا ٹھنڈا پانی ہے اس میں کودنے سے

تو میں فوراً بیمار ہو جاؤنگا۔ اسپر ابن سینا نے کہا کہ کیا اسی برتے پر تو مجھے کہتا تھا کہ تو محمدؐ جیسا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ہزاروں کو کہا کہ آگ میں کود پڑو۔ اور کسی نے نہ پوچھا کہ ایسا کیوں کہتے ہو۔ خوشی سے آگے بڑھ بڑھ کر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اور تو میری اتنی سی بات نہیں مانتا۔ اور باوجود اسکے مجھے حضور سے مشابہت دیتا ہے۔ حالانکہ رسول کریمؐ نے اپنی بات ان لوگوں سے منوائی جو آپ کے جانی دشمن تھے +

غرض انبیاء باوجود بے سروسامانی کے غالب ہوتے ہیں۔ اور ان کے دشمن تباہ۔ اب ہی دیکھ لو کہاں ہیں مولوی محمد حسین بٹالوی اور کہاں ہیں حضرت مسیح موعود کے دوسرے دشمن۔ ایک بڑا دشمن تمہارے سمجھانے کیلئے خدا نے رکھا ہوا ہے۔ مگر اس کی بھی باری آجائے گی۔ اور اسکا انجام ایسا عبرتناک ہوگا کہ مسیح موعود کے ماننے والے اسے بطور مثال کے پیش کیا کرینگے +

کیا نبی ناکام بھی ہوتے ہیں

اس سلسلہ کی اس پہلی دلیل پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم کہتے ہیں۔ نبوت کا دعوی کرنے والے ناکام بھی ہوتے ہیں مثلاً مسیح کو مخالفین نے پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ لیکن یہ انکی ناکامی کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ کامیابی کی ہے۔ کیونکہ خدا نے انہیں بھٹی میں ڈال کر دکھا دیا کہ لاغلبن انا ورسلی سچ ہے۔ اگر حضرت مسیح صلیب پر وفات پا جاتے۔ اور آپکا سلسلہ تباہ ہو جاتا تو بے شک یہ دعوی غلط ہو جاتا۔ مگر خدا نے انکو آگ میں ڈال کر اور پھر زندہ نکال کر دکھا دیا۔ کہ خدا کے نبی پر کوئی غالب نہیں آسکتا حضرت مسیح موعود نے بھی لکھا ہے کہ۔

'یہ جاں آگ میں پڑکر سلامت آنیوالی ہے'

اگر انبیا کی مخالفت نہ ہو تو لاغلبن انا ورسلی کی شان اور شوکت کس طرح ظاہر ہو۔

صفت متکلم سے خدا تعالےٰ کی ہستی کا ثبوت

دوسری صفت جسے میں اسوقت پیش کرنا چاہتا ہوں صفت تکلم ہے۔ اگر ایک ہستی انسان سے کلام بھی کرتی ہے اور اپنے عندیہ اور منشاء کو ظاہر بھی کرتی ہے تو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انسان سے بالا ہستی اور کوئی نہیں اور قانون دنیا پر کوئی حکمران نہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے ان الذین

قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون (حمٓ سجدہ ع ۴)۔ جب مومن کہتے ہیں۔ کہ خدا ہے اور اسپر استقامت دکھاتے ہیں۔ تو ان پر خدا فرشتے بھیجتا ہے۔ کہ جاؤ ان کو سناؤ کہ میں واقع میں ہوں۔ تم کوئی خوف اور غم نہ کرو۔ اور وہ جنت کہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس کی بشارت پاکر خوش و خرم ہو جاؤ۔

ہزاروں اور لاکھوں نبی ایسے ہوئے ہیں جنکو خدا کی طرف سے بتایا گیا کہ میں ہوں اور ان کی جماعتوں میں بھی ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں۔ اور اب ہماری جماعت میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کام لیا ہے خود مجھے بھی اللہ تعالیٰ کے محض فضل سے اس کا تجربہ ہے۔ اب اگر کوئی مجھے سنائے کہ خدا نہیں۔ تو میں کس طرح اسکی بات مان سکتا ہوں۔ میں تو تعجب سے اسکے منہ کو ہی دیکھونگا۔ کہ کیسی بیہودہ بات کہہ رہا ہے اگر کوئی فلسفی کہے کہ زید نہیں ہے۔ اور اُس کے نہ ہونے کے دلائل بھی پیش کرے۔ مگر زید سامنے بیٹھا ہو۔ تو اس فلسفی کو پاگل ہی کہا جائیگا۔ اسی طرح جس نے خدا کی باتیں سُنیں۔ اسے اگر کوئی کہے کہ خدا نہیں ہے۔ تو وہ اسے پاگل ہی سمجھیگا۔

پس ہزاروں نبیوں اور دوسرے لوگوں کو جو الہام ہوتے ہیں۔ اور وہ خدا کی باتیں سنتے ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا ایک زبردست ثبوت ہے۔

صفت تکلم پر اعتراض اور اس کا جواب

اس دلیل پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ اگر خدا تعالیٰ انسانوں سے بولتا اور کلام کرتا ہے۔ تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں ہے؟ اگر خدا بولتا۔ تو کسی کے کان میں کچھ اور کسی کے کان میں کچھ کیوں کہتا؟

اسکا جواب یہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کیطرف سے تو ایک ہی تعلیم ملتی ہے۔ ہاں بعد میں لوگ چونکہ اس میں اپنی طرف سے باتیں ملا دیتے ہیں۔ اسلئے اختلاف ہو جاتا ہے۔ جیسے قانون قدرت خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ مگر لوگ اس میں ہزاروں قسم کی باتیں اپنی طرف سے ملا دیتے ہیں۔ اسلئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ساری باتیں جو لوگ پیش کرتے ہیں

قانون قدرت ہی ہے۔ مثلاً کوئی کہے۔ کہ میںنے ایجاد کی ہے۔ کہ لکڑی سے زندہ گھوڑا بنالیتا ہوں
یہ سُن کر یہ نہیں کہا جائیگا کہ قانون قدرت غلط ہو گیا۔ بلکہ یہ کہا جائیگا۔ کہ جو کچھ وہ کہتا ہی
وہ غلط ہے۔ اور صحیح یہی ہے۔ جو قانون قدرت کے ماتحت ہے۔ کہ لکڑی کا زندہ گھوڑا نہیں
بن سکتا +

بس وہ لوگ جو اپنی عقل سے باتیں بناتے اور پھر خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔
ان کے عقلی ڈھکوسلوں کا الزام خدا تعالےٰ پر عاید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کی عقلوں پر عاید ہو گا۔
اور ایسے لوگوں کے متعلق خدا تعالیٰ نے یہ قانون بنا دیا ہے۔ کہ لو تقول علینا لبعض
الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین (حاقہ ع۲) اگر کوئی اللہ کی
طرف اپنے پاس سے بات بنا کر جانتے بوجھتے ہوئے منسوب کر دیگا تو وہ اس کی رگ جان
کو کاٹ دیگا۔ اب کوئی خدا پر جھوٹا افترا کر کے دیکھ لے۔ وہ لوگ جو خدا کے منکر ہیں وہی
کھڑے ہو جائیں اور جان بوجھکر ایسی باتیں بنا کر جنہیں وہ جانتے ہیں کہ خدا نے نہیں کہیں
خدا کی طرف منسوب کریں کہ اسنے یہ باتیں کہی ہیں اور ہمیں ان کی اشاعت کیلئے مبعوث
فرمایا ہے پھر اصرار سے اس دعویٰ کی اشاعت کریں پھر دیکھ لیں کیا نتیجہ ہوتا ہے +

اختلاف زمانہ کی وجہ سے مذاہب میں اختلاف

دوسرا جواب یہ ہے۔ کہ مذاہب میں کچھ حصہ اختلاف کا زمانہ
کی ضروریات کے ماتحت ہوتا ہے۔ مگر در اصل وہ اختلاف
نہیں کہلا سکتا۔ مثلاً طبیب ایک نسخہ لکھتا ہے۔ مگر جب مریض کی حالت بدل جاتی ہے تو
دوسرا لکھتا ہے۔ ان میں اختلاف نہیں کہا جا سکتا بلکہ ضرورت کے ماتحت جیسا مناسب تھا
ویسا کیا گیا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ طبیب کا کیا اعتبار کبھی کچھ دیتا ہے کبھی کچھ بلکہ سب جانتے
ہیں کہ مریض کی اندرونی تبدیلی کیوجہ سے نسخہ بدلا ہے۔ یہی حال دین کا ہے۔ جب بنی نوع
انسان کی ذہنی حالت میں ارتقاء حاصل ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے نئی تعلیم ان کو ملجاتی ہے

خدا ایک مذہب کیلئے سب کو مجبور کیوں نہیں کرتا؟

اس موقعہ پر یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہ اچھا مان لیا
کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے۔ اسے خدا ہلاک کر دیتا ہے
لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ خدا جھوٹے مذاہب کے پیروؤں کو ہلاک نہیں کرتا۔ جھوٹے مذاہب کے

ماننے والوں کو مار دینا چاہیئے تھا۔ یا ان سب کو ایک مذہب کا پیرو بنا دینا چاہیئے تھا۔
اس کا جواب خدا تعالیٰ نے آپ دیا ہے۔ فرماتا ہے۔ لو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ
ولکن لیبلوکم فی ما اٰتٰکم فاستبقوا الخیرات (مائدہ ع) اگر ہم چاہتے تو سب کو مجبور
کر کے ایک مذہب پر لے آتے۔ لیکن اگر اس طرح کرتے۔ تو کسی کو ثواب نہ ملتا۔ اور جو غرض
لوگوں کے پیدا کرنے کی تھی۔ وہ پوری نہ ہوتی۔ جس غرض کیلئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے وہ
تبھی پوری ہو سکتی ہے کہ وہ آزاد ہو۔ اس میں قبول کرنے کی اور رد کرنے کی دونوں قسم کی
طاقتیں ہوں۔ پس چونکہ سب لوگوں کو مجبور کر کے ایک مذہب پر لانا انسان کی پیدائش کی
غرض کو بالکل باطل کر دیتا ہے۔ اسلئے خدا ایسا نہیں کرتا +

سچے مذہب میں اختلاف یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اچھا مان لیا۔ کہ اختلاف مذاہب
کی یہ وجہ ہے۔ مگر جو مذہب اپنی آپ کو سچا کہتا ہے۔ اس میں بھی تو اختلاف ہی۔ مسلمانوں
کو دیکھ لو۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ اور کوئی کچھ۔ اگر تم کہو کہ جس طرح پہلے دینوں میں لوگوں نے
باتیں ملا دیں۔ اسی طرح اس میں بھی ملا دی ہیں۔ جس سے اختلاف ہو گیا ہے۔ تو ہم کہتے ہیں
خدا نے ایسا کلام کیوں نہ نازل کیا جس سے بندوں کو ٹھوکر نہ لگتی۔ خدا ایسا کلام کرتا۔ کہ
کوئی انسان اسکے متعلق ٹھوکر نہ کھاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کا کلام تو ایسا ہی ہوتا ہے
جسے سارے انسان سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ شرارت سے اور دھوکہ دینے کیلئے اس سے
کچھ کا کچھ مطلب نکالتے ہیں۔ اور اس سے انکی کوئی غرض وابستہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ اب
آریہ کہتے ہیں کہ قرآن سے تناسخ ثابت ہوتا ہے۔ روح و مادہ کی ازلیت ثابت ہوتی ہی۔
اور ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی کہدیں۔ کہ نعوذ باللہ قرآن میں نیوگ کی تعلیم بھی پائی جاتی
ہے۔ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کو کون روک سکتا ہے۔ جو چاہتے ہیں کہتے جاتے ہیں +

پھر اختلاف کا دروازہ کھلا رکھنے سے ایک مقصد انسانی دماغی کی نشو و نما بھی ہی۔
چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اختلاف امتی رحمۃ میری امت
کا اختلاف رحمت ہی۔ آپ کے اس قول کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے اپنی کلام میں کچھ باتیں
محکمات کی قسم سے بیان کی ہیں اور کچھ متشابہات کی قسم سے۔ محکمات سے مراد یہ ہے کہ

ان کے معنے گو ایک سے زیادہ کئے جائیں مگر وہ سب کے سب ایک رنگ میں رنگین ہوں اور متشابہات کا یہ مطلب ہے کہ ایسے الفاظ رکھے گئے ہیں جن کے متعدد معنے ہو سکتے ہیں اور بعض ان میں سے بظاہر مخالف نظر آتے ہیں مگر وہ حقیقتاً مخالف نہیں۔ یعنی گو یہ ممکن نہیں کہ ایک پر عمل کیا جائے تو دوسرے پر بھی عمل ہو سکے لیکن وہ دونوں معنے شریعت کی نص صریح کے مخالف نہ ہونگے اور دونوں میں سے کسی پر عمل کرنا ایمان یا اسلام کیلئے نقصان دہ نہوگا۔ جیسے عورتوں کی عدت کیلئے قرآن کریم میں قروء کا لفظ استعمال ہوا ہے جسکے معنی طہر کے بھی ہیں اور حیض کے بھی۔ مسلمانوں میں ایک جماعت طہر کے معنی کرتی ہے دوسری حیض کے۔ گو بظاہر یہ دونوں معنے مخالف نظر آتے ہیں اور ایک ہی شخص ایک وقت میں دونوں پر عمل نہیں کر سکتا۔ مگر شریعت کی کسی نص کے دونوں ہی مخالف نہیں اور نہ ان میں سے کسی ایک پر عمل کرنے سے ایمان و اسلام کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس اختلاف کے ذریعہ سے شریعت کی باریکیوں پر غور کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ مختلف علوم جسمانی و روحانی کی جستجو کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ شریعت کے مغز اور اس کے احکام کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اور اسکے احکام میں سے جو قشر اور چھلکے کی حقیقت رکھتے ہیں ان کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح خدا تعالیٰ نے کانیں رکھی ہیں۔ کہ جو کوشش کرے ان سے سونا چاندی نکال لے۔ اسی طرح اسنے قرآن کو بھی بنایا ہے اور یہ امر ایک خوبی اور خدائی کلام کی اعلیٰ صفت ہے۔ نہ کہ کوئی نقص۔ میں نے دیکھا اور تجربہ سے معلوم کیا ہے۔ کہ سورۃ فاتحہ جو ایک چھوٹی سی سورت ہے اسکے معنی کبھی ختم نہیں ہوتے۔ پس اس سے خدا کے کلام پر اعتراض نہیں پڑتا۔ بلکہ اس کی خوبی ظاہر ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی عقل اور اپنی ہمت کے مطابق معنے نکال لیتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ پس جو اختلاف کہ ذاتی فوائد و اغراض کے ماتحت نہیں کیے جاتے۔ یا جہالت یا قلت تدبر کیوجہ سے نہیں ہوتے۔ وہ اصول میں سے نہیں۔ بلکہ فروعات میں سے ہوتے ہیں۔ اور امت کیلئے فائدہ کا باعث ہیں۔ کیونکہ ان پر لوگوں کو غور و فکر کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ پھر قرآن کریم کی آیات کے ذو معانی ہونے کی یہ بھی وجہ ہے۔ کہ یہی کتاب ادنیٰ درجہ کے مومنوں

کیلئے بھی ہے اور اعلیٰ درجہ کے مومنوں کیلئے بھی۔ معمولی لیاقت کے لوگوں کیلئے بھی اور اعلیٰ روحانی مقامات پر پہنچنے والوں کیلئے بھی۔ پس الفاظ ایسے رکھے گئے ہیں کہ ہر علم کا آدمی اس سے اپنے درجہ کے مطابق مستفیض ہو سکے اور اس کا کوئی حصہ بھی کسی جماعت کیلئے بیفائدہ یا ناقابل فہم نہو۔ یہی چھوٹی سی کتاب ہے جسے ایک معمولی سے معمولی بھی پڑھتا تھا اور رسول کریم صلعم بھی۔ اگر یہ خوبی نہ ہوتی تو یا اس معمولی مومن کی سمجھ کے قابل بات اسمیں نہ ہوتی یا رسول کریم صلعم کے علم کو زیادہ کرنیوالی بات کوئی نہ ہوتی۔ گویا کلام ایکسا ہی ہے۔ الفاظ ایک ہی ہیں لیکن ان کو ایسے رنگ میں جوڑ گیا ہے کہ جتنی جتنی کسی کی سمجھ اور عقل ہو اسکے مطابق وہ ان سے معنی نکال لے۔ اور اس کلام کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کم درجہ کی عقل والوں کی سمجھ میں آنیوالی باتیں نہیں ہیں۔ اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس میں ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے متعلق تعلیم ہے۔ اعلیٰ روحانی درجہ رکھنے والے ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بلکہ اسکا ہر ہر لفظ دونوں جماعتوں کیلئے ہے۔

ہر اختلاف رحمت نہیں اسپر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ کہ مانا کہ اختلاف رحمت ہوتا ہے۔ مگر اسلام میں ایسے جھگڑے اور اختلاف بھی تو ہیں جو رحمت کا موجب نہیں بلکہ دکھ کا موجب ہیں۔ مثلاً اونچی اور نیچی آمین کہنے پر ایکدوسرے کو پتھر بھی مارتے ہیں۔ مقدمے بھی چلتے ہیں۔ پھر یہ اختلاف رحمت کس طرح ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک جب انسان گندے ہو جائیں۔ تو انکی ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے۔ کہ فروعی باتوں پر ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ مگر جب کبھی مسلمانوں کی ایسی حالت ہوتی رہی ہے تو خدا تعالیٰ کسی انسان کو بھیجدیتا رہا ہے جو ان کو حقیقت کی طرف لاتا رہا ہے۔ چنانچہ جب مسلمان اس زمانہ میں بھی ایسی باتوں پر لڑنے جھگڑنے لگے اور نہ سمجھا کہ اس قسم کا اختلاف رحمت نہیں بلکہ عذاب اور دکھ کا موجب ہے تو خدا تعالےٰ نے حضرت مسیح موعود کو بھیجدیا۔ اور آپ نے ایک فقرہ میں ان سب جھگڑوں کو حل کر دیا۔ چنانچہ دیکھ لو ہماری جماعت میں ان امور پر کوئی اختلاف نہیں۔ غرض بعض باتیں ایسی ہیں جنمیں سے ایک صورت ادنیٰ درجہ والوں کیلئے ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ والوں کیلئے۔ اور بعض ایسی ہیں جن کی دونوں صورتیں

درست ہیں۔ مثلاً آمین اونچی کہنی بھی جائز ہے اور نیچی بھی۔ ہاتھ اوپر باندھے جائیں یا نیچے دونوں طرح جائز ہے۔ اس طرح سب باتوں کا فیصلہ ہوگیا۔ اور کوئی جھگڑا نہ رہا۔

مشاہدہ کی دلیل پر اعتراض اور اسکا جواب

میں نے جو یہ بتایا ہے۔ کہ جس انسان کو خدا کا مشاہدہ ہوجائے خدا کا کلام سُنے۔ وہ کس طرح انکار کرسکتا ہے۔ کہ خدا نہیں ہے۔ اسپر ایک اعتراض کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مشاہدہ کی دلیل ہر جگہ درست طور پر نہیں چل سکتی۔ مثلاً شعبدہ باز بظاہر روپیہ بنا کر دکھا دیتا ہے۔ دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اسنے روپیہ بنا دیا ہے۔ لیکن فی الواقعہ ایسا نہیں ہوتا۔ کہ اسنے کسی منتر سے روپیہ بنایا ہو۔ اسی طرح کیوں نہ سمجھا جائے کہ اس مشاہدہ میں بھی کوئی دھوکا ہی ہے تاہم انسان خیال کرتا ہو کہ اسے مشاہدہ یا مکالمہ حاصل ہوا ہے اور فی الواقعہ کچھ بھی نہ ہو۔

ہم کہتے ہیں مشاہدے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنمیں غلطی لگ سکتی ہے۔ دوسرا وہ جنمیں غلطی لگنے کا امکان نہیں ہوتا۔ ایک مشاہدہ تو یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص دور سے ایک شکل دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ فلاں شخص ہے۔ لیکن ایک اور شخص اسے ملتا ہے جو بتاتا ہے کہ وہ اس شخص کو کسی اور جگہ پر دیکھکر آیا ہے۔ اس وقت اس شخص کی بات قبول کیجاتی ہے جو قریب سے دیکھکر آیا ہے۔ اور اس کی رد کردیجاتی ہے جس نے دور سے دیکھا تھا۔ اسلئے نہیں کہ مشاہدہ مشتبہ شے ہے بلکہ اسلئے کہ خود مشاہدوں کے مختلف درجے ہیں اور پہلے شخص کے مشاہدہ کے مقابلہ میں دوسرے شخص کا قریب کا مشاہدہ جب پیش کیا گیا تو معلوم ہوا کہ پہلے مشاہدہ میں غلطی لگ گئی تھی۔ لیکن ایک مشاہدہ اس قسم کا ہے کہ مثلاً ایک شخص مجھ سے باتیں کرے اور اسوقت لوگ بھی موجود ہوں اور وہ بھی اس امر پر شاہد ہوں کہ ہاں فی الواقع اسنے مجھ سے باتیں کی ہیں اسکے بعد کوئی شخص مجھے آکر کہے کہ مینے تو اسے لاہور میں دیکھا ہے۔ تو اس صورت میں مجھے اپنے مشاہدہ کے متعلق کوئی شبہ نہ ہوگا بلکہ میں اس شخص کی نسبت یہی یقین کرونگا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا غلطی خوردہ ہے۔ اسی طرح شعبدہ باز اگر اپنی ہتھیلی پر روپیہ بنائے*۔ تو اسکے روپیہ بنانے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ تو اپنی ہی ہتھیلی پر روپیہ بناتا ہے جسکی نسبت

*بنانے کی بجائے میری ہتھیلی پر روپیہ۔

یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس نے کسی نہ کسی جگہ روپیہ چھپا کر رکھا ہوا ہوگا۔ پس شعبدہ باز کی شعبدہ بازی مشاہدہ نہیں کہلا سکتی۔ مگر خدا کے کلام میں ایسا شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ تو پر شوکت آوازیں یا من وراء حجاب تعبیر طلب خوابوں کے ذریعہ سے ایک نہیں دو نہیں سینکڑوں بندوں سے کلام کرتا ہے۔

کیا خدا کا مشاہدہ کرنیوالوں کے حواس غلطی تو نہیں کرتے؟

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ خدا کے مشاہدہ کا اعلان کرتے ہیں ممکن ہے ان کے حواس کی غلطی ہو اور وہ پاگل ہوں۔ یا دھوکا خوردہ۔ مگر ہم کہتے ہیں یہ کیسا پاگل پن ہے کہ اس قسم کے کلام پانیوالے سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ ایک زبردست ہستی ہے جو ہم سے کلام کرتی ہے کبھی پاگلوں میں بھی اس قسم کا اتفاق ہوا کرتا ہے؟ پاگل تو دو بھی ایک بات نہیں کہتے کجا یہ کہ سینکڑوں و ہزاروں لوگ ایسی بات کہیں ان میں سے کتنوں کے متعلق کہو گے کہ ان کے دماغ خراب ہو گئے۔ اسلئے یہ شبہ بالکل غلط ہے۔

صفت مجیب خدا کی ہستی کا ثبوت

تیسری مثال کے طور پر میں خدا تعالیٰ کی صفت مجیب کو بیان کرتا ہوں جس قدر لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے مدعی گذرے ہیں سب کہتے چلے آئے ہیں کہ خدا مجیب ہے۔ دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔ اب اگر تجربہ سے ثابت ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کی یہ صفت ہے۔ کہ کوئی دعاؤں کو قبول کرنے والی ہستی موجود ہے تو خدا تعالےٰ کے وجود میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ بلکہ اس امر میں بھی کہ وہ سمیع اور مجیب ہے۔ سمیع تو اس طرح کہ بندہ کہتا ہے اور وہ سنتا ہے۔ اور مجیب اس طرح کہ بندہ کی عرض قبول کرتا ہے۔ اس صفت کے ثبوت کے طور پر میں دعاؤں کی قبولیت کو پیش کرتا ہوں۔ کس کس رنگ میں انسان دعا کرتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کس کس طرح اسکے لئے ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا حیرت انگیز مشاہدہ ہے کہ اسکو دیکھتے ہوئے خدا تعالیٰ کا انکار ایک قسم کا جنون ہی معلوم دیتا ہے۔ ہمنے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعاؤں کی قبولیت کے ایسے نشان دیکھے ہیں کہ ان کے دیکھنے کے بعد خدا تعالےٰ کے وجود میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ پھر خود اپنی ذات میں بھی اس نشان کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور بارہا حیرت انگیز ذرائع سے دعاؤں کو

قبول ہوتے دیکھا ہے۔ نواب محمد علیخان صاحب کے صاحبزادے میاں عبدالرحیم خانصاحب کے واقعہ کو ہی دیکھ لو۔ وہ ایک دفعہ ایسے بیمار ہوئے کہ ڈاکٹروں نے کہدیا کہ اب یہ بچ نہیں سکتے حضرت صاحب نے دعا کی جسکے جواب میں آپکو بتایا گیا کہ اس کی موت کے سامان پیدا ہو چکے ہیں۔ اسپر حضرت صاحب نے دعا کی کہ خدایا اگر اس کی موت آچکی ہے تو میں اس کی شفاعت کرتا ہوں۔ تب خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ کون ہے جو خدا تعالیٰ کے اذن کے بغیر اس سے شفاعت کر سکے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بات سنکر مجھپر اس قدر رعب طاری ہوا کہ گویا جسم میں سے جان نکل گئی اور میں ایک مردے کی طرح جا پڑا۔ اور پھر الہام ہوا کہ اچھا تمکو اجازت دیجاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے پھر دعا کی اور وہ قبول ہوگئی۔ آپنے اسی وقت باہر نکلکر یہ بات لوگوں کو سنادی اور میاں عبدالرحیم خان جن کی نسبت ڈاکٹر اور حکیم کہہ چکے تھے کہ اب انکی آخری گھڑیاں ہیں، اسی وقت سے اچھے ہونے لگ گئے۔ اور اب تک خدا تعالیٰ کے فضل سے زندہ ہیں اور اسوقت ولایت[1] تعلیم کیلئے گئے ہوئے ہیں ؁

غرض دعائیں ایسے رنگ میں قبول ہوتی ہیں کہ جو امور ناممکنات میں سمجھے جاتے ہیں اور ماننا پڑتا ہے کہ کسی بالا ہستی کی قضا کے ماتحت ان کی قبولیت وقوع میں آتی ہے۔

قبولیت دعا پر اعتراض اور اس کا جواب

دعاؤں کی قبولیت کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم یہ کیوں نہ سمجھیں۔ کہ جن باتوں کو دعاؤں کی قبولیت کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے وہ اتفاقاً ہو جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ اعتراض معقول ہے، بعض غیر معمولی واقعات اتفاقاً بھی ہو جایا کرتے ہیں، لیکن دعاؤں کی قبولیت کے ساتھ بعض امور متعلق ہیں جنکی موجودگی میں نہیں کہہ سکتے کہ جو نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ اتفاقاً ہوئے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ دعاؤں کے ساتھ ساتھ واقعات میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے جسے دیکھکر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تبدیلی اتفاقی نہیں بلکہ کسی ارادہ کے ماتحت ہو رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے امور بھی دعاؤں کے ذریعہ سے پورے ہوتے ہیں کہ بغیر دعا کے اتفاقاً کبھی وہ نہیں ہوتے۔ تیسرے یہ کہ اس کثرت سے دعاؤں کے ذریعہ سے غیر معمولی حالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس کثرت کی موجودگی میں اتفاق کا لفظ بولا ہی نہیں جا سکتا۔ چوتھے

[1] نظر ثانی کے وقت وہ خدا کے فضل سے بیرسٹری کا امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

یہ کہ دعا کرنیوالے کو بسا اوقات قبل از وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی دعا قبول ہو گئی ہے خواہ بذریعہ الہام خواہ بطور القاء کہ اس قبل از وقت علم کے بعد اسکا نام اتفاق رکھنا بالکل درست نہیں۔ غرض قبولیت دعا کے نظارے ایسے طور پر دکھائی دیتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں اتفاق کا شبہ تک بھی پیدا نہیں ہو سکتا +

صفت حفیظ خدا کی ہستی کا ثبوت

چوتھی مثال میں خدا تعالیٰ کی صفت حفیظ کی پیش کرتا ہوں تمام نبیوں نے شہادت دی ہے کہ خدا حفیظ ہے۔ اب آؤ دیکھیں کہ کیا کوئی حفیظ ہستی ہے۔ جو قانون قدرت کے علاوہ حفاظت کرتی ہے۔ اگر کوئی ایسی ہستی ثابت ہو جائے تو ماننا پڑیگا کہ خدا تعالیٰ موجود ہے۔ اس صفت کے ثبوت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو پیش کرتا ہوں۔ مکہ والوں نے آپکو مارنا چاہا۔ خدا تعالیٰ نے آپکو وقت پر اطلاع دی اور فرمایا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ آپ وہاں سے روانہ ہو گئے لیکن بعض مصالح کی وجہ سے راستہ میں ٹھہرنا پڑا۔ قریب کے پہاڑ کی ایک غار میں جس کا منہ چند فٹ مربع ہے اور جسے غار ثور کہتے ہیں آپ ٹھہر گئے۔ مکہ والے تلاش کرتے کرتے اس جگہ تک پہنچ گئے عربوں میں کھوج لگانے کا علم بڑا یقینی تھا۔ اور یہ ان کیلئے ضروری تھا۔ کیونکہ وہ جنگی لوگ تھے۔ اگر اسکے ذریعہ اپنے دشمنوں کا پتہ نہ لگایا کرتے تو تباہ ہو جاتے۔ رسول کریم کی تلاش میں بھی کھوجی لگائے گئے۔ اور وہی پتہ لگاتے ہوئے اس غار تک مکہ والوں کو لے آئے وہاں آکر انہوں نے کہا کہ یا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہاں ہے یا پھر آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ اس سے آگے نہیں گیا۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو نیچے آپ بھی سن رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ میں اکیلا کیا کر سکونگا ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ خدا کے رسول کو پکڑ لیں لیکن جس شخص کے متعلق آپ ڈر رہے تھے اور جو شخص حقیقتاً مکہ والوں کا مطلوب تھا وہ اس خوف کے وقت میں فرماتا ہے لا تحزن ان اللہ معنا۔ غم نہ کھا خدا ہمارے ساتھ ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اسکے کہ کھوجی جن کی بات پر ان لوگوں کو بہت ہی یقین ہوتا تھا وہ کہتے ہیں کہ آپ اس جگہ آئے ہیں مگر کوئی آگے بڑھکر غار کے اندر نہیں جھانکتا اور یہ کہکر کہ یہاں انکا ہونا ناممکن ہے سب لوگ واپس چلے جاتے ہیں +

میں جب مکہ گیا تھا تو اس غار کو دیکھنے کیلئے بھی گیا تھا لیکن اوپر چڑھتے ہوئے میرا سانس پھول گیا اور میں وہاں تک نہ جا سکا۔ دوسرے آدمی کو بھیجا کہ جا کر دیکھ آئے۔ اسنے آکر بتایا کہ اس غار کا منہ اچھا چوڑا ہے ایک چارپائی کے قریب ہے۔ لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ باوجود اسکے کہ ہر اک بات اسکی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ آپ اس غار میں ہیں اور وہ لوگ اسقدر جوش سے آپکی تلاش میں آئے تھے مگر باوجود آپکی گرفتاری کی دلی خواہش کے اور واقعات کے آپکے وہاں موجود ہونے کی طرف اشارہ کرنیکے انکو اتنی توفیق نہ ملی کہ ذرا جھک کر غار میں دیکھ لیتے۔ ان کے سامنے کوئی توپ نہیں تھی جس کا انہیں ڈر ہو سکتا تھا۔ نہ کوئی اور روک اور مشکل تھی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی غار کو نہیں دیکھتا۔ اور سارے واپس چلے جاتے ہیں۔ آپکے انا اللہ معنا کہنے کے بعد ان لوگوں کا اس طرح خائب و خاسر چلے جانا کیا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک زبردست طاقت کی حفاظت میں تھے۔

ایک مثال حفاظت الٰہی کی میں حضرت مسیح موعود کی زندگی میں سے بھی پیش کرتا ہوں۔ کنور سین صاحب جو لا کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ ان کے والد صاحب سے حضرت صاحب کو بڑا تعلق تھا حتیٰ کہ حضرت مسیح موعود کو کبھی روپیہ کی ضرورت ہوتی تو بعض دفعہ ان سے قرض بھی لیلیا کرتے تھے۔ ان کو بھی حضرت صاحب سے بڑا اخلاص تھا۔ جہلم کے مقدمہ میں انہوں نے اپنے بیٹے کو تار دی تھی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طرف سے وکالت کریں۔ اس اخلاص کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایام جوانی میں جب وہ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام مع چند اور دوستوں کے سیالکوٹ میں اکٹھے رہتے تھے حضرت مسیح موعود کے کئی نشانات دیکھے تھے۔ چنانچہ ان نشانات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک رات آپ دوستوں سمیت سو رہے تھے کہ آپکی آنکھ کھلی اور دل میں ڈالا گیا کہ مکان خطرہ میں ہے آپنے سب دوستوں کو جگایا اور کہا کہ مکان خطرہ میں ہے۔ اس میں سے نکل جلنا چاہیئے۔ سب دوستوں نے نیند کی وجہ سے پرواہ نہ کی اور یہ کہکر سو گئے کہ آپکو وہم ہو گیا ہے۔ مگر آپ کا

احساس برابر ترقی کرتا چلا گیا آخر آپنے پھر ان کو جگایا اور توجہ دلائی کہ چھت میں چرچراہٹ کی آواز آتی ہے مکان کو خالی کر دینا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ معمولی بات ہے ایسی آواز بعض جگہ لکڑی میں کیڑا لگ جانے سے آیا ہی کرتی ہے۔ آپ ہماری نیند کیوں خراب کرتے ہیں۔ مگر آپنے اصرار کر کے کہا کہ اچھا آپ لوگ میری بات مانکر ہی نکل چلیں آخر مجبور ہو کر وہ لوگ نکلنے پر رضامند ہوئے۔ حضرت صاحب کو چونکہ یقین تھا۔ کہ خدا میری حفاظت کے لئے مکان کو گرنے کو روکے ہوئے ہے۔ اسلئے آپنے انہیں کہا کہ پہلے تم نکلو۔ پیچھے میں نکلونگا۔ جب وہ نکل گئے۔ اور بعد میں حضرت صاحب نکلے۔ تو آپنے ابھی ایک ہی قدم سیڑھی پر رکھا تھا۔ کہ چھت گر گئی۔ دیکھو آپ انجنیر نہ تھے کہ چھت کی حالت کو دیکھکر سمجھ لیا ہو کہ گرنے والی ہے۔ نہ چھت کی حالت اس قسم کی تھی نہ آواز ایسی تھی کہ ہر اک شخص اندازہ لگا سکے کہ یہ گرنیکو تیار ہے۔ علاوہ ازیں جبتک آپ اصرار کر کے لوگوں کو اٹھاتے رہے اسوقت تک چھت اپنی جگہ پر قائم رہی اور جبتک آپ نہ نکل گئے تبتک کبھی نہ گری مگر جونہی کہ آپنے پاؤں اٹھایا چھت زمین پر آگری۔ یہ امر ثابت کرتا ہے کہ یہ بات کوئی اتفاقی بات نہ تھی بلکہ اس مکان کو ایک حفیظ ہستی اسوقت تک روکے رہی جبتک کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام جن کی حفاظت اسکے مدنظر تھی اس مکان سے نہ نکل آئے پس صفت حفیظ کا وجود ایک بالا رادہ ہستی پر شاہد ہے اور اسکا ایک زندہ گواہ ہے +

صفت خالقیت خدا کی ہستی کا ثبوت

پانچویں مثال کے طور پر میں صفت خلق کو بیان کرتا ہوں۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر تمام تخلیق کے علاوہ جو دنیا میں ایک مقررہ قاعدہ کے ماتحت ہو رہی ہے ایک خاص تخلیق بھی ثابت ہو جائے تو ماننا پڑیگا کہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی قدرت میں ہے کہ جو چاہے پیدا کرے اور یہ خداتعالیٰ کے موجود ہونیکا ایک زبردست ثبوت ہوگا۔ اس صفت کے ثبوت کے طور پر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ آپ ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے۔ کہ آپکے ساتھیوں کے پاس جو پانی تھا وہ ختم ہو گیا۔ اتنے میں آپنے دیکھا کہ ایک عورت پانی لئے

جارہی ہے۔ آپ نے اس کو دریافت فرمایا کہ یہاں سے پانی کتنے فاصلہ پر ہے؟ اسنے کہا تین منزل پر۔ چونکہ ایک لشکر آپ کے ساتھ تھا اور پانی ختم ہو چکا تھا۔ آپنے اس کے پانی کا مشکیزہ لے لیا اور اسکے منہ پر اپنا ہاتھ رکھکر لوگوں کو پانی دیدیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی برکت دی کہ سب کی ضرورت بھی پوری ہوگئی اور اس عورت کیلئے بھی پانی بچ رہا۔ یہ ایک زبردست نشان صفت خالقیت کے ثبوت میں ہے۔ اور اس واقعہ کے سچے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب اس واقعہ کو اس کی قوم نے معلوم کیا تو وہ سب کی سب مسلمان ہوگئی۔ ایک ایسا واقعہ جسپر قوم کی قوم مذہب تبدیل کرلے۔ راویوں کے ذہن کی بناوٹ نہیں کہلا سکتا۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو ایک قصہ ہی جو بعد میں بنا لیا گیا ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اس قسم کی تازہ مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً حضرت مسیح موعودؑ کا ہی ایک واقعہ ہے جسکے گواہ ابھی زندہ موجود ہیں، اور وہ یہ کہ حضرت صاحب ایک دفعہ سوئے ہوئے تھے۔ مولوی عبداللہ صاحب سنوری آپ کے پاؤں دبا رہے تھے۔ اُنہوں نے پاؤں دباتے دباتے دیکھا کہ کوئی گیلی گیلی چیز آپ کے پاؤں پر گری ہے۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ گیلا سرخ رنگ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حیران ہوا کہ یہ کیا چیز ہے اور یہ خیال کر کے کہ شاید چھپکلی وغیرہ کا خون ہو میں نے چھت کی طرف جو دیکھا تو وہ بالکل صاف تھی اور اسپر چھپکلی کا کوئی نشان نہ تھا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ مینے اپنی ٹوپی کو دیکھا تو اسپر بھی کچھ چھینٹے تھے حضرت مسیح موعود اسوقت کسی قدر بیدار ہوئے اور آنکھیں کھولیں تو آپکی آنکھوں میں آنسو تھے اور مینے دیکھا کہ آپکے کرتے پر بھی کئی چھینٹے ویسے ہی سرخ رنگ کے پڑے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مینے آپ سے پوچھا کہ یہ نشان تازہ بتازہ پڑے ہیں یہ کیسے ہیں؟ پہلے تو آپ نے فرمایا کسی طرح نشان پڑ گئے ہوں گے، مگر جب میں نے زور دیا کہ حضور یہ تو میرے دیکھتے ہوئے پڑے ہیں اور تازہ ہیں تو پھر آپنے سنایا کہ مینے رویا میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ بطور جج کے بیٹھا ہے اور میں ریڈر کے طور پر سامنے کھڑا ہوں اور کچھ کاغذات دستخطوں کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے سرخی کی دوات میں قلم ڈبوئی اور قلم کو چھڑکا جسکے چھینٹے میرے کپڑوں پر گرے اور اسکا اثر ظاہر میں بھی

ظاہر ہو گیا۔ یہ خواب تفصیل سے آپکی کتب میں موجود ہے +

اب دیکھو یہ خلق ہے یا نہیں؟ وہ سرخی اگر خدا نے پیدا نہیں کی تھی تو کہاں سے آئی تھی؟ غرض اب بھی صفت خلق کے ماتحت نشان دکھائے جا رہے ہیں۔ مگر اس کے نظائر مومنوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں +

خود میرا اپنا ایک مشاہدہ ہے۔ ایک دفعہ میں سو رہا تھا۔ میں نے سوتے سوتے دیکھا۔ کہ میرے منہ میں مشک ڈالی گئی ہے۔ جب میں اُٹھا تو منہ سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی میں نے سمجھا شاید خواب کا اثر ہے۔ اور گھر والوں کو کہا کہ میرا مونھ سونگھو۔ انہوں نے بھی بتایا۔ کہ مشک کی خوشبو آتی ہے۔ یہ ایک قسم کی نئی پیدائش ہی تھی۔ جو خدا کی صفت خالقیت کے ماتحت ہوئی +

شاید بعض لوگ کہیں کہ اس قسم کی باتیں خدا کے ماننے والے ہی کہتے ہیں۔ ان کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے۔ کہ ماننے والوں کی باتیں بھی ماننی ہی پڑتی ہیں۔ اگر راستباز سمجھدار آدمی جنکو جھوٹ بول کر کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو ایسے امور کی شہادت دیں تو کیا وجہ ہے کہ ان کی شہادت کو قبول نہ کیا جائے اور اس قسم کی شہادتیں مومن ہی دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ایسے واضح نشانات مومنوں کو ہی دکھائے جاتے ہیں کیونکہ اگر نہ ماننے والوں کو بھی ایسے نشانات دکھائے جائیں تو پھر ان کا ایمان لانا کوئی خوبی نہیں رہ سکتا اور ان کا ایمان بیفائدہ ہو جاتا ہے۔ سورج کو دیکھکر اسے ماننے پر کسی انعام کا انسان امیدوار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر ایسے شواہد غیر مومن دیکھیں تو انکے ایمان بے نفع ہو جائیں۔ پس یہ نظارے ایمان کے بعد ہی دکھائے جاتے ہیں۔

صفت شافی کی شہادت

چھٹی مثال کے طور پر میں خدا تعالیٰ کی صفت شفا کو پیش کرتا ہوں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بعض مریض ایسے طریق پر اچھے ہوتے ہیں جو طبعی طریقوں کے علاوہ ہیں یا ایسے مریض اچھے ہوتے ہیں جو عام طور پر اچھے نہیں ہو سکتے تو ماننا پڑے گا کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جسکے اختیار میں شفا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ اپنے اس اختیار کو استعمال بھی کرتی ہے +

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ایسے نظارے نظر آتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے غیر معمولی طور پر شفا بعض مریضوں کو ملتی ہے بغیر اسکے کہ طبعی ذرائع استعمال ہوں یا ان موقعوں پر شفا ملتی ہے کہ جب طبعی ذرائع مفید نہیں ہوا کرتے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات میں سے اس قسم کی شفاء کی ایک مثال جنگ خیبر کے وقت ملتی ہے۔ خیبر کی جنگ کے دوران میں ایک دن آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ خیبر کی فتح اس شخص کیلئے مقدر ہے جس کے ہاتھ میں مَیں جھنڈا دونگا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جب وہ وقت آیا تو مَیں نے گردن اونچی کر کر کے دیکھنا شروع کیا کہ شاید مجھے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جھنڈا دیں مگر آپ نے انہیں اس کام کیلئے مقرر نہ فرمایا۔ اتنے میں حضرت علی رضؓ آئے اور ان کی آنکھیں سخت دُکھ رہی تھیں آپ نے ان کی آنکھوں پر اپنا لعاب دہن لگا دیا اور آنکھیں فوراً اچھی ہو گئیں اور آپ نے ان کے ہاتھ میں جھنڈا دیکر خیبر کی فتح کا کام ان کے سپرد کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت کے سارے واقعات چونکہ محفوظ نہیں۔ اسلئے اس قسم کی زیادہ مثالیں اب نہیں مل سکتیں۔ ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ سینکڑوں ہزاروں مثالیں آپکی زندگی میں مل سکتی ہونگی۔ مگر حضرت مسیح موعود کے زمانہ میں جبکہ دہریت کا بہت زور ہے۔ اور اسکے توڑنے کیلئے آسمانی نشانوں کی حد درجہ کی ضرورت ہے خدا تعالیٰ نے بہت سے نشانات اس قسم کے دکھائے ہیں جنپر ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات کا قیاس کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ایک صاحب عبدالکریم نامی کا واقعہ پیش کرتا ہوں وہ قادیان میں سکول میں پڑھا کرتے تھے انہیں اتفاقاً ہلکے کتے نے کاٹ کھایا۔ اسپر انہیں علاج کیلئے کسولی بھیجا گیا۔ اور علاج ان کا بظاہر کامیاب رہا لیکن واپس آنیکے کچھ دن بعد انہیں بیماری کا دورہ ہو گیا۔ جسپر کسولی تار دیگئی کہ کوئی علاج بتایا جائے؟ مگر وہاں سے جواب آیا Sorry nothing can be done for Abdul Karim. افسوس ہے کہ عبدالکریم کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ حضرت مسیح موعود کو ان کی بیماری کی اطلاع دیگئی چونکہ سلسلہ

کی ابتدا تھی اور یہ صاحب بہت دور دراز سے علاقہ حیدر آباد دکن کے ایک گاؤں سے بغرض تعلیم آئے تھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بہت ہمدردی پیدا ہوئی اور آپنے ان کی شفا کیلئے خاص طور پر دعا فرمائی اور فرمایا کہ اسقدر دور سے یہ آئے ہیں جی نہیں چاہتا کہ اس طرح ان کی موت ہو۔ اس دعا کا یہ نتیجہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو دورہ ہو جانے کے بعد شفا دیدی۔ حالانکہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے اس قسم کے مریض کو کبھی شفا نہیں ملی۔

میرے ایک عزیز ڈاکٹر ہیں انہوں نے اپنے زمانہ طالب علمی کا واقع سنایا کہ ایکدفعہ وہ ہستی باری پر ایک دوسرے طالب علم سے گفتگو کر رہے تھے دوران گفتگو میں انہوں نے یہی واقعہ بطور شہادت کے پیش کیا۔ اس طالب علم نے کہا کہ ایسے مریض بچ سکتے ہیں یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اتفاقاً اسی دن کالج میں پروفیسر کا لیکچر سگ گزیدہ کی حالت پر تھا۔ جب پروفیسر لیکچر کے لئے کھڑا ہوا اور اسنے اس امر پر زور دینا شروع کیا کہ اس مرض کا علاج دورہ ہونے سے پہلے کرنا چاہئے اور بہت جلد اس طرف توجہ کرنی چاہئے وہ کہتے ہیں کہ مینے بات کو واضح کرانے کے لئے کہا کہ جناب بعض لوگ کہتے ہیں کہ دورہ پڑ جانے کے بعد بھی مریض اچھا ہو سکتا ہے۔ اسپر پروفیسر نے جھڑک کر کہا کہ کبھی نہیں جو کہتا ہے وہ بیوقوف ہے۔

غرض یہ ایسی بیماری تھی جسکا کوئی علاج نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی ہوا ہے۔ مگر حضرت مسیح موعود کی دعا سے اللہ تعالےٰ نے میاں عبد الکریم کو شفاء دی اور وہ خدا کے فضل سے ابتک زندہ ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اس طبعی قانون کے اوپر ایک ہستی حاکم ہے جس کے ہاتھ میں شفا دینے کی طاقت ہے۔

صفت عالم الغیب ساتویں مثال کے طور پر میں صفت عالم الغیب کو پیش کرتا ہوں اس میں کیا شک ہے کہ اگر کسی انسان کو بلا ظاہری تدابیر کے ایسے علوم پر آگاہی حاصل ہونے لگے جنکا جاننا انسان کیلئے ناممکن ہے تو ماننا پڑیگا کہ ایک۔ عالم الغیب خدا موجود ہے جس کی طرف سے اپنے خاص بندوں کو خاص علم دیا جاتا ہے۔

بعض لوگ کہدیا کرتے ہیں کہ یہ کیوں نہ مانا جائے کہ ایسے لوگوں کو علم غیب معلوم کرنیکا کوئی طریق معلوم ہوگیا ہے۔ وہ اسی طریق کے ذریعہ سے علم غیب معلوم کر کے ایک وہمی خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں +

مگر میں کہتا ہوں کہ اگر یہی بات ہوتی کہ ان لوگوں کو کوئی خاص طریق معلوم ہوگیا ہوتا تو وہ کیوں اس ذریعہ سے اپنی بڑائی نہ منواتے۔ اور کیوں خواہ مخواہ اس علم کو کسی اور ہستی کی طرف منسوب کرتے اور ساتھ ہی اپنی کمزوری اور اس کی طاقت کا اظہار کرتے رہتے اور اپنے آپ کو اسکے مقابلہ میں ہیچ اور ذلیل قرار دیتے۔ دیکھو مشہور موجد ایڈیسن جب کوئی ایجاد کرتا ہے۔ تو کیا وہ یہ کہتا ہے۔ کہ مجھے کسی جن نے یا بالا طاقت نے یہ بات بتائی ہے۔ یا جو اور موجد ہیں وہ کبھی ایسا کہتے ہیں کہ ہمیں فلاں شخص نے یہ ایجاد کر کے دی ہے۔ بلکہ موجد تو یہی کہتے ہیں۔ کہ ہمنے خود ایجاد کی ہے۔ اسلئے ہماری قدر کرو۔ لیکن علم غیب کے ظاہر کرنیوالے تو سب کے سب یہی کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ خدا ہی ہمیں سب کچھ بتاتا ہے۔ اور اسکے کہنے کے مطابق ہم کہتے ہیں +

دوسرے یہ کہ اگر یہ انکا کسبی علم ہوتا تو وہ اپنی اولاد کو آگے یہ علم کیوں نہ سکھا جاتے مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ ان کی اولاد اکثر اوقات انکی طرح خدا سے غیب پانیوالی نہیں ہوتی یا اس حد تک نہیں ہوتی۔ پس یہ اعتراض بالکل وہم ہے اور بیہودہ ہے +

اب میں علم غیب کی چند مثالیں پیش کر کے بتاتا ہوں کہ کس طرح ان سے ایک عالم الغیب ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔ پہلی مثال تو حضرت مسیح موعود کی وہ پیشگوئی ہے جو آپنے جنگ عظیم کے متعلق فرمائی۔ جنگ سے نو سال پہلے آپنے یہ خبر شائع کر دی تھی کہ ایک عالمگیر تباہی دنیا میں آنیوالی ہے جس میں زار روس تباہ ہوگا اور سخت تکلیف اور دکھ دیکھیگا۔ اس پیشگوئی میں بہت سی پیشگوئیاں مخفی ہیں۔ اول یہ کہ ایک عظیم الشان جنگ ہونیوالی ہے جو عالمگیر ہوگی۔ دوسرے یہ کہ زار روس اسوقت تک باوجود ملک میں عام بغاوتوں کے پائے جانے کے اپنی ملک کی حکومت پر قابض رہیگا۔ تیسرے یہ کہ اس عالمگیر جنگ میں زار روس بھی حصہ لیگا۔ چوتھے یہ کہ اسکے دوران میں ایسے سامان پیدا ہونگے کہ اسکی

حکومت جاتی رہیگی، پانچویں یہ کہ وہ اسوقت مارا نہیں جائیگا بلکہ زندہ رہیگا اور اپنی مصیبت اور ذلت کو دیکھیگا جو معمولی نہ ہوگی بلکہ کامل ذلت ہوگی۔ اب دیکھو کہ نو سال کے بعد جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فوت بھی ہو چکے تھے یہ پیشگوئی کس زور سے پوری ہوئی ایک ایک بات اسی طرح واقع میں آئی جس طرح کہ آپنے بیان فرمائی تھی۔ کیسا زبردست نشان ہے۔ اگر کوئی ذرا بھی سوچے، تو اُسے معلوم ہوجائیگا کہ یہ نشان ایک علیم ہستی کے وجود پر زبردست شہادت ہے۔ روس کے بادشاہ کی کتنی بڑی طاقت تھی۔ مگر اچانک ایسے حالات پیدا ہوگئے اور وہ اس طرح ذلیل ہوا کہ پتھر سے پتھر دل کو اس کے حالات سن کر رحم آجاتا ہے۔ جب وہ معزول ہوا۔ اسوقت وہ خود فوج کی کمانڈ کر رہا تھا۔ سے دار السلطنت سے تار گئی کہ پیچھے ملک میں فساد ہوگیا ہے اسنے جواب دیا کہ لوگوں کو سمجھاؤ۔ گورنر نے تار دی کہ لوگ سمجھانے سے نہیں باز آتے اسنے جواب میں تار دی کہ سختی کرو۔ اسپر گورنر کی تار آئی کہ سختی سے اور بھی جوش بڑھ رہا ہے۔ اسپر زار نے جواب دیا کہ اچھا میں خود آتا ہوں۔ راستے میں پھر تار ملی کہ فساد بڑھ رہا ہے زار نے جواباً پہلے گورنر کو بدل کر دوسرے گورنر کے مقرر کیئے جانے کی ہدایت بھیجی۔ ابھی رستہ میں ہی تھا کہ اور تار ملی۔ کہ حالت بہت نازک ہوگئی ہے اور آپکا آنا مناسب نہیں۔ مگر اسنے جواب دیا کہ نہیں میں آونگا۔ ابھی تھوڑی ہی دور ریل چلی تھی کہ پھر تار ملی کہ بغاوت عام ہوگئی ہے مگر اسوقت بھی اسے یہی خیال تھا کہ میں جاکر سب کو سیدھا کر لونگا اور اسنے ریل کو آگے لیجانیکا حکم دیا ابھی دو چار گھنٹے کا سفر طے کیا تھا کہ ایک سٹیشن پر اس کی ریل ٹھہرا لی گئی اور نئی حکومت کی طرف سے اس کی گرفتاری کے وارنٹ لیکر لوگ آپہونچے اور اسے گرفتار کر لیا وہ ایک زبردست بادشاہ کی حیثیت میں ریل پر چڑھا تھا۔ ہاں ایسے زبردست بادشاہ کی حیثیت میں کہ انگریزی حکومت بھی باوجود اپنی وسعت کے اس سے ڈرتی تھی۔ لیکن ابھی اس کا سفر ختم نہ ہوا تھا کہ اسی گاڑی میں ایک معمولی قیدی کی حیثیت میں قید کیا گیا۔ اسکے بعد اسے جس طرح دکھ دیئے گئے۔ وہ نہایت ہی دردناک ہیں، رذیل لوگوں نے اسکے سامنے اس کی لڑکیوں سے زنا بالجبر کیا۔ اور اسکو مجبور کرکے یہ حرکات دکھاتے رہے اس سے اندازہ کرلو کہ زار کا حال کیسا حال زار ہوا۔ اور کس طرح حضرت مسیح موعود کی یہ

پیشگوئی کہ " زار بھی ہوگا تو ہوگا اس گھڑی باحال زار " ہیبت ناک طور سے پوری ہوئی
اس صفت کے متعلق ایک چھوٹا سا تجربہ اپنا بھی سُنا دیتا ہوں - ہماری جماعت کے ایک ڈاکٹر ہیں انکے متعلق خبر آئی کہ وہ بصرہ کی طرف مارے گئے ہیں - اس خبر کے آنے کے چند روز ہی پہلے ان کے والد اور والدہ قادیان بغرض ملاقات آئے تھے - میں نے ان کو دیکھا کہ وہ بہت ہی ضعیف تھے - جسوقت مینے یہ خبر سنی میری آنکھوں کے سامنے انکے ضعف کا نقشہ کھنچ گیا اور ساتھ ہی یہ خیال گذرا کہ ڈاکٹر صاحب ان کے اکلوتے بیٹے تھے (گو بعد میں معلوم ہوا کہ انکے اور بھی بیٹے تھے) اور میرے دل کو اس غم کا خیال کر کے جو انکو پہنچا ہوگا سخت تکلیف ہوئی - اور بار بار میرے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کاش وہ نہ مرے ہوں - گو بظاہر یہ خیال بیوقوفی کا ہو مگر میں سمجھتا ہوں الٰہی تحریک کے ماتحت اور دعا کرانے کی غرض سے تھا - خیر جب میں رات کو سویا تو مینے خواب میں دیکھا کہ تین دن ہوئے ہیں کہ وہ زندہ ہو گئے ہیں - مینے دوسرے دن کھانے کے وقت اپنے بعض عزیزوں کو یہ خواب سنائی - میرے چھوٹے بھائی نے کہ جن کی ڈاکٹر صاحب کے ایک رشتہ کے بھائی سے دوستی تھی - اور جو قادیان میں رہتے ہیں - اس خواب کا ذکر کر دیا - انہوں نے اپنے گھر اطلاع کر دی اسکے جواب میں ان کو خط ملا کہ ان کی خواب پوری ہو گئی ہے - عراق سے اطلاع آگئی ہے کہ ان کی موت کے متعلق غلطی لگی تھی ان کو بدو پکڑ کر لے گئے تھے اور غلطی سے یہ خیال کر لیا گیا کہ وہ مارے گئے ہیں لیکن بعد میں ایک موقع ملنے پر وہ بھاگ کر خیریت سے واپس آگئے ہیں *

اسی قسم کا ایک اور ذاتی تجربہ میں بیان کرتا ہوں - گذشتہ سال کے سفر کشمیر میں مینے دیکھا کہ ایروپلین کے ذریعہ میرے پاس ایک خط آیا ہے - مینے یہ خواب دوستوں کو سنائی اور پھر خود بھول گیا - چند ہی دن بعد ایک خط آیا جسپر لکھا تھا By air mail اور اسے دیکھکر میاں عبد السلام صاحب حضرت خلیفہ اول کے صاحبزادے نے وہ رویا یاد دلائی

یہ تو خدا تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے کی مثالیں ہیں - اسکے سوا اقتداری علم بھی ہستی باری کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے - اقتداری علم کی بڑی مثال خود قرآن کریم ہے - اسکے

متعلق دعویٰ ہے کہ کوئی ایسا کلام بنا کر نہیں لا سکتا بلکہ اس جیسی تین آیات بھی بنا کر پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم انہی الفاظ میں ہے جنکو سب استعمال کرتے ہیں اور عربی بولنے والے لوگوں میں اسلام کے دشمن بھی ہیں اور خود مذہب کے دشمن بھی ہیں دہریے بھی ہیں مگر ابتک کسی میں یہ طاقت نہیں ہوئی کہ قرآن کریم کے اس دعویٰ کو رد کر سکے +

دوسری مثال حضرت مسیح موعود کی عربی کتب ہیں۔ آپنے بھی انکے بیمثل ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور چیلنج دیا ہے کہ کوئی ان کا جواب بنا سکتا ہو تو بنا کر دکھائے باوجود اسکے کہ حضرت مسیح موعود عجمی تھے اور آپکے دشمن بڑے بڑے علماء عجم کے علاوہ علمائے عرب بھی تھے مگر سب لوگ آپکی غلطیاں نکالنے کا دعویٰ تو کرتے رہے مگر آپکی کتب کی مثل لانے کیلئے سامنے نہ آئے۔ پچھلے دنوں یہاں پروفیسر مارگولیتھ صاحب آئے تھے وہ انگریزوں میں سے عربی کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے میری معجزات پر گفتگو ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ کیا قرآن والا معجزہ اب بھی دکھا یا جا سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے پکڑ کر ان کے منہ سے اسی معجزہ کا مطالبہ کروایا جو حضرت مسیح موعود کے ہاتھ پر ظاہر ہو چکا تھا۔ میں نے کہا ہاں اس زمانہ میں بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ بلکہ دکھایا گیا ہے۔ مینے حضرت مسیح موعود کی کتاب الہدیٰ اسکے سامنے رکھدی۔ اور کہا اس کی نظیر لانے والے کیلئے حضرت صاحب نے بیس ہزار کا انعام رکھا ہے۔ اور میں یہ اقرار لکھ دیتا ہوں۔ کہ جو اس کی مثل لے آئیگا۔ اسکو میں یہ انعام دیدونگا۔ اسپر وہ خاموش ہو گیا +

یہ چند مثالیں مینے خدا کی صفات کی دی ہیں۔ ان سے پتہ لگتا ہے کہ خدا کی ہر صفت اس کی ہستی کی دلیل ہے۔ پس خدا کو ثابت کرنے کیلئے نہ فلسفہ کی ضرورت ہے۔ نہ کسی اور چیز کی جب کوئی پوچھے کہ خدا کی ہستی کا کیا ثبوت ہے۔ تو اس وقت خدا کی جو صفت بھی بندوں کے ساتھ تعلق رکھنے والی سامنے آئے۔ وہ پیش کر دی جائے۔ اسکے مقابلہ میں کوئی نہ ٹھہر سکیگا خدا تعالیٰ کے کم از کم ۹۹ نام ہیں۔ اسلئے ۹۹ ہی صفات ہوئیں اور ان میں سے ہر ایک خدا کی ہستی کی دلیل ہے +

صفات پر اعتراض اور اسکا جواب

ان دلائل کے بیان کرنیکے بعد میں چند ان

اعتراضات کا جواب دیتا ہوں جو صفات الٓہیہ پر منکرین ہستی باری کیا کرتے ہیں۔
انمیں سے بعض صفات باری کا ذکر سنکر کہا کرتے ہیں کہ ہم علمی اور پرانی بحثوں میں نہیں پڑتے۔ ہم کم ازکم ہمیں تین باتوں کا مشاہدہ کرادو یعنی اول خدا کے علم کا دوسرے خدا کی قدرت کا۔ تیسرے خدا کی خلق کا۔ اگر خدا کو علم ہے۔ تو یہ کتاب پڑی ہے۔ اس کو پڑھدے۔ اگر قدرت ہے۔ تو یہ تنکا پڑا ہے۔ اسے اُٹھالے۔ اگر وہ خالق ہے تو یہ مٹی کا ڈلہ پڑا ہے اس سے کچھ بنا کر دکھادے۔ جب حضرت صاحب نے دعویٰ کیا کہ خدا مجھ پر علم غیب ظاہر کرتا ہے۔ تو ایک پادری نے اسی قسم کا سوال کیا تھا اسنے کہا کہ میں چند سوال لکھکر بند کر کے رکھدونگا آپ خدا سے پڑھوا کر بتادیں کہ کیا سوال ہیں؟ حضرت صاحب نے اسکے جواب میں فرمایا۔ چلو ہم تمہاری یہی بات مان لیتے ہیں۔ بشرطیکہ عیسائیوں کی ایک جماعت اقرار کرے۔ کہ صحیح جواب ملنے پر وہ مسلمان ہوجائینگے۔ ورنہ خدا تماشہ نہیں کرتا۔ کہ لوگوں کی مرضی کے مطابق جس طرح وہ کہیں نشان دکھاتا رہے۔

غرض منکرین یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو اسکے علم کی۔ قدرت کی اور خلق کی تازہ بتازہ مثالیں جس قسم کی ہم کہتے ہیں دکھادو؟

اسکا جواب یہ ہے کہ ہر ایک سوال کی دو غرضیں ہوتی ہیں۔ سوال یا تو اپنے علم کی زیادتی کیلئے کیا جاتا ہے۔ یا دوسرے کے علم کا امتحان لینے کیلئے۔ اور اس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے۔ کہ جس سے سوال کیا جائے۔ اس کی جو حیثیت ہو۔ اسی کے مطابق سوال کیا جائے مثلاً اگر ایک سپاہی کو ایک لفٹینٹ ملے۔ اور وہ سپاہی اس سے کچھ دریافت کرنا چاہے تو وہ اس طرح نہیں کریگا کہ اسے کان سے پکڑ کر کہے کہ بتاؤ فلاں بات کس طرح ہے؟ بلکہ سارے آداب کو مد نظر رکھکر اس سے بات کریگا۔ غرض جو اپنے سے بالا ہو اس سے سوال کرنیکے اور آداب ہوتے ہیں اور جو کمتر ہو اسکے آداب اور ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ خدا تعالےٰ کے وجود کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اسے ایک طالب علم یا امیدوار ملازمت کی حیثیت میں نہیں پیش کرتے کہ ممتحن یا ملازم رکھنے والے اپنی مرضی کے مطابق جسطرح چاہیں اور جو چاہیں اس سے پوچھیں وہ بادشاہ ہے سب بادشاہوں کا مالک ہے آقا ہے حاکم ہے

خالق ہے محسن ہی ہمارا ذرہ ذرہ اسکی پیدائش ہے۔ اگر ایک شخص اسکی ذات عالی کے متعلق بہ طور فرض کے بھی سوال کرے تو اسے مدنظر رکھنا ہوگا کہ وہ کس ہستی کے متعلق سوال کر رہا ہے۔ ذرہ غور کرو کہ اگر کوئی کہے کہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوں یا ڈپٹی کمشنر ہوں تو کیا لوگ یہ کیا کرتے ہیں کہ اپنی مرضی کے سوالات بنا کر اسکے سامنے پیش کر دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان کو حل کر دو۔ تب ہم تمہیں افسر پولیس یا ڈپٹی کمشنر مانینگے۔ دنیا میں کوئی شخص بھی حکام کی حقیقت معلوم کرنیکے لئے ایسا نہیں کرتا بلکہ اگر شک ہو تو ان سے ثبوت طلب کرتے ہیں آگے ان کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ جس رنگ میں چاہیں ثبوت دیں اگر وہ ثبوت ان کے دعوٰی کو ثابت کرنیوالا ہو تو لوگوں کو ماننا پڑتا ہے خواہ وہ اس رنگ کا نہو جس رنگ کا ثبوت کہ لوگ چاہتے تھے۔ اسی طرح کیا کوئی شاگرد یہ بھی کہا کرتا ہے کہ میں استاد کا امتحان پہلے لیلوں پھر سمجھونگا کہ وہ میرا استاد بننے کے قابل ہے یا نہیں۔ جب وہ اس کے پڑھیگا اسے خود ہی اس کی قابلیت یا جہالت کا علم ہو جائیگا یا بادشاہ کی مثال لو۔ اگر کسی بادشاہ کے متعلق کوئی سوال مثلاً یہی ہو کہ وہ گھوڑے کی سواری جانتا ہے یا نہیں تو کیا منکر اس سوال کو اس طرح حل کریگا کہ کہیگا کہ فلاں گھوڑے پر چڑھکر فلاں گلی میں سے گزرے تب میں مانونگا کہ وہ سوار ہے یا یہ کریگا کہ اگر بادشاہ سے پوچھ سکتا ہے تو اس سے پوچھ لیگا کہ کیا آپ سواری اچھی جانتے ہیں؟ یا پوچھ بھی نہیں سکتا تو جو اسکے مقرب ہیں ان سے دریافت کریگا اور اگر یہ بھی طاقت نہیں تو ایسے موقع کا منتظر رہیگا جب وہ سوار ہو کر نکلے اور یہ اسکی سواری کا اندازہ کر سکے اگر ایسا شخص بادشاہ کے پاس جاکر اس قسم کا سوال کریگا کہ چل کر امتحان دو تو یقیناً یہ سزا پائیگا۔

بس خدا تعالٰے چونکہ ہمارے ماتحت نہیں۔ بلکہ ہم اسکے ماتحت ہیں۔ اور وہ سب پر غالب اور سب کا حاکم ہے۔ اسلئے اس کا پتہ لگانے کے لئے یہ کہنا درست نہیں، کہ جس طرح ہم کہیں۔ اس طرح کرے تو ہم مانینگے۔ بلکہ خدا کے انبیاء سے اس کی ہستی کے متعلق دریافت کرنا چاہئے۔ جو خدا تعالٰے کو اس کی شان کے مطابق تمام آداب کو مدنظر رکھکر اس کا پتہ

لگاتے ہیں۔ یا خود خدا تعالیٰ کی شان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا پتہ لگانا چاہیئے۔ اور خدا تعالیٰ جو ثبوت پیش کرے اگر وہ ثبوت کی حد تک پہنچ جائے تو اسے قبول کرنا چاہیئے نہ کہ یہ کہنا چاہیئے کہ جس طرح ہم خود چاہیں۔ اس طرح خدا کرے۔

اگر کہا جائے کہ بادشاہ کی مثال درست نہیں۔ کیونکہ بادشاہ آدمی ہی ہوتا ہے اور وہ انسان کی ہر ایک خواہش کو پورا نہیں کر سکتا۔ لیکن خدا تعالیٰ تو پورا کر سکتا ہے پھر اسکے متعلق کیوں نہ یہ کہیں۔ کہ جس طرح ہم چاہتے ہیں اسیطرح وہ اپنی ہستی کا ثبوت دے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ بادشاہ اس لئے لوگوں کے مطالبات کے مطابق اپنا امتحان نہیں دیتا کہ اسکا وقت خرچ ہوتا ہے بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اسے اپنے عہدہ کے خلاف سمجھتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے کس طرح ان مطالبات کو قبول کر سکتا ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ اگر انسان کی خواہش کو پورا کر کے ہی خدا کی ہستی کا ثبوت دیا جا سکتا ہے تو پھر درحقیقت خدا تعالیٰ کا وجود ثابت ہی نہیں کیا جا سکتا فرض کرو دو شخص سندر سنگھ اور آتما سنگھ ہوں اور ان میں مقدمہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کہے کہ میرے نزدیک خدا کی ہستی کا ثبوت یہ ہو سکتا ہے کہ اس مقدمہ میں میں جیت جاؤں اور میں صرف اسی صورت میں اسے مان سکتا ہوں تو خدا تعالےٰ کس کے مطالبہ کو پورا کرے۔ اگر ایک کے مطالبہ کو پورا کرے۔ تو دوسرا نہ مانیگا۔ یا مثلاً گذشتہ جنگ میں ہی جرمن کہتے۔ کہ اگر خدا نے ہمیں فتح دی تو ہم اسے مان لینگے۔ ادھر انگریز کہتے۔ کہ اگر خدا نے ہمیں فتح دی تو ہم اسے مان لینگے۔ اب فتح تو ایک فریق کو ہی ہو سکتی تھی اسلئے دوسرا فریق انکار پر ہی قائم رہتا۔ پس اس طرح اگر خدا کا ثبوت طلب کرنا درست ہو تو کم سے کم آدھی دنیا کیلئے تو ہدایت کا کوئی رستہ باقی نہیں رہتا۔ چور کہتے کہ اگر ہمیں چوری میں کامیابی نہ ہوئی۔ ہم سمجھینگے خدا کوئی نہیں۔ ادھر مال والے کہتے اگر ہماری چوری ہوئی۔ تو ہم خدا کے وجود کے ہرگز قائل نہ ہونگے اگر کوئی خدا ہے تو اسے چاہیئے کہ ہمارے اموال کی حفاظت کرے۔ یہی حال دوسری باتوں میں ہوتا۔ اور اس طرح قانون قدرت

بالکل تباہ ہو جاتا۔ اگر کہو کہ خدا کسی ایک کو ہی اس طرح ثبوت دیدیتا۔ تو باقی لوگ مان لیتے ہم کہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ جو ثبوت خدا تعالیٰ نے دیئے ہیں تم ان کے یقینی ہونیکے باوجود ان کو نہیں مانتے۔ اگر تمہارا حق ہے کہ جو تمہارے مطالبے کے سوا ثبوت دیئے جائیں انہیں رد کر دو تو کیوں یہی حق دوسروں کو حاصل نہیں اور اگر سب کو یہی حق حاصل ہو تو نتیجہ وہی نکلیگا جو اوپر بیان ہو چکا ہے اور بجائے ایمان کی ترقی کے بے دینی اور کفر ترقی کریگا +

خدا کو ماننے والوں کے اخلاق

غرض خدا تعالیٰ کے نشانات کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ مگر اسکے منشا کے ماتحت ہو سکتا ہے۔ یہ ہمارا حق نہیں کہ ہم ان نشانات کی تعیین کریں جنکے ذریعہ سے وہ اپنی چہرہ نمائی کرے +

ایک اور اعتراض بھی خدا تعالےٰ کی ہستی پر کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا کو ماننے والے کہتے ہیں کہ خدا کے ماننے سے اعلیٰ اخلاق پیدا ہوتے ہیں مگر اسکے برخلاف دیکھا یہ جاتا ہے کہ سب سے بدتر اخلاق خدا کو ماننے والوں کے ہوتے ہیں۔ یورپ کے دہریے بھی اور ایشیاء کے دہریے بھی یہی اعتراض کرتے ہیں۔ ہندوستان والے کہتے ہیں کہ خدا کو زیادہ ماننے والے مسلمان ہیں۔ اگر جیلخانوں میں جا کر دیکھو تو سب سے زیادہ مسلمان ہی قیدی نظر آئینگے۔ اسی طرح ہندو اور مسیحی بھی خدا کو مانتے ہیں ان کی بھی کافی تعداد جیلخانوں میں سٹر رہی ہے +

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اخلاق کی خرابی خدا کے ماننے کا نتیجہ نہیں بلکہ خدا کو نہ ماننے کا نتیجہ ہے۔ کسی شخص کا صرف منہ سے کہنا کہ میں خدا کو مانتا ہوں مفید نہیں ہو سکتا۔ کیا کونین کو نین منہ سے کہنے سے بخار اتر جاتا ہے؟ اگر نہیں تو صرف منہ سے یہ کہنے سے کہ خدا کو مانتا ہوں۔ کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

پھر ہم کہتے ہیں۔ ہندوستان کے دہریے دیو سماجی ہیں۔ وہ یوں بھی کہتے ہیں اور ٹریکٹوں میں بھی لکھتے ہیں کہ ان کی سماج میں جو لوگ شامل ہوتے ہیں ان میں جرم کم ہوتے ہیں۔ اگر ان کے اس دعویٰ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی ہم کہتے ہیں کہ اسکی

تعریف کے دیو سماجی مستحق نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ دیو سماجی بنانے سے پہلے ایک فارم پُر کراتے ہیں جس پر داخل ہونیوالا اقرار کرتا ہے کہ میں فلاں فلاں عیب سے پرہیز کرتا ہوں جس کے یہ معنی ہیں کہ انکی سماج میں اسی شخص کو داخل کیا جاتا ہے کہ جس میں بعض گناہ جو زیادہ نمایاں ہیں پہلے ہی سے نہوں۔ پس ان کے گروہ کی اسمیں کیا خوبی ہوئی۔ کیا دوسری جماعتوں میں خوبیوں والے آدمی نہیں پائے جاتے۔ اگر وہ جماعتیں بھی اپنے معیوب آدمیوں کو باہر نکالیں تو کیا وہ دیو سماج سے ہزاروں گنے بڑھکر پاک و صاف لوگ نہیں دکھا سکتیں۔ دیو سماجیوں کا دعویٰ ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی فوجی افسر دعویٰ کرے کہ دیکھو ہمارا فوجی انتظام کیسا اعلیٰ ہے کہ اس میں جو آتا ہے اسکی چھاتی چوڑی ہو جاتی ہے قد لمبا ہو جاتا ہے حالانکہ حق یہ ہے کہ فوج میں لیتے ہی ایسے شخص کو ہیں جو اچھے قد کا ہو اور اسکا سینہ چوڑا ہو۔ اور یہ حالت فوج کیوجہ سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ ان حالات کے آدمیوں کو لینے کی وجہ سے فوج کو یہ خوبی حاصل ہوتی ہے +

یا مثلاً کوئی ہسپتال میں جائے۔ اور جاکر مریضوں کو دیکھے اور کہے یہ اچھا ہسپتال ہے جس میں کانے۔ لنگڑے۔ لولے بیمار پڑے ہیں۔ حالانکہ ہسپتال بنایا ہی ایسے لوگوں کیلئے جاتا ہے۔ جو بیمار ہوں۔ پس ہم کہتے ہیں یہ دیو سماج کی تعلیم کا اثر اور خوبی نہیں۔ اگر اس میں عیب کرنیوالے کم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسمیں داخل وہی کیا جاتا ہے۔ جس کے متعلق اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ وہ عیب چھوڑ چکا ہے۔ پس دیو سماج کوئی مذہب نہیں کہ جس کا کام کمزوروں کی اصلاح ہوتا ہے بلکہ ایک کلب ہے کہ جسکا کام ایک خاص قسم کے لوگوں کو جمع کرنا ہوتا ہے۔ نبی کی مثال تو ڈاکٹر کی ہوتی ہے وہ بیماروں کی اصلاح کرنے کیلئے آتا ہے۔ اسکے ہسپتال میں مریضوں کا ہونا ضروری ہے۔ جو آہستہ آہستہ اسکے ہاتھ سے شفا پاتے ہیں۔ اور وہ سوائے اس صورت کے کہ بیمار اس سے علاج کرانے سے انکار کرے کسی کو دھتکارتا نہیں +

پھر یہ بھی غلط ہے کہ دیو سماجیوں میں عیب نہیں ہوتے۔ پیچھے جب ان میں جھگڑے پیدا ہوئے تو ایک دوسرے کے متعلق حتیٰ کہ بانئی دیو سماج کے متعلق بھی ایسی ایسی گندی باتیں لکھی گئیں۔ کہ شریف آدمی ان کو پڑھ بھی نہیں سکتا۔ یہی حال یورپ کے دہریوں کا ہے چنانچہ

امریکہ کی ایک دہریہ اخبار کی ایڈیٹر لکھتی ہے۔ کہ میں اسوقت تک ۱۸۰ آدمیوں سے بلا نکاح تعلق پیدا کر چکی ہوں۔ اور مجھے تو اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ وہ فعل ہے کہ جسے دہریہ بھی بُرا سمجھتے ہیں +

کیا خدا کے ماننے سے اعلیٰ اخلاق کا معیار گر جاتا ہے؟ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا کے ماننے سے اخلاق کا معیار گر جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کے ماننے والا نیکی اسلئے کرتا ہے کہ خدا سے کچھ امید رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر میں نے نیکی کی تو خدا مجھے انعام دیگا۔ لیکن خدا کو نہ ماننے والا نیکی کو نیکی سمجھکر کرتا ہے نہ کہ کسی لالچ کی وجہ سے۔ اسی طرح خدا کو ماننے والا خدا کے ڈر کی وجہ سے برائی کو چھوڑتا ہے۔ لیکن نہ ماننے والا بُرائی کو برائی سمجھکر چھوڑتا ہے۔ اور نیکی کو نیکی سمجھکر کرنا اور برائی کو بُرائی سمجھکر چھوڑنا بہ نسبت لالچ سے نیکی کرنے اور ڈر سے بُرائی کو چھوڑنے کے بہت اعلیٰ ہے +

ہم کہتے ہیں نیکی کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ وہ اس عمل یا خیال کا نام ہے جو ایک کامل اور بے عیب ذات سے مشابہت پیدا کرتا ہو۔ اور بدی اس فعل یا خیال کا نام ہے جو اُس کامل اور بے عیب ذات کی پسندیدگی یا فعل کے خلاف ہو۔ اس کامل نمونہ کی مشابہت یا مخالفت کو مد نظر رکھے بغیر نیکی کی کوئی صحیح تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر ایسا کامل نمونہ ہی موجود نہیں ہے تو پھر نیکی بدی کی مکمل تعریف بھی ناممکن ہے +

نیکی کیا ہے؟ جو لوگ خدا تعالیٰ کے ماننے والے نہیں یا جو لوگ خدا تعالیٰ کے وجود کو معرض بحث میں لانے کے بغیر اخلاق کی بحث کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں وہ نیکی کی تعریف میں اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نیکی وہ عمل ہے کہ جس سے سب سے زیادہ خوشی حاصل ہو۔ اور جو انہی حالات میں اتنی خوشی نہ پیدا کرے۔ وہ بدی +

دوسرے کہتے ہیں کہ خوشی کے کیا معنے ہیں؟ ایک شخص ڈاکہ مارتا ہے وہ اسی پر خوش ہوتا ہے۔ مگر ڈاکہ ڈالنا نیکی نہیں۔ اسلئے نیکی کی یہ تعریف درست نہیں۔ اسکی اصل تعریف یہ ہے کہ جس بات سے سب سے زیادہ نفع پہنچے وہ نیکی ہے۔ اور انہیں حالات میں جن امور میں کم نفع پہنچے یا نقصان پہنچے وہ بدی ہے +

مگر اسپر یہ سوال پڑتا ہے۔ کہ کس کو نفع پہونچے؟ اگر دوسروں کو تو جب کوئی مال لوٹنے لگے تو کیا اسے روکنا نہیں چاہئے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ جس قدر لیجا سکتے ہو لیجاؤ۔ کیونکہ مال سے اسکو فائدہ پہنچیگا اور یہ نیکی ہے۔

اسپر کہتے ہیں۔ نیکی وہ ہے جس سے اپنی ذات کو زیادہ نفع پہنچے۔ اور بدی وہ ہے جس سے اپنی ذات کو نقصان پہونچے۔ مگر اس تعریف سے تو وہی اعتراض منکرین خدا پر عائد ہو گیا جو وہ خدا کو ماننے والوں پر کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کا اعتراض تو یہی تھا کہ خدا کو ماننے والے نیکی لالچ کی وجہ سے کرتے ہیں۔ لیکن اگر نیکی کی یہ تعریف ہے کہ جس سے اپنی ذات کو سب سے زیادہ خوشی یا نفع پہنچے تو پھر ایک دہریہ بھی تو نیکی کی خاطر نہیں بلکہ خوشی اور نفع کیخاطر کرتا ہے۔ پس اگر خدا کو ماننے والا نیکی خدا کی خوشی کیخاطر کرتا ہے یا بدی سے اسکی سزا سے ڈر کر بچتا ہے تو اسپر اعتراض کیوں ہو؟۔

بعض یورپ کے فلاسفر نیکی کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ نیکی ایک فرض کا نام ہے مگر یہ تعریف بھی انکے کام نہیں آسکتی۔ کیونکہ فرض وہ چیز ہے جسے کوئی دوسرا وجود ہمارے لئے مقرر کر دیتا ہے۔ اگر نیکی کو فرض قرار دیا گیا تو فرض مقرر کرنیوالے وجود کو بھی ماننا پڑیگا۔

غرض منکرین خدا کا یہ دعویٰ کہ انکے کاموں کا مقصد خدا پرستوں سے اعلیٰ ہے کیونکہ وہ نیکی نیکی کیخاطر کرتے ہیں ایک دھوکا ہے ایک فریب ہے کیونکہ وہ خدا کو چھوڑ کر مجبور ہیں کہ نیکی کی تعریف یہ کریں کہ جس سے اپنی ذات کو سب سے زیادہ خوشی ہو یا فائدہ ہو اور اسی تعریف کے ماتحت وہ لالچ کے الزام سے بچتے نہیں بلکہ اور بھی زیادہ اس الزام کے نیچے آجاتے ہیں اُن کے تمام کام اپنے ذاتی نفع اور ذاتی فائدہ کیلئے ہوتے ہیں۔

نیکی بدی کے متعلق مومن کا مقام

دوسرا اور حقیقی جواب دہریوں کے اعتراض کا یہ ہے کہ تم نے مومن کے کاموں کا جو مقصد قرار دیا ہے وہ فرضی ہے پہلے تم نے فرضی طور پر ایک بات بنائی ہے اور پھر اسے مومن کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ کس وجہ سے فرض کر لیا گیا ہے کہ ایک خدا کو ماننے والا دل سے تو یہ چاہتا ہے کہ بدی کرے مگر خدا کے خوف سے بدی نہیں کرتا یا یہ کہ وہ دل سے تو چاہتا ہے کہ نیکی کے کام نہ کرے مگر لالچ کی وجہ سے

نیک کام کرتا ہے۔ ایک سچے مومن پر یہ اتہام ہے۔ وہ اس مقام سے بہت بالا ہوتا ہے وہ اسلئے نیکی نہیں کرتا یا بدی سے اجتناب نہیں کرتا کہ خدا دیکھتا ہے اس سے انعام ملیگا یا وہ سزا دیگا بلکہ اسلئے نیکی کرتا اور بدی سے بچتا ہے کہ خدا تعالیٰ اسے یونہی کہتا ہے۔ پس چونکہ وہ خدا تعالیٰ کا ماننے والا ہے وہ اسکے حکم کو بجالانا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے قطع نظر اسکے کہ کسی جزا کی امید یا سزا کا خوف اسکے دل میں ہو +

تیسرا جواب یہ ہے کہ نیکی کرنے پر ثواب کو اور بدی کرنے پر عتاب کو مدنظر رکھنا تو ہمارے مذہب میں نہایت ہی ادنیٰ بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی مومن یہ کہے کہ میں نماز یں اس لئے پڑھتا ہوں کہ انکے بدلے میں جنت ملیگی، تو یہ ایک قسم کا شرک ہو جائیگا۔ اور اسلام کی روح کے خلاف ہوگا۔ مومن تو اسلئے نیکی کرتا اور بدی سے بچتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ نیکی اپنی ذات میں حسن رکھتی ہے اور بدی عیب اور عبادات کی قسم کی نیکیاں وہ اسلئے کرتا ہے کہ اسپر خدا تعالیٰ کے بہت سے احسانات ہیں۔ وہ نماز اسلئے نہیں پڑھتا کہ جنت ملیگی۔ یا روزہ اسلئے نہیں رکھتا کہ دوزخ کا اسے ڈر ہوتا ہے۔ بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی جو عبادت بھی کرتا ہے۔ وہ اسلئے کرتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے اسے پیدا کیا۔ اور اپنی صفت ربوبیت اور رحمانیت کے ماتحت اسپر احسان کئے۔ گویا مومن کو آیندہ کی لالچ مدنظر نہیں ہوتی۔ بلکہ پچھلے احسانوں اور انعاموں کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ نماز میں مومن کیا کہتا ہے؟ یہی نہ کہ الحمد للہ رب العلمین۔ الرحمٰن الرحیم۔ مالک یوم الدین۔ ان آیات میں دیکھ لو کہ اکثر حصہ پچھلے انعامات، کے شکریہ کے متعلق ہی ہے اور آیندہ کا ذکر صرف اختصار کے ساتھ آیا ہے۔ پس مومن کی عبادات بطور شکریہ ہوتی ہیں نہ بغرض لالچ۔ اور شکر گزاری کو دنیا کی کوئی قوم بھی برا نہیں کہتی بلکہ سب ہی اسے مستحسن فعل سمجھتے ہیں +

باقی رہا یہ سوال کہ مذاہب میں نیک کاموں کے بدلہ میں ثواب کا وعدہ دیا جاتا ہے سو اسکا جواب یہ ہے کہ خدا کا معاملہ اسکے اختیار میں ہے اسکے بدلہ دینے کے یہ معنی نہیں کہ مومن اس بدلہ کیلئے یہ کام کرتا ہے ایک دوست دوسرے دوست کو ملنے جاتا ہے تو وہ اسکی خاطر کرتا ہے اور سب ہی جانتے ہیں کہ جب دوست دوست کے پاس جائیگا تو اس کی خاطر بھی ہوگی۔ مگر کوئی نہیں کہتا

کہ دوست اسلیئے دوست سے ملنے گیا تھا کہ تا اسے اچھے اچھے کھانے کھلائے جائیں۔ اسکا جانا محبت کی وجہ سے تھا اور دوسرے کا اس کی خاطر کرنا بھی اپنی محبت کے تقاضے سے تھا۔

مکمل نیکی خدا کو ماننے والا ہی کر سکتا ہے

چوتھا جواب یہ ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو نیکی کے جس درجہ تک خدا کو ماننے والا پہنچ سکتا ہے دوسرا انسان پہنچ ہی نہیں سکتا۔ نہ دوسرا کوئی شخص ان تمام اقسام کی نیکیوں کو سمجھ سکتا ہے جو ایک خدا پرست کرتا ہے۔ اسلیئے کہ کئی نیکیاں ایسی ہیں کہ جنکے کرنے میں کرنیوالے کا کوئی بھی فایدہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے۔ کہ ماں باپ سے نیک سلوک کرنا بچے کیلیئے کسی رنگ میں بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ پس انکے آرام کیلیئے تکلیف اٹھانا یا ان پر مال خرچ کرنا ایک دہریہ کیلیئے بدی ہونا چاہیئے۔ اور وہ روپیہ جو ان پر خرچ کیا جاتا ہے اسکا اپنی ذات پر خرچ کرنا بھی ہونا چاہیئے لیکن دہریہ عملاً ایسا نہیں کرتا وہ بھی ماں باپ سے نیک سلوک کرتا ہے حالانکہ عقلاً یہ کام صرف خدا کا ماننے والا کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ شکر گذاری کو نیکی سمجھتا ہے اور شکر گزاری صرف خدا کو مان کر ہی نیکی کہلا سکتی ہے۔ اسکے علاوہ اور بہت سی نیکیاں ہیں جو صرف اسی تعریف کے ماتحت نیکی کہلا سکتی ہیں کہ ایک کامل وجود ہے جو اپنے حسن میں بے مثل ہے۔ اس کی مشابہت پیدا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے ورنہ فائدہ اور خوشی کے لحاظ سے وہ نیکیاں نہیں کہلا سکتیں اور جس قدر نیکیاں کہ جان کی قربانیاں یا ساری عمر کے آرام کی قربانیاں چاہتی ہیں وہ سب اسی تعریف کے ماتحت نیکیاں کہلا سکتی ہیں۔ پس خدا پرست ہی کیلیئے موقع ہے کہ وہ کامل نیک ہو سکے جو خدا کو نہیں مانتا اگر وہ اپنے دعوے کے مطابق عمل کرے تو اسکے لئے نیک بننے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ دہریہ خدا کے ماننے والوں کے اخلاق پر تو اعتراض کر جاتا ہے مگر جہاں اسکی تعریف نیکی کی رہجاتی ہے وہاں وہ اپنے دعویٰ کے خلاف خدا کو ماننے والے کی تعریف کے مطابق نیکی کر کے اپنی ضمیر کو خاموش کرنا چاہتا ہے گو اسکا عمل اسکے دعویٰ کو رد کر رہا ہوتا ہے۔

ادنیٰ کیلیئے اعلیٰ کی قربانی

خدا تعالیٰ کے منکرین اللہ تعالیٰ کے وجود کے خلاف ایک یہ اعتراض بھی پیش کیا کرتے ہیں کہ اگر خدا تعالیٰ ہوتا تو ہمیں یہ بات نظر آتی کہ

اعلیٰ چیزیں ادنیٰ پر قربانی کیجاتی ہیں جیسے مچھر اور طاعون کے کیڑے ہیں کہ انکی پرورش انسان کی قربانی پر ہو رہی ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی تدبیر کی بالارادہ ہستی کے حکم کے ماتحت نہیں ہو رہی +

اس بات کی تفصیل کہ مچھر اور ٹڈی وغیرہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں تو میں آگے بیان کرونگا فی الحال اس سوال کا جواب دیتا ہوں جو ادنیٰ پر اعلیٰ کے قربان ہونے کیتعلق کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دنیا کا نظام اور انسان کو پیدا کرنے کی غرض اسی طرح پوری ہو سکتی تھی۔ کہ انسان مرتا۔ اور یہ چیزیں انسان کے مارنے کے ذرائع میں سے بعض ذریعے ہیں۔ پس چونکہ انسان کا مرنا اسکی ترقیات کیلئے ضروری تھا۔ اسلئے بعض ذرائع اس کی موت کیلئے پیدا کئے جانے بھی ضروری تھے۔ پس ان کیڑوں کے ذریعہ سے ادنیٰ پر اعلیٰ قربان نہیں ہو رہا بلکہ اعلیٰ کو اعلیٰ مقام پر لیجایا جاتا ہے +

قرآن میں دہریت کا کیوں رد نہیں؟

دہریہ لوگ مذاہب پر ایک اور بھی سوال کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا ہے تو اسے سب سے پہلے دہریت کا رد اپنی کتب میں کرنا چاہئے تھا مگر سب کتب دہریت کے متعلق خاموش ہیں حالانکہ مذہب کا سب سے بڑا دشمن یہ مسئلہ ہے پس مذہبی کتب کی خاموشی ثابت کرتی ہے کہ چونکہ یہ کتب انسانوں نے بنائی ہیں اور ان کے زمانہ میں دہریت کے عقاید رائج نہ تھے وہ انکا جواب دینے کی کوشش بھی نہیں کر سکے ورنہ جو مسئلہ سب سے بڑا ہے اسے بالکل نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا تھا۔ قرآن کریم جو سب سے آخری کتاب کہی جاتی ہے وہ بھی اس مسئلہ میں بالکل خاموش ہے حالانکہ شرک کے رد میں اسمیں بہت زور لگایا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسے علاقہ میں رہتے تھے۔ جہاں دہریت کو ماننے والا کوئی نہ تھا۔ اسلئے اسکے متعلق انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور شرک کے متعلق بہت کچھ بیان کر دیا۔ کیونکہ ان کے چاروں طرف مشرک ہی مشرک تھے +

دوسرے مذاہب کی مجھے اسوقت سروکار نہیں اسلام کے متعلق یہ اعتراض غلط ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دہریت کے متعلق علم تھا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ آپنے فرمایا کہ ایک ایسا زمانہ آنیوالا ہے جبکہ لوگ کہیں گے۔ دنیا کو کس نے بنایا؟ جب

اسے بتایا جائیگا کہ خدا نے تو وہ پوچھیگا کہ خدا کو کسنے بنایا ہے؟ اور یہی وہ سوال ہے جو دہریت کے بانی سپنسر نے اپنی کتاب میں اُٹھایا ہے پس اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالےٰ نے دہریت کے متعلق علم دیا ہوا تھا حالانکہ عرب دہریوں سے خالی تھا اب میں بتاتا ہوں۔ کہ قرآن کریم میں اس اعتراض کو صاف لفظوں میں کیوں نہیں اُٹھایا گیا

یہ بات ظاہر ہے کہ اگر قرآن کریم انسانی طاقت سے بالا ثابت ہو جائے تو علاوہ اس کے کہ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) خدا تعالیٰ کیطرف سے ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا بھی ضرور ہے۔ پس قرآن کریم کی سچائی ثابت ہو جانیکے ساتھ دہریت کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس صورت میں اسکا ایک ایک لفظ دہریت کا رد بنجاتا ہے۔ پس دہریت کا سوال کوئی مستقل سوال نہیں ہو۔ کلام الٰہی کے سوال کے حل ہونیکے ساتھ یہ خود حل ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کے ثابت کر دینے کے بعد کلام الٰہی کا سوال حل کرنا پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے وہی طریق اختیار کیا جس سے کہ دو سوال ایک دم حل ہو جاتے تھے یعنی قرآن کریم کے ایک بالا ہستی کی طرف سے نازل ہونیکا ثبوت دیدیا اور اس ثبوت میں دہریت کا جواب خود بخود آگیا۔ پس یہ کہنا کہ شرک کا رد قرآن کریم میں زیادہ ہے بالکل غلط ہے۔ شرک کے رد میں تو خاص خاص آیتیں ہیں اور دہریت کے رد میں قرآن کریم کی ہر اک آیت ہو اور جب ہر آیت قرآن دہریت کا رد ہے تو الگ ذکر کی کیا ضرورت تھی؟۔

لیکن حق یہ ہے کہ قرآن کریم میں دہریت کے رد کے دلائل الگ بھی بیان ہیں جیسا کہ شروع مضمون میں ہمنے بیان کیا ہے گو انکا نام کوئی نہیں رکھا گیا کیونکہ دہریئے خود اپنا نام کوئی تجویز نہیں کرتے۔

خدا تعالیٰ کی ہستی کو مان لینے کے بعد کی حالت

ہستی باریتعالےٰ کا ثبوت دینے اور اسکے متعلق جو اعتراض کئے جاتے ہیں۔ ان کو دور کرنیکے بعد ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جو مقام حیرت کہلاتا ہے۔ کیونکہ کسی شخص پر یہ ثابت ہو جانے کہ میرا پیدا کرنیوالا کوئی موجود ہے تو اسکے دل میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے کیسا ہے میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ اور مجھے اس سے کس طرح معاملہ کرنا چاہیئے؟ غرض

بیسیوں سوالات اور خواہشات معاً دل میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ان سوالات کے جواب دیئے بغیر ہستی باری تعالیٰ کا مضمون مکمل نہیں ہو سکتا۔ پس اب میں ان سوالات کو جو خدا تعالیٰ کو مان کر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں یا کم سے کم ان میں سے بڑے بڑے سوالات کو لیکر ایک ایک کر کے جواب دیتا ہوں *

خدا تعالیٰ کا نام جب انسان کسی چیز کا علم حاصل کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کا نام معلوم کرنے کی اسکے دل میں خواہش ہوتی ہے۔ پس میں اسی سوال کو پہلے لیتا ہوں کہ کیا خدا کا کوئی ذاتی نام بھی ہے انسانی فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ایک اہم سوال ہے۔ کیونکہ انسان بلا نام کے کسی چیز کو اپنے ذہن میں لانے سے بہت حد تک قاصر رہتا ہے مگر عجیب بات ہے کہ سوائے اسلام کے اور کسی مذہب میں خدا کا ذاتی نام کوئی نہیں۔ نہ یہودیوں میں۔ نہ عیسائیوں میں۔ نہ بدھوں میں۔ نہ ہندوؤں میں۔ نہ زرتشتیوں میں نہ کسی اور مذہب میں۔ صرف صفاتی نام ہیں۔ جیسے ہندوؤں میں "پرماتما" کا لفظ ہے۔ یعنی بڑی آتما۔ پرم ایشور یعنی بڑا ایشور۔ ان ناموں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کو بھی وہ دنیا کا ہی ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ جو گو بڑا ہے مگر دنیا سے کوئی الگ چیز نہیں۔ اسی طرح زرتشتیوں میں جو نام ہیں۔ وہ بھی صفاتی نام ہیں یعنی ان کے معنی ہوتے ہیں۔ اور خدا کے متعلق وہ اسیقدر دلالت کرتے جو کچھ ان کے معنوں سے پایا جاتا ہے۔ مسیحیوں میں بھی کوئی نام نہیں سب صفاتی نام ہیں۔ یہودیوں میں خدا کو یہوواہ کہتے ہیں۔ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ اس نام کے بھی معنے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہوواہ یہوی سے نکلا ہے جس کے معنے ہیں۔ گرنے والا۔ اور اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہستی جو انسان پر نازل ہو۔ مگر اس سے صرف خدا تعالیٰ کے متکلم یا نزول کی صفت معلوم ہوتی ہے۔ اسلئے یہ اسم ذات نہوا۔ بلکہ اسم صفت ہوا میرے نزدیک یہودے یا ہو ہے یعنی "اے وہ جو ہے" گویا نام کا پتہ نہیں۔ اور جس طرح کوئی ایسا شخص دور فاصلہ پر جا رہا ہو۔ جسکا نام معلوم نہ ہو مگر اسے مخاطب کرنے کی ضرورت ہو تو کہا جاتا ہے۔ ارے ٹھہر جاؤ۔ اسی طرح یہ نام ارے کا قائم مقام ہے اور اس میں صرف اس امر پر دلالت ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔ اس سے زیادہ اور کسی صفت پر اس سے دلالت نہیں ہوتی *

اسلام سے پہلے کسی کو خدا کا اسم ذات نہیں بتایا گیا

اصل بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے کسی قوم کو خدا کا اسم ذات بتایا ہی نہیں گیا - اور اس میں ایک بہت بڑی حکمت ہے - اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کا اسم ذات اسکی ساری صفات کو اپنے اندر رکھتا ہے - اور ساری صفات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے امت محمدیہ پر آکر ظاہر ہوئیں اسلئے اور کسی پر خدا تعالیٰ نے اپنا ذاتی نام ظاہر نہ کیا +

یہودیوں میں خدا کے نام کی عزت

یہودی "یہودا" نام کا بڑا ادب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیشہ اور ہر ایک کو یہ نام نہیں لینا چاہئے - کیونکہ اس طرح اس کی بے ادبی ہوتی ہے اسوجہ سے صرف ان کے علماء ہی یہ نام لیتے تھے اور اسکا صحیح تلفظ انہی کو آتا تھا اور ان کا دعویٰ تھا کہ کوئی دوسرا یہ نام لے تو اس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے - اور جو شخص بغیر باقاعدہ سولوی ہونیکے یہودا کا نام لے تو اسکے مرنے پر اس کا جنازہ وہ نہیں پڑھتے تھے (یعنی مرنے پر جو رسوم ادا کیجاتی ہیں ورنہ اسلامی جنازہ ان میں نہیں ہوتا) اور اسے برکت نہ دیتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اسکی نجات نہ ہوگی - علماء بھی اس نام کو لوگوں کے سامنے لیتے تو بگاڑ کر لیتے - تاکہ گناہ نہ ہو - اس نام کے متعلق انکا اسقدر اخفاء کرنا ہی اس امر کا موجب ہوا کہ مصریوں نے بڑی کوشش سے اس نام کو دریافت کیا اور یہ خیال کر کے کہ اس نام کی برکت سے یہودیوں نے ہم پر فتح پائی تھی اس نام کو اپنے جادوؤں میں داخل کر لیا چنانچہ مصری جادوؤں میں یہودا کا نام ضرور لیا جاتا تھا

اسلام میں خدا کا اسم ذات

مسلمانوں نے بھی اسی قسم کا دھوکہ کھایا ہے - اور وہ یہ ہے - کہ ان میں عام خیال پھیلا ہوا ہے کہ خدا کا ایک نام ایسا ہی - کہ عام لوگوں کے سامنے وہ نہیں لیا جاتا بلکہ صرف خاص خاص علماء کو اسکا علم ہے اور وہ اسے لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور خدا کا حکم بھی یہی ہے کہ اسے ہر اک پر ظاہر نہ کیا جائے اسے مسلمان "اسم اعظم" پکارتے ہیں اور انکا خیال ہے کہ پیر صاحب کی خدمت کر کے وہ نام حاصل ہوتا ہے، اور جسے وہ نام حاصل ہو گیا اسے گویا سب کچھ ملگیا - حالانکہ بات یہ ہی کہ یہودیوں کو تو کوئی نام ہی نہیں بتایا گیا تھا - جو نام انہیں بتائے گئے تھے وہ یہودا سمیت صفاتی نام تھے

اور ہمیں جو اسم اعظم دیا گیا ہے وہ اتنا ظاہر ہے کہ اسے کوئی چھپا ہی نہیں سکتا وہ نام اللہ ہے، یہ چھپانے والا نام نہیں بلکہ ظاہر کرنیوالا نام ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ کہ بلند آواز سے آذان میں اور نمازوں میں اَللہُ اَکْبَرُ کہو۔ غرض اسلام میں ہی اللہ تعالیٰ کا اسم ذات پایا جاتا ہے اور وہ اللہ کا لفظ ہے +

اللہ کا لفظ نہ مرکب ہے نہ مشتق نہ اسکے کوئی معنے ہیں یہ صرف اور صرف نام ہے بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ الالٰہ سے ہمزہ حذف ہو کر اللہ کا لفظ بنگیا ہے بالکل غلطی کرتے ہیں اسلئے کہ الالٰہ کا لفظ تو ہر معبود کے متعلق خواہ جھوٹا ہو یا سچا ہو جس کا ذکر ہو رہا ہو بولا جا سکتا ہے لیکن عرب لوگ اللہ کا لفظ کبھی بھی خدا کے سوا کسی اور معبود کیلئے استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگر اللہ الالٰہ سے بنا ہے تو وہ بتوں پر اس لفظ کو کیوں نہ استعمال کرتے۔ دوسرے قرآن کریم میں اس لفظ کو ہمیشہ اسم ذات کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور صفات کو اسکی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اسے قرآن کریم اسم ذات قرار دیتا ہے نہ کہ اسم صفت

(۳) عربی کا قاعدہ ہے۔ کہ جس لفظ کے شروع میں ال تعریف کا ہو اگر اسکو پکارا جائے تو اسکے پہلے حرف ندا کے بعد ایّھا کا لفظ بڑھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کو پکارتے ہوئے یا ایھا اللہ نہیں کہتے بلکہ یا اللہ کہتے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے لفظ میں ال تعریف کا نہیں ہے بلکہ خود لفظ کا حصہ ہے +

اللہ کیا ہے؟ نام معلوم کرنیکے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذات جس کا نام اللہ ہے وہ کیا ہے؟ گویا اب ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ یا ہو وا کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اسکا نام ہمیں معلوم ہو گیا ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ ہے کیا؟۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق اہل یورپ کا خیال سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ان اہل یورپ کے خیالات کو بیان کرتا ہوں جو خدا تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں۔

ایک خیال یہ ہے کہ خدا ہے تو سہی لیکن اسنے دنیا کو پیدا کر کے چھوڑ دیا ہے۔ اب اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ ہم اس قسم کا کوئی نمونہ نہیں دیکھتے کہ خدا اب بھی کچھ پیدا کرتا ہو۔ اسلئے معلوم ہوا کہ اب کچھ کرنے سے وہ معطل ہو گیا ہے اور اسلئے مخلوق کا عملاً اب اس سے

کوئی تعلق نہیں ہے +

دوسرا خیال یہ ہے کہ دنیا کے انتظام کے لحاظ سے تو خدا بیشک معطل ہی ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو اخلاقی ہدایت کی ذریعہ سے ظاہر کرتا رہتا ہے یعنی لوگوں کے دلوں پر نیک خیال ڈالتا رہتا ہے +

ان لوگوں کی یہ بھی بڑی مہربانی ہے۔ کہ اتنا وجود تو خدا تعالےٰ کا تسلیم کرتے ہیں۔

آئندہ کے متعلق ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ چونکہ اسنے انسان کو پیدا کیا ہے اور دنیا میں بھیجا ہے اسلئے اگر اسکے احکام کی تعمیل نہ کیجائیگی۔ تو سزا دیگا۔ بعض کہتے ہیں۔ خدا کا سزا سے کیا تعلق۔ کیا ہماری یہ مہربانی کم ہے کہ ہم مانتے ہیں۔ کہ اسنے ہمیں پیدا کیا۔ اگر ہم اس کے دس بیس احکام نہیں مانتے تو سزا کیسی؟ اسلئے وہ کہتے ہیں کہ ہم اسکے جو احکام مانتے ہیں انکا انعام دیگا۔ اور جو نہیں مانتے۔ ان کی سزا نہیں دیگا۔ یورپ کے ایک فلاسفر ہسل نے صرف انعام دینے والے اصل پر بڑا زور دیا ہے۔ بعض لوگوں نے اسکے سزا کی نفی پر بہت ہی زور دینے کی یہ وجہ لکھی ہے کہ اسکے اعصاب بہت تیز تھے اور وہ درد بہت زیادہ محسوس کرتا تھا۔ اسلئے اس کی طبیعت اس امر کو مان ہی نہیں سکتی تھی کہ خدا عذاب بھی دے سکتا ہے۔ پس اسنے بدی کی سزا کا تو انکار کر دیا اور نیکی کے انعام کو قائم رکھا +

مسیحیوں کا خدا کے متعلق خیال

اب میں مختلف مذاہب کے پیش کردہ خیالات کو ایک ایک کر کے لیتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ وہ خدا تعالےٰ کے متعلق کیا تعلیم دیتے ہیں اور اس بارے میں ان کی تعلیم کہاںتک درست یا غلط ہے۔ چونکہ اسوقت مسیحیت کا غلبہ ہے پہلے میں اسی مذہب کے خیالات کو بیان کرتا ہوں۔ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ ایک خدا کی تین شاخیں ہیں (۱) خدا باپ (۲) خدا بیٹا (۳) خدا روح القدس۔ اور پھر یہ تینوں ملکر ایک بھی ہیں۔ پھر صفات کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ خدا کی خاص صفات میں سے ایک صفت عدل کی ہے۔ اور وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر وہ عادل نہ ہو تو ظالم قرار پائیگا۔ لیکن ظالم ہونا خدا کے لئے محال ہے پس اسکے عدل میں کسی صورت میں فرق نہیں آسکتا۔ اب چونکہ دنیا میں عموماً اور مسیحی دنیا میں خصوصاً گناہوں کا سلسلہ نظر آتا ہے جسے دیکھتے ہوئے نجات بالکل ناممکن نظر آتی ہے کیونکہ

اپنے عمل سے انسان نجات نہیں پاسکتا اور خدا کا عدل چاہتا ہے کہ گناہ کی سزا دے پس نجات کی صورت وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ خدا نے جب دیکھا کہ میرا عدل بنی نوع انسان کی نجات کی راہ میں روک ہے تو اسنے اپنے اکلوتے بیٹے کو انسان کی شکل میں دنیا میں بھیجا تاکہ وہ لوگوں کے گناہ اٹھائے چنانچہ حضرت مسیح خدا کے بیٹے ہی تھے جو انسانی شکل میں ظاہر ہوئے اور باوجود بے گنہ ہونیکے بنی نوع انسان کے گناہ اٹھاکر صلیب پر لٹکائے گئے۔ اب جو کوئی ان کے اسطرح کفارہ ہونے پر ایمان لائے وہ نجات پا جائیگا کیونکہ مسیح اسکا کفارہ ہو گئے ہیں اور اب بغیر اسکے کہ خدا کے عدل میں فرق آئے وہ لوگوں کو نجات دے سکتا ہے۔

عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق خدا پر اعتراض

مگر اس عقیدہ کے مطابق خدا پر کئی الزام عائد ہوتے ہیں۔ گو زبان سے خدا کو رحیم رحیم کہیں۔ لیکن اگر اسکے متعلق یہ مانیں جو عیسائی کہتے ہیں۔ تو اسکے یہ معنی ہوئے۔ کہ گناہ کرنیکے بعد خواہ کوئی کتنی التجائیں کرے۔ ناک رگڑے۔ خدا اس کی درخواست کو رد کر دیگا۔ کیونکہ وہ اسکا گناہ معاف نہیں کرسکتا۔ اب اگر خدا رحیم ہے اور ہم سے زیادہ رحیم۔ تو جب ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی ہمارا قصور کرکے ہم سے رحم کی التجا کرتا ہے۔ تو ہم اسے معاف کر دیتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ خدا معاف نہیں کرتا۔ یہ کہنا کہ اس سے اسکے عدل میں فرق آتا ہے بالکل باطل ہے۔ کیونکہ جب ہم کسی کو معاف کر دیتے ہیں تو کیا ہماری نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ہم عادل نہیں ہیں۔ اگر باوجود رحم کے ہم عادل کے عادل ہی رہتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ خدا تعالےٰ اگر رحم کرے تو وہ عادل نہیں رہتا۔ مسیحیت کو سب سے زیادہ اس بات پر ناز ہے کہ اس میں خدا کو باپ قرار دیا گیا ہے۔ کیا باپ اپنے بچوں سے ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ جو مسیحی کہتے ہیں کہ خدا بنی نوع انسان سے کرتا ہے کہ خواہ وہ کس قدر بھی توبہ کیوں نہ کریں وہ ان کے قصور معاف نہیں کرتا۔ مسیحی یہ نہیں کہہ سکتے کہ دنیوی باپ بوجہ کم علمی اور جہالت کے ایسا کرتے ہیں ورنہ اگر وہ عدل کو مدنظر رکھیں تو اپنے بچوں کا قصور بغیر کفارہ کے معاف نہ کریں۔ کیونکہ خود مسیح علیہ السلام نے انجیل میں خدا کو باپ کی تمثیل دیکر اسکے انسانوں سے سلوک کی مندرجہ ذیل حکایت کے ذریعہ سے کیفیت بیان کی ہے۔

"کسی شخص کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے چھوٹے نے باپ سے کہا کہ اے باپ مال کا جو

حصہ مجھکو پہنچتا ہے۔ مجھے دی۔ اسنے اپنا مال متاع انہیں بانٹ دیا۔ اور بہت دن نہ گذرے
کہ چھوٹا بیٹا اپنا سب کچھ جمع کر کے دور دراز ملک کو روانہ ہوا اور وہاں اپنا مال بدچلنی میں
اُڑا دیا۔ اور جب سب خرچ کر چکا تو اس ملک میں سخت کال پڑا۔ اور وہ محتاج ہونے لگا پھر
اس ملک کے ایک باشندے کے ہاں جا پڑا۔ اس نے اسکو اپنے کھیتوں میں سؤر چرانے بھیجا۔ اور
اسے آرزو تھی۔ کہ جو پھلیاں سؤر کھاتے تھے۔ انہیں سے اپنا پیٹ بھرے۔ مگر کوئی اسے
نہ دیتا تھا۔ پھر اس نے ہوش میں آکر کہا۔ کہ میرے باپ کے کتنے ہی مزدوروں کو روٹی افراط سے
ملتی ہے۔ اور میں یہاں بھوکا مر رہا ہوں۔ میں اُٹھکر اپنے باپ کے پاس جاؤنگا۔ اور اس سے
کہونگا۔ کہ اے باپ میں آسمان کا اور تیری نظر میں گنہگار ہوا۔ اب اس لائق نہیں رہا کہ پھر تیرا
بیٹا کہلاؤں۔ مجھے اپنے مزدوروں جیسا کر لے۔ پس وہ اُٹھکر اپنے باپ کے پاس چلا۔ وہ ابھی
دور ہی تھا۔ کہ اسے دیکھکر اسکے باپ کو ترس آیا اور دوڑکر اسکو گلے لگا لیا اور بوسے لئے۔ بیٹے
نے اس سے کہا کہ اے باپ میں آسمان کا اور تیری نظر میں گنہگار ہوا۔ اب اس لائق نہیں رہا کہ پھر
تیرا بیٹا کہلاؤں۔ باپ نے اپنے نوکروں سے کہا کہ اچھے سے اچھا جامہ جلد نکال کر اسے پہناؤ۔ اور
اسکے ہاتھ میں انگوٹھی اور پاؤں میں جوتی پہناؤ۔ اور پلے ہوئے بچھڑے کو لاکر ذبح کرو۔ تاکہ ہم
کھاکر خوشی منائیں۔ کیونکہ میرا یہ بیٹا مردہ تھا۔ اب زندہ ہوا۔ کھویا ہوا تھا اب ملا ہے۔ پس
وہ خوشی منانے لگے۔ لیکن اسکا بڑا بیٹا کھیت میں تھا۔ جب وہ آکر گھر کے نزدیک پہنچا تو گانے
بجانے اور ناچنے کی آواز سنی اور ایک نوکر کو بلاکر دریافت کرنے لگا۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے
اس سے کہا تیرا بھائی آگیا ہے۔ اور تیرے باپ نے پلا ہوا بچھڑا ذبح کر دیا ہے۔ اسلئے کہ اسے
بھلا چنگا پایا۔ وہ غصّے ہوا اور اندر جانا نہ چاہا۔ مگر اس کا باپ باہر جا کے اسے منانے لگا۔
اس نے اپنے باپ سے جواب میں کہا۔ کہ دیکھ اتنے برس سے میں تیری خدمت کرتا ہوں۔ اور کبھی تیری
حکم عدولی نہیں کی۔ مگر مجھے تو نے کبھی ایک بکری کا بچہ بھی نہ دیا۔ کہ اپنے دوستوں کے ساتھ
خوشی مناتا۔ لیکن جب تیرا یہ بیٹا آیا۔ جس نے تیرا مال متاع کسبیوں میں اُڑا دیا۔ تو اسکے لئے تو نے
پلا ہوا بچھڑا ذبح کرایا۔ اس نے اس سے کہا بیٹا تو تو ہمیشہ میرے پاس ہے اور جو کچھ میرا ہے وہ تیرا ہی ہے
لیکن خوشی منانی اور شادمان ہونا مناسب تھا۔ کیونکہ تیرا یہ بھائی مردہ تھا۔ اب زندہ ہوا۔

کھویا ہوا اتھا اب ملا ہے" لوقا باب ۱۵۔

اس تمثیل سے حضرت مسیح نے یہ بتایا ہے کہ خدا کو بھی بندہ سے ایسا ہی پیار اور محبت ہے اور جو بندہ گناہ کر کے پچھتاتا ہوا خدا کے پاس آتا ہے خدا اسپر اسی طرح رحم کرتا ہے جس طرح باپ اپنے بیٹے پر۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ حضرت مسیحؑ تو خدا تعالےٰ کے بندوں سے تعلق کو اوپر کی تمثیل سے واضح کر کے اسے بہترین عفو کرنیوالا قرار دیتے ہیں۔ مگر مسیحی اسے ایسا ظالم قرار دیتے ہیں کہ خواہ کوئی کتنی ہی التجا کرے وہ اسے معاف ہی نہیں کرتا۔ کیا اس باپ نے جس کی حضرت مسیح نے تمثیل دی ہے اپنے آنے والے بیٹے کو پہلے مارا اور پھر معاف کیا تھا۔ یا اسکی ندامت کو قبول کر کے بغیر کسی سزا کے معاف کر دیا تھا۔ اور اسکے آنے پر خوش ہوا تھا۔ اگر اسکے آنے پر باپ نے کہا ہوتا کہ پیٹھ ننگی کرتا کہ پہلے میں تمہیں سزا دے لوں۔ اور پھر چھوڑ دونگا۔ یا یہ کہ پہلے بڑے بیٹے کو بلا کر کفارہ کے طور پر کوڑے ملے ہوتے پھر چھوٹے کو معاف کیا ہوتا۔ تب تو کہہ سکتے تھے۔ کہ کفارہ کا خیال درست ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ حضرت مسیح نے اس تمثیل کے ذریعہ سے درحقیقت کفارہ کے مسئلہ کو جڑ سے اکھیڑ دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کو الہام کے ذریعہ سے پتہ لگ گیا تھا۔ کہ ان کے ماننے والے اس قسم کا عقیدہ بنا لینگے۔ اسلیئے اُنہوں نے اس تمثیل کے ذریعہ سے اس زہر کا ازالہ کر دیا +

مسیحیوں کا خدا تعالےٰ کے متعلق جو عقیدہ ہے اس میں یہ بھی نقص ہے کہ وہ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے اور دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ موت کا شکار ہوئے اور بعض کے نزدیک وہ لوگوں کے گناہوں کے سبب سے تین دن تک جہنم میں بھی رہے اور سزا پاتے رہے گویا خدا نعوذ باللہ جہنم کی سزا تین دن تک بھگتتا رہا اور یہ عقیدہ ایسا ہے کہ اسکا نقص خود ہی ظاہر ہے۔ اسپر کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں +

زرتشتیوں کا خدا کے متعلق خیال

مسیحیوں کے بعد میں زردشتیوں کے عقائد کو لیتا ہوں۔ ان لوگوں کا خدا تعالےٰ کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اس سے صرف نور آتا ہے تکلیف اور دکھ خدا تعالےٰ کی طرف سے نہیں آسکتا۔ اور اسلیئے وہ خدا کے مقابلہ میں ایک اور طاقت بھی مانتے ہیں جس سے ظلمت اور گناہ اور دکھ پیدا ہوتا ہے۔ اور دنیا میں جس قدر تغیرات ہوتے ہیں انکے نزدیک

وہ سب انہی دو بالاہستیوں کی جنگوں کے نتیجہ میں ہوتے ہیں۔ کبھی ایک غالب آجاتا ہے کبھی دوسرا لیکن آخری زمانہ کی نسبت ان کا خیال ہے کہ اس میں نیکی کی طاقت بدی کی طاقت پر غالب آجائیگی اور شیطان جسے وہ اہرمن کہتے ہیں اسکا سر کچلا جائیگا +

اس عقیدہ پر اعتراض اس عقیدہ پر بھی بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اسطرح شیطان خدا کی ذات میں شریک ہوا۔ اور بجائے ایک خدا کے دو خدا ہوئے جس عقیدہ کو زردشتی خود بھی ناپسند کرتے ہیں۔ اسپر انکے بعض محقق کہتے ہیں کہ اصل میں خدا ایک ہی بالاہستی ہے اسنے دو طاقتیں ایک نیکی کی اور دوسری بدی کی پیدا کی ہیں مگر اس عقیدہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہ بات ہے، تو پھر ظلمت خدا ہی کیطرف منسوب ہوئی۔ کیونکہ اگر خدا نے شیطان کو پیدا کر کے پھر اس سے ظلمتیں پیدا کرائیں۔ تو گویا خدا نے خود ہی ظلمتیں پیدا کیں +

دوسرا نقص اس عقیدہ میں یہ ہے کہ جن چیزوں کو نقصان رساں سمجھکر شیطان کی مخلوق قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے بھی فوائد معلوم ہو رہے ہیں۔ اور وہ بھی مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ اندھیرے کو ہی لے لو۔ اب اگر اندھیرا نہ ہوتا تو صحت افزا نیند نہ ہوتی۔ کیونکہ طب سے ثابت ہوتا ہے کہ اندھیرے کی نیند روشنی کی نیند سے اعلیٰ ہوتی ہے۔ اور زیادہ مفید ہوتی ہے۔ کئی ترکاریاں اور سبزیاں اندھیرے میں نشو و نما پاتی ہیں، ہر وقت کی روشنی سے آنکھوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں تو اگر یہ درست ہے کہ اندھیرے کا پیدا کرنے والا شیطان ہے تو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ خدا نے دنیا کو نامکمل پیدا کیا تھا شیطان کی مہربانی سے وہ مکمل ہوئی +

ہندوؤں کا خدا کے متعلق خیال دنیا کا تیسرا بڑا مذہب ہندو ہے۔ ان کے عقائد میں بھی خدا تعالیٰ کے متعلق بعض ایسی تعلیمیں ہیں جو خدا تعالیٰ کو ناقص ثابت کرتی ہیں یا یہ کہ وہ تعلیمیں عقل کے خلاف ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا دنیا میں اوتار لیتا ہے اور مخلوق کا جنم لیتا ہے۔ اور یہ عقیدہ ان میں ایسی بُری صورت میں پیش کیا جاتا ہے کہ یہاں تک بھی کہدیتے ہیں کہ خدا نے جانور وغیرہ سے سؤر اور مگرمچھ کا بھی جنم لیا ہے۔ اگر یہ لوگ غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ خدا کے جنم لینے کے یہ معنی ہیں کہ وہ محدود ہے۔ پھر مگرمچھ اور سؤر کی شکل میں اس کا ظاہر ہونا تو اور بھی حقارت پیدا کرنیوالا ہے اور اس عقیدہ سے بجائے خدا تعالیٰ کی عظمت ثابت ہونیکے اسکی

ہتک ہوتی ہے +

اسی طرح ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور بہت سے دیوتا ہیں جنکو کارخانۂ عالم کے چلانے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ چنانچہ تین تو بڑے بڑے مظاہر تسلیم کئے جاتے ہیں جنمیں سے ایک تو پیدا کرنیوالا ہے جسے برہما کہتے ہیں اور ایک رزق دینے والا جسے شو کہتے ہیں اور ایک مارنے والا جسے وِشنو کہتے ہیں۔ اس عقیدہ کی وجہ سے انمیں سے اکثر لوگ وشنو اور شو کی تو پوجا کرتے ہیں مگر برہما کی کوئی پوجا نہیں کرتا کیونکہ خیال کرتے ہیں کہ اسنے تو جو کچھ کرنا تھا کر چکا اب آئندہ تو رزق دینے والے اور مارنے والے سے ہی کام پڑنا ہے اسلئے انہی کی پوجا کرنی چاہیئے۔ اسکے متعلق ایک لطیفہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کوئی راجہ تھا اسکے ہاں لڑکا نہوتا تھا۔ وہ برہما کی پرستش کرتا رہا جس کے نتیجہ میں لڑکا پیدا ہوگیا۔ پھر اسنے اسکو چھوڑ دیا کہ اب اسکی کیا ضرورت ہے۔ اب مارنے والے کی پرستش کرنی چاہیئے۔ تاکہ بیٹا زندہ رہے۔ اس نے اسی طرح کیا۔ لیکن جب وہ لڑکا جوان ہوا۔ تو اسنے کہا جس نے مجھپر یہ احسان کیا ہے کہ مجھے پیدا کیا۔ اسکی پرستش کرنی چاہیئے اور وہ برہما کی پرستش میں لگ گیا اسپر باپ اس سے ناراض ہوگیا۔ اور اس کا غصہ بڑھتے بڑھتے اس قدر تیز ہوگیا کہ اسنے مارنے والے پرمیشور سے کہا۔ کہ میرے لڑکے کو مار دے چنانچہ وشنو نے اس لڑکے کو مار دیا مگر برہما نے کہا کہ اس لڑکے نے میری خاطر جان دی ہے اسلئے اسکو پھر پیدا کر دینا چاہیئے۔ اسنے اسے پھر پیدا کر دیا اور اسیطرح یہ جنگ جاری رہی۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس جنگ کا خاتمہ کس طرح ہوا اور صلح کس طرح سے ہوئی +

آریوں کا خدا کے متعلق خیال

آریہ لوگ گو ہندوؤں ہی سے نکلے ہیں لیکن چونکہ انہوں نے اپنی عقائد میں بہت کچھ فرق کر لیا ہے اسلئے میں انکا الگ ذکر کرتا ہوں۔ ان لوگوں کے عقیدہ میں بھی بہت کچھ کمزوریاں ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے دنیا کو پیدا نہیں کیا بلکہ دنیا کے ذرات اور ارواح خود بخود ہیں خدا نے صرف جوڑ دیا ہے اور سب صفات اقتداری کے وہ منکر ہیں۔ انکے نزدیک خدا نہ رازق ہے نہ خالق نہ حفیظ۔ اور جو صورت وہ خدا کی پیش کرتے ہیں اگر اسے تسلیم کر لیا جاگے تو ماننا پڑتا ہے کہ اگر خدا مر بھی جائے تو بھی دنیا کا کوئی چنداں حرج نہیں خدا رہے یا نہ رہے ہم ضرور رہینگے۔ یہ خیال بھی ایسا ہے کہ اسے عقل انسانی تسلیم

نہیں کر سکتی *

اسلام خدا کی متعلق کیا کہتا ہے؟

ان سب مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کیا کہتا ہے؟ چونکہ اس سوال پر روشنی ڈالنا میرا مقصود ہے اسلئے اسکے متعلق میں تفصیل سے بیان کرونگا

سب سے پہلے میں اسلام کی تعلیم خدا کے متعلق خلاصۃً بیان کرتا ہوں۔ اسلام کہتا ہے کہ ایک بالا ہستی جامع جمیع صفات موجود ہے وہ قائم بالذات ہے۔ اپنے وجود میں کامل ہے۔ دوسروں کا محتاج نہیں۔ محدود نہیں جس طرح آسمان پر ہے۔ اسی طرح زمین پر ہے۔ جگہ اسے بند نہیں کر سکتی جہات اسپر تصرف نہیں رکھتیں۔ زمانہ اسپر حکومت نہیں کر سکتا۔ وہ باوجود دور ہونیکے نزدیک ہے اور باوجود نزدیک ہونیکے دور ہے۔ اسے کسی نے نہیں بنایا مگر جو کچھ بھی موجود ہے اسکا بنایا ہوا ہے۔ وہ سب سے بالا ہے اور سب کچھ اسکے قبضہ و تصرف میں ہے۔ اسکی مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا وہ بادشاہ ہے وہ مالک ہے وہ ہدایت دینے والا ہے۔ حفاظت کرنیوالا ہے اور عزت و ذلت اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے اور ہر اک بات کو جانتا ہے مگر وہ سننے اور دیکھنے اور جاننے کیلئے ہماری طرح آلات کا محتاج نہیں۔ جو کچھ دنیا میں نظر آتا ہے۔ سب اسی کی صفات کا ظہور ہے۔ وہ ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ اسنے دنیا کو خاص مقصد کیلئے پیدا کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دنیا اس مقصد کو پورا کرے۔ اس میں اسکا کوئی فائدہ نہیں بلکہ خود دنیا کا فائدہ اور اسکی ترقی ہے *

کیا خدا کی کوئی صورت شکل ہے؟

خدا تعالےٰ کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی کوئی صورت شکل بھی ہے اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے کہ اسکی کوئی صورت شکل نہیں۔ صورت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ایک جسم ہے جو مختلف حصے رکھتا ہے اور ہر ایک حصہ کی ایک حد بندی ہے مگر خدا سب حد بندیوں اور سب تقسیموں سے پاک ہے اسلئے اس کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی صورت صرف مادی اشیاء کیلئے ہوتی ہے بلکہ انمیں سے بھی کثیف مادی اشیاء کی خدا کوئی جسم نہیں رکھتا بلکہ جسموں اور مادے کا خالق ہے *

حدیث میں خدا کی صورت بنانے کا کیا مطلب ہے؟

اس بیان پر سوال ہو سکتا ہے۔ کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی صورت ہے۔ ان احادیث کا کیا مطلب ہے؟ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے۔ کہ ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر نکلے

اور آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے غلام کو مار رہا ہے۔ اسپر آپ نے فرمایا ان اللہ خلق اٰدم علیٰ صورتہٖ کہ آدم کو خدا نے اپنی صورت پر بنایا پس چاہیئے کہ اسکی صورت کا ادب اور احترام کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی صورت ہے ورنہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں فرماتے کہ آدم کو خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے تم اسکی صورت کا ادب اور احترام کرو۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے دو معنے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ صورت کے معنے عربی میں وصف اور صفت کے بھی آتے ہیں۔ اسلئے ان اللہ خلق اٰدم علیٰ صورتہٖ کے یہ معنی ہوئے کہ خدا نے آدم کو اپنی صفات پر پیدا کیا ہے۔ جیسے فرمایا علم اٰدم الاسماء کلھا یعنی خدا نے اپنی وہ ساری صفات جو بندوں سے تعلق رکھتی ہیں آدم کو سکھائیں۔ یعنی انسان کو خدا نے ایسا دماغ دیا۔ کہ جو اسکی صفات کو جلوہ گر کر سکے وہ شخص چونکہ اپنے غلام کے منہ پر مار رہا تھا۔ اور ممکن تھا کہ اس سے دماغ کو صدمہ پہنچے۔ اسلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا کہ اس طرح نہ مارو اور جس سے وہ غرض جس کیلئے انسان بنایا گیا ہے وہ باطل ہو جائیگی۔ چنانچہ دوسری حدیثوں سے بھی پتہ لگتا ہے کہ رسول کریم نے فرمایا منہ پر نہیں مارنا چاہئے۔ وجہ یہ کہ دماغ مرکز ہے ساری صفات کا اور اسکو صدمہ پہنچنے سے صفات کا ظہور رک جاتا ہے۔ اسلئے رسول کریم نے فرمایا۔ خدا کی صفات کا ادب کرو۔ خدا نے انسان کا دماغ اسلئے پیدا کیا ہے کہ اسکی صفات اخذ کرے۔ مگر تم منہ پر مارتے ہو جس سے خطرہ ہوتا ہے کہ دماغ کو جو اسکے بالکل قریب ہے صدمہ پہنچ جائے اور انسان کی عقل کو نقصان پہنچ جائے۔ جس سے وہ اپنی پیدائش کی غرض کو پورا کرنے سے ہی محروم ہو جائے۔

اس حدیث کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ علیٰ صورتہٖ سے مراد علیٰ صورۃ الانسان ہو۔ یعنی آدم اسکے مناسب حال شکل پر پیدا کیا۔ اس صورت میں اس حدیث کا یہ مطلب ہو گا کہ چونکہ وہ زور سے مار رہا تھا اسلئے ممکن تھا کہ غلام کا کوئی عضو ٹوٹ جاتا۔ اس پر رسول کریم نے فرمایا۔ خدا نے تو اسکو اسکے مناسب حال شکل دی تھی۔ کیا اب تم اس کو درست کرنے لگے ہو؟ گویا تعریضاً فرمایا کہ اس طرح مار کر ایک کس آدمی کی شکل بگاڑ دینے کے یہ معنی ہونگے کہ خدا تعالیٰ سے تو اس کی شکل کے بنانے میں غلطی ہو گئی تھی اب تم اس غلطی کی اصلاح کرنے لگے ہو؟

اس صورت میں یہ زجر کا کلام ہے اور اسکے ہرگز یہ معنی نہیں کہ خدا کی کوئی صورت اور شکل ہے جس پر اسنے انسان کو پیدا کیا ہے +

کیا خدا کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے؟

اب شاید کسی کے دل میں یہ خیال گذرے کہ جب وہ ایسی وراء الوراء ہستی ہے کہ جس کا کوئی پتہ ہی نہیں لگ سکتا تو پھر ہم اسے کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اور کیونکر اسکے وجود کو ذہن میں لا سکتے اور اس کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی ذات اور حقیقت کو کوئی نہیں پا سکتا۔ کیونکہ جس چیز کی حقیقت کو کوئی پا لیتا ہے۔ اسکو بنا بھی لیتا ہے۔ اور ہمارا خدا کی حقیقت کو پا لینے کا یہ مطلب ہو گا کہ ہم اسے بنا بھی سکتے ہیں۔ مثلاً گھڑی ہے۔ اسکے متعلق اگر کامل علم ہو اسکے پرزوں کی ساخت کا بھی اور ان کی ترکیب کا بھی اور اس سامان کا بھی جس سے وہ بنتی ہے اور جس طرح وہ بنتی ہے تو پھر اس کا بنانا بھی ہمارے لئے بالکل ممکن ہو گا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی حقیقت کو سمجھ لینے اور پا لینے کا یہ مطلب ہو گا کہ ہم ایک ویسا ہی خدا بنا بھی سکیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کو سمجھنا تو الگ رہا ہم اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اور اس بات کو بچے بھی جانتے ہیں۔ چنانچہ بچے ایک کھیل کھیلا کرتے ہیں۔ جسمیں ایک دوسرے کو کہتا ہے کہ مجھکو پکڑو جب دوسرا اسکے کسی عضو کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ تمنے مجھے تو نہیں پکڑا میرے ہاتھ کو پکڑا ہے یا پاؤں کو پکڑا ہے یا سر کو۔ اس کھیل کا بھی درحقیقت یہی مطلب ہے کہ انسان کی حقیقت بھی پوشیدہ ہے صرف چند آثار ظاہر ہیں۔ سارے فلاسفر اس بات کی تعیین کرتے کرتے مر گئے۔ کہ میں کیا چیز ہے؟ مگر وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ پس جب انسان اپنے آپ کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ تو خدا کا پتہ کیا لگائینگے؟ حدیث میں آتا ہے کلکم فی ذات اللہ حمقیٰ۔ کہ خدا کی ذات کے متعلق تم سارے بالکل حیران و پریشان ہو اس کی ذات تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی +

سب حقیقتیں مخفی ہوتی ہیں

انسان کے اس شک کو دور کرنے کیلئے کہ اگر میں خدا کو نہیں سمجھ سکتا اور اس کی حقیقت معلوم نہیں کر سکتا تو اسکے ماننے کا کیا فائدہ؟ خدا تعالےٰ نے ساری ہی حقیقتوں کو مخفی کر دیا ہے چھوٹی سے چھوٹی چیز کی حقیقت کو بھی ہم نہیں معلوم کر سکتے۔ ایک میز کو لیلو ہم اس کی چوڑائی لمبائی اور رنگ دیکھتے ہیں۔ مگر کیا

لمبائی چوڑائی اور رنگ کو میز کہتے ہیں؟ ہم ان چیزوں کو دیکھکر ایک عرفان ایک وقوف اپنے ذہن میں پاتے ہیں اور وہ میز ہوتی ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص دوسرے کو اپنا بیٹا کہتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ کیا اسلئے کہ وہ اتنا اونچا اور اس رنگ کا ہے۔ نہیں بلکہ اس کیفیت کی وجہ سے جو اسکے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ غرض اللہ تعالےٰ نے اس شبہ کو دور کرنے کیلئے کہ اگر خدا کی ذات مخفی ہی رہتی ہے۔ تو کیا پتہ لگ سکتا ہے کہ وہ ہے۔ اور کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ سب چیزوں کی حقیقت کو مخفی کر دیا ہے +

خدا کی ہستی کا پتہ کس طرح لگتا ہے؟

اب سوال ہوگا کہ پھر اس وراءالوریٰ ہستی کا پتہ کس طرح لگے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ مینے کل بتایا تھا اس کا پتہ الہام سے لگتا ہے خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔ تم خدا تک نہیں پہنچ سکتے مگر اس پر گھبراؤ نہیں۔ ہم خود تمہارے پاس آئینگے۔ ایک بزرگ کا واقع لکھا ہے کہ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے پاس بادشاہ کا پروانہ آیا کہ جلدی آکر ہمیں فلاں جگہ پر ملو اسپر ان کے دوست گھبرائے کہ کیا سبب ہے کہ بادشاہ نے اس طرح انہیں بلوایا ہے اور انہوں نے چاہا کہ وہ ابھی ٹھہریں پہلے وہ پتہ لیلیں کہ کیا بات ہے۔ مگر وہ چل پڑے۔ شام کے قریب سخت بارش آئی اور اندھیرا ہو گیا اور وہ ایک جھونپڑی میں جو جنگل میں تھی پتہ لینے پر مجبور ہوئے وہاں جاکر اُنہوں نے صاحب مکان سے رات بسر کرنے کی اجازت طلب کی۔ جو شخص اندر تھا اسنے کہا آجاؤ۔ وہ اندر گئے۔ تو دیکھا کہ ایک اپاہج لیٹا ہے۔ جب اسکو انہوں نے اپنا پتہ بتایا کہ میں فلاں ہوں۔ تو وہ رو پڑا۔ کہ میں مدت سے دعا کر رہا تھا کہ خدا مجھے آپکی زیارت کرائے معلوم ہوتا ہے خدا تعالےٰ آپکو میرے لئے ہی لایا ہے۔ وہ رات بھر وہاں رہے۔ صبح دوسرا ہرکارہ آگیا کہ آپکو اب آنے کی ضرورت نہیں رہی واپس چلے جائیں اس سے ان کو اور بھی یقین ہو گیا کہ یہ ایک الٰہی تدبیر تھی +

جس طرح وہ اپاہج جو چلنے پھرنے سے مجبور تھا اس بزرگ تک پہنچ گیا تھا۔ اسی طرح ہم جو خدا تعالےٰ تک پہنچنے کے معاملہ میں اپاہجوں سے بھی بدتر ہیں خدا تک پہنچ سکتے ہیں یعنی خود ہم تک آئے اور اپنے وجود کو ہم پر ظاہر فرمائے اور وہ ایسا ہی کرتا ہے اور اپنی ملاقات کے پیاسوں کو

خود آکر اپنے مشربت دیدار سے سیراب کرتا ہے +

خدا کی معرفت کس طرح حاصل ہوتی ہے؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا علم تو ہمیں الہام کے ذریعہ سے ہو جائیگا لیکن اس کی معرفت ہمیں کس ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خالی علم اس تعلق کیلئے کافی نہیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان ہونا چاہئے اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی معرفت کامل حاصل کرنیکے تین طریق ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس چیز کو پکڑ کر سامنے کر دیا جائے، اور دوسرا آدمی اسے خوب اچھی طرح ٹٹول ٹٹال کر دیکھ لے اور اس کی پوری معرفت پیدا کر لے۔ مثلاً ایک شخص کا نام سیف اللہ ہو جس نے اسکو نہ دیکھا ہو۔ وہ اگر اس کی معرفت حاصل کرنا چاہے تو سیف اللہ کو پکڑ کر اسکے سامنے کر دینگے۔ کہ وہ یہ شخص ہے۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ اس چیز کی بناوٹ کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں میز اور کرسی کا اگر رواج نہ ہو اور اسی ملک کے لوگ بر سبیل تذکرہ میز و کرسی کا نام سنیں تو ان کو واقف کرنے کیلئے یہ ذریعہ اختیار کیا جائیگا کہ میز اور کرسی کی شکل اور بناوٹ اور ان کا کام تفصیل سے ان کو بتا دیا جائیگا اور اس سے ایک اندازہ ان کے ذہنوں میں میز اور کرسی کی نسبت پیدا ہو جائیگا تیسرا طریق یہ ہے جو ان چیزوں کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے جو مرئی نہیں ہیں یہ ہے کہ انکی صفات کے ذریعہ سے ان کی معرفت کرائی جاتی ہے۔ مثلاً نور ہے یہ ایسی چیز نہیں کہ اس کی بناوٹ بیان کر سکیں۔ اسلئے ایک اندھے کے سامنے اس کی صفات ہی بیان کیجائینگی۔ اسکے ذریعہ سے آنکھ بغیر ٹٹولنے کے معلوم کر لیتی ہے کہ کسی چیز کی لمبائی کیا ہے چوڑائی کیا ہے اور اونچائی کیا ہے رنگ کی کیفیت اندھا سمجھ نہیں سکتا) اس بیان سے اندھا کچھ نہ کچھ اندازہ کر لیگا۔ اسی طرح اور کئی چیزیں ہیں کہ جن کی صفات بیان کرنے سے ان کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شناخت بھی اسی طریق سے ہوتی ہے۔ وہ صفات ہی کے ذریعہ سے انسان کے سامنے آتا ہے۔ اور صفات ہی کے ذریعہ سے انسان اسے پہچان سکتا ہے +

کیا خدا ایک ہی ہے یا ایک سے زیادہ خدا ہیں؟

جب سے تاریخ عالم کا پتہ چلتا ہے یہ سوال بنی نوع انسان کے سامنے رہا ہے کہ کیا خدا ایک ہی ہے یا ایک سے زیادہ ہستیاں ہماری اطاعت و فرمانبرداری کی مستحق ہیں؟ اس سوال کا جواب اسلام نے نہایت واضح اور

زوردار الفاظ میں یہ دیا گیا کہ خدا صرف ایک ہے۔ اور کوئی ہستی اس کی شریک نہیں۔ بلکہ عقلاً بھی ایسی ہستی ایک ہی ہو سکتی ہے۔ دو نہیں ہو سکتیں، یہ بالکل ناممکن ہے۔ اور ہماری عقل ہی نہیں سمجھ سکتی کہ دو محیط کل ہستیاں ہوں۔ دو کا لفظ ہی حدبندی پر دلالت کرتا ہے اور حدبندی کیساتھ اس غیر محدود قوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو خدا کے خیال کے ساتھ لازم وملزوم ہے۔ پس خدا ایک ہی ہو سکتا ہے دو خدا نہیں ہو سکتے +

شرک کیا چیز ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ غیر مرئی ہے تو اس کا شریک بنانے یا سمجھنے سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی ایک ایسا سوال ہے جو ہمیشہ سے لوگوں کو حیرت و پریشانی میں ڈالتا رہا ہے وہ لوگ جو بڑے زور سے ایک خدا کے قائل ہوتے ہیں بعض دوسرے لوگ ان کی نسبت الزام لگاتے ہیں کہ یہ مشرک ہیں اور اگر ہم ان کی حالت پر غور کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بعض ایسی باتیں ضرور پائی جاتی ہیں جنکو دل اندر سے برا سمجھتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ شرک کا مسئلہ ایسا سیدھا سادہ نہیں ہے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے بلکہ نہایت باریک مسئلہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر قومیں جو بظاہر شرک کی مخالف ہیں عملاً شرک میں مبتلا پائی جاتی ہیں۔ اور اسکا سبب یہی ہے کہ وہ شرک کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شرک کی کوئی ایک تعریف نہیں ہے۔ بلکہ مختلف نقطۂ نگاہ سے اس مرض کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جبتک اسے ایک تعریف کے اندر لانے کی کوشش ہوتی رہے گی اسی وقت تک یہ مسئلہ عقدۂ لاینحل رہیگا میرے نزدیک اسے سمجھنے کیلئے مندرجہ ذیل تقسیم بہت مفید ہو سکتی ہے:-

اول یہ خیال کرنا کہ ایک سے زیادہ ہستیاں ہیں جو یکساں طاقتیں رکھتی ہیں اور سب کی سب دنیا کی حاکم اور سردار ہیں یہ شرک فی الذات ہے +

دوسرے یہ خیال کرنا کہ دنیا کی مدبر ہستیاں ایک سے زیادہ ہیں جنمیں کمالات تقسیم ہیں۔ کسی میں کوئی کمال ہے اور کسی میں کوئی۔ یہ شرک ہے۔ اور یہ بھی درحقیقت شرک فی الذات ہی ہے +

تیسرے وہ اعمال جو مختلف قوموں میں عاجزی اور انکساری کیلئے اختیار کئے گئے ہیں ان میں سے جو حد درجہ انتہائی عاجزی کے اعمال ہیں۔ ان کو خدا کے سوا کسی اور کے لئے کرنا شرک ہے۔ مثلاً سجدہ ہے۔ انتہائی تذلل اور ادب کا ذریعہ یہی ہے کہ سجدہ کیا جائے۔ اس سے بڑھکر

اور کوئی طریق نہیں کیونکہ اسمیں انسان اپنے آپکو گویا خاک میں ملا دیتا ہے۔ اس سے بڑھکر تذلل کا ذریعہ انسانی عقل تجویز ہی نہیں کر سکتی۔ پس یہ عمل صرف خدا کے لئے ہی کرنا چاہیئے۔ اور کسی کیلئے نہیں کرنا چاہیئے۔ تا خدا تعالیٰ میں اور دوسرے وجودوں میں امتیاز قائم رہے۔ اس خصوصیت کی نسبت یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ جس قدر اعمال انکسار اور تذلل کے تھے خدا تعالیٰ نے ان کے متعلق کہا کہ ان میں سے ایک میرے لئے رکھدو۔ اور باقی بیشک اوروں کیلئے استعمال کرو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہی میرے لئے ۔ اور وہی دوسروں کیلئے۔ کیونکہ یہ میری شان کے خلاف ہے۔ میرے لئے ایک عمل کو علیحدہ کردو۔ اگر وہ عمل اوروں کیلئے کروگے تو اسکا یہ مطلب لیا جائیگا کہ تم ان کو بھی میرے برابر قرار دیتے ہو۔ سجدہ کے علاوہ مختلف اقوام میں مختلف حرکات بدن انتہائی تذلل کیلئے سمجھی گئی ہیں جیسے ہاتھ باندھکر کھڑا ہونا۔ رکوع۔ دوزانو ہو کر بیٹھنا۔ ان سب کو خدا تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور عبادت الٰہی کا حصہ بنا دیا ہے۔ پس یہ عمل اب اور کسی کیلئے کرنے جائز نہیں ہیں اور شرک میں داخل ہیں +

شرک کی چوتھی قسم چوتھی قسم شرک کی یہ ہے کہ اسباب ظاہری کے متعلق یہ سمجھے کہ ان سے میری سب ضروریات پوری ہو جائینگی۔ اور اللہ تعالیٰ کے تصرف کا خیال دل سے مٹا دے۔ اور یہ خیال کرے کہ صرف مادی اسباب ہی ضرورت کو پورا کرنے والے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی سمجھے کہ روٹی کھانے سے ضرور پیٹ بھر جائیگا۔ اور خدا تعالیٰ کی قضاء کا اب اس معاملہ میں کوئی بھی دخل نہیں ہے۔ تو یہ شرک ہوگا۔ یا جو کپڑا پہنے اسکے متعلق سمجھے کہ یہ ضرور سردی سے بچا لیگا۔ تو یہ بھی شرک ہوگا۔ یا کوئی سامان مہیا کرے اور سمجھے کہ اسکے ذریعہ ضرور میرا کام ہو جائیگا۔ یہ بھی شرک ہے۔ ہاں اگر یہ خیال کرے کہ ان سامانوں میں خدا نے یہ طاقت رکھی ہے اور اسکے فعل اور ارادے کے ماتحت ان کے نتائج پیدا ہونگے تو یہ شرک نہیں ہوگا۔ پس شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ آخری تصرف جو خدا کو دینا چاہیئے۔ وہ اسباب کو دیدے۔ اس شرک کے اندر بھی یہی حقیقت مخفی ہے کہ انتہائی مقام تصرف کا خدا سے لیکر اور چیزوں کو دیدیا ہے +

شرک کی پانچویں قسم پانچویں قسم شرک کی یہ ہے کہ خدا کی وہ مخصوص صفات جو اس نے بندوں کو نہیں دیں۔ جیسے مردہ کو زندہ کرنا۔ یا کوئی چیز پیدا کرنا۔ یا یہ کہ خدا نے کہا ہے میں ازلی ہوں

اور میرے سوا اور کوئی ازلی نہیں، یا یہ بتایا ہے کہ میں فنا سے محفوظ ہوں جبکہ دوسرے سب فنا کا شکار ہیں ایسے سب امور میں خدا تعالیٰ کی خصوصیت کو مٹا دینا اور ان صفات میں کسی اور کو شریک کر دینا خواہ اس عقیدہ کی بنا پر کہ خدا نے اپنی مرضی اور اپنے اذن کے ساتھ یہ صفات یا انکا کچھ حصہ کسی خاص شخص کو دیدیا ہے، شرک ہے۔ اس شرک میں افسوس ہے کہ اب مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ حالانکہ یہ بہت کھلا اور ظاہر شرک ہے۔ مسلمانوں کا عام طور پر یہ خیال ہے حضرت عیسیٰ ابھی تک زندہ ہیں۔ حالانکہ ہر انسان کیلئے فنا ہے اور فنا سے صرف خدا کی ذات محفوظ ہے اور غیر طبعی زندگی اور وہ بھی ایسی کہ اسمیں نہ کھانا ہے نہ پینا نہ حوائج انسانی کا پورا کرنا درحقیقت ابدیت کا ہی دوسرا نام ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ایک دفعہ تو ضرور ہی ایک انسان کو مار دیتا ہے پھر خواہ ابدی زندگی ہی دیدے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس دنیا میں جنت نہیں بنایا تا کہ لوگوں کو ایسے آدمی دیکھکر جو موت سے محفوظ ہوں خدا تعالیٰ کی ابدیت کی حقیقت میں شبہ نہ پیدا ہو جائے۔

چھٹی قسم شرک کی چھٹی قسم شرک کی یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے اسباب کو بالکل نظر انداز کر دے اور یہ سمجھے کہ کسی شخص یا کسی چیز نے بلا ان اسباب کے استعمال کرنے کے جو خدا تعالیٰ نے کسی خاص کام کیلئے مقرر کئے ہیں اپنی ذاتی اور خاص طاقت کے ذریعہ سے اس کام کو کر دیا ہے مثلاً خدا تعالیٰ نے آگ کو جلانے کیلئے پیدا کیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ کسی شخص نے بلا آگ اور بلا ایسے ہی دوسرے ذرائع کے استعمال کرنیکے اپنی ذاتی طاقت سے آگ لگا دی اور قانون قدرت کو گویا توڑ دیا یہ شرک ہے۔ لیکن اسمیں مسمریزم وغیرہ شامل نہیں ہیں کیونکہ یہ طاقتیں خود قانون قدرت کے اندر ہیں اور کسی شخص کے ذاتی کمالات نہیں بلکہ سب لوگوں میں موجود ہیں اور قانون قدرت کے صحیح استعمال کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ پس جو جو کام اس قسم کی طاقتوں کے ذریعہ سے ہو سکتے ہیں جیسے اعصاب کی حس کو مار دینا بے ہوش کر دینا۔ جسم کو سخت کر دینا وغیرہ انپر یقین لانا شرک نہیں کہلائیگا۔

پس جو اسباب خدا نے کسی چیز کے ہونے کیلئے رکھے ہیں، ان کے بغیر خیال کرنا کہ کوئی شخص اپنے زور سے کام کر دیگا۔ بغیر اسکے کہ یہ سمجھے کہ وہ دعا کر کے خدا سے وہ کام کرا دیگا، یہ شرک ہے۔

ساتویں قسم شرک کی ساتویں یہ سمجھنا کہ خدا کو کسی بندہ کی ایسی محبت ہو کہ ہر ایک بات اس کی مان لیتا ہے۔ یہ بھی شرک ہو۔ کیونکہ اسکے یہ معنی ہوئے کہ وہ بندہ خدائی طاقتیں رکھتا ہو۔ ہر ایک بات جو وہ کہتا ہے۔ قبول ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے آدمی کو خدا سمجھا جائے۔ اگر اگر خدا کا غلام بھی سمجھا جائے مگر اس کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اس سے خدا کو ایسی محبت ہے کہ اسکی ہر ایک بات قبول کر لیتا ہے۔ یہ شرک ہے۔ سارے پیر فقیر جنکے متعلق لوگ ایسا خیال رکھتے ہیں۔ اسکے اندر آجاتے ہیں۔ ہماری جماعت کو بھی ایسے خیالات سے بچنا چاہیئے بعض لوگوں کو میں دیکھتا ہوں بعض دفعہ کہدیتے ہیں یا لکھدیتے ہیں کہ اگر آپ دعا کرینگے تو وہ ضرور ہی قبول ہوگی خدا تعالےٰ بادشاہ ہے کسی کا غلام نہیں۔ اس قسم کے کلمات سے اللہ تعالیٰ کی ہتک ہوتی ہے اور شرک پیدا ہوتا ہے۔ میں تو کیا چیز ہوں جن لوگوں کے قدموں کی خاک کے برابر بھی میں نہیں یہ رتبہ انکو بھی حاصل نہ تھا۔

آٹھویں قسم شرک کی آٹھویں قسم شرک کی یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کے متعلق جسے خدا کے قانون قدرت نے کسی کام کے کرنے کیلئے کوئی طاقت نہیں دی۔ اسکے متعلق خیال کر لیا جائے کہ وہ فلاں کام کریگی۔ جیسے مثلاً خدا نے مردہ کو طاقت نہیں دی کہ اس دنیا میں کوئی تصرف کر سکے۔ اب اگر کوئی کسی مردہ کو جا کر کسی تصرف کیلئے کہتا ہے۔ تو شرک کرتا ہے۔ اسی طرح بتوں۔ دریاؤں، سمندروں سورج، چاند وغیرہ چیزوں سے دعائیں کرنا اور کرانا بھی شرک ہی ہے۔

نویں قسم شرک کی نویں قسم شرک کی یہ ہے کہ ایسے اعمال جو مشرکانہ رسوم کا نشان ہیں گو اب شرک کی مشابہت نہیں رکھتے۔ ان کا بلا ضرورت طبعی ارتکاب کرے۔ مثلاً ایک شخص کسی قبر پر جا کر نہ دعا کرے نہ کرائے نہ صاحب قبر کو خدا سمجھے۔ لیکن وہاں دیا جلا کر رکھ آئے۔ تو یہ فعل بھی شرک کے اندر آجائیگا۔ کیونکہ یہ عمل پہلے زمانہ کے مشرکانہ اعمال کا بقیہ ہے۔ وہ لوگ خیال کرتے تھے کہ مردے قبروں پر واپس آتے ہیں اور جن لوگوں کی نسبت معلوم کرتے ہیں کہ انہوں نے ان کی قبروں کا احترام کیا ہے ان کے کام کر دیتے ہیں۔ اسلئے لوگ قبروں پر دیئے یا اور بعض چیزیں رکھ آتے تھے۔ ان یادگاروں کو تازہ رکھنا بھی چونکہ شرک کی مدد کرنا ہے اسلئے شرک میں ہی داخل ہے۔ درختوں پر رسیاں وغیرہ باندھنی یا قبروں پر پردے چڑھانے ٹونے کرنے یہ سب امور اس قسم کے

شرک میں شامل ہیں اور سب اسلام کے نزدیک قطعی طور پر حرام ہیں۔ مینے جو یہ لکھا ہے کہ بلا ضرورت طبعی ایسے کام کرنے منع ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مثلاً کہیں جارہے تھے اندھیرا ہوگیا اور کسی مقبرہ میں ٹھہر گئے۔ ایسی صورت میں یہ نہیں کہ وہاں اندھیرے میں ہی بیٹھا رہے۔ بلکہ اگر روشنی کا سامان کرسکتا ہے۔ تو اسکے لئے جائز ہے کہ دیا جلالے *

دسویں قسم شرک کی دسویں قسم شرک کی یہ ہے کہ خواہ عمل نہو مگر دلمیں محبت۔ ادب۔ خوف اور امید کے جذبات خدا کی نسبت اوروں سے زیادہ رکھتا ہو یا خدا کے برابر رکھتا ہو *

ان دس قسموں کے باہر کسی قسم کا شرک میرے نزدیک نہیں بچتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جہانتک میں سمجھتا ہوں سب اقسام شرک کے ان دس قسموں میں آجاتی ہیں *

مجھے ساری عمر اسبات کی جستجو اور تلاش رہی ہے۔ کہ شرک کیا ہے؟ لوگ کہتے ہیں۔ یہ موٹی بات ہے۔ مگر میں طالب علمی کے زمانہ میں اسے سمجھنا چاہتا تھا اور سمجھ نہیں سکتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ یہ بات شرک ہے اور یہ نہیں۔ لیکن ایسی تعریف نہیں ملتی تھی کہ جس کے اندر شرک کی سب اقسام آجائیں اور ایسی بات جسمیں دخل نہو جو شرک نہ ہو۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ شرک کی ایک تعریف کرنا ہی غلط ہے جس طرح خدا تعالیٰ کے وجود کا تصور کبھی ذات کے لحاظ سے ہوتا ہے کبھی ان صفات کے لحاظ سے جنمیں مخلوق کو کسی قسم کی بھی قدرت نہیں دیگئی۔ کبھی ان صفات کے لحاظ سے جنمیں بظاہر بندے بھی شریک ہوتے ہیں اسلیئے سب امور کو مدنظر رکھکر شرک کی مختلف اقسام کی تعریفیں الگ الگ ہی کرنی چاہیئے *

شرک کا رد شرک کی تعریف بیان کرنیکے بعد میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ مشرکانہ خیال کا رد کس طرح کیا جائے؟ مینے اس سوال پر بھی غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یہ سوال بھی نہایت پیچیدہ ہے۔ میری نزدیک عوام الناس اسکے متعلق فلسفیانہ اور باریک بحثوں کو سمجھ نہیں سکتے اور چونکہ لوگ فلسفیانہ بحثوں میں ہی اکثر پڑجاتے ہیں اسلیئے عوام الناس کو چنداں فائدہ نہیں ہوتا۔ شرک کے مقابلہ کا اصل طریق فطرت انسانی سے اپیل ہے خدا تعالیٰ نے شرک کے خلاف انسان کی فطرت میں مادہ رکھا ہے اور اسکے پاس اپیل رائگان نہیں جاتی ایک آدمی سے بھی بجائے فلسفیانہ بحث کرنیکے اگر اس کی عقل اور ضمیر سے اپیل کرتے ہوئے مشرک

اس کی توجہ کو اس طرف پھیرا جائے تو وہ بہت جلد حق کی طرف رجوع کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی طریق پر زیادہ زور دیا ہے۔ بجائے اسپر بحث کرنیکے کہ خدا کا شریک ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لوگوں کو یہ توجہ دلائی ہے کہ خدا تعالیٰ کے احسانات کو یاد کرتے ہوئے دوسروں کو اسکے برابر قرار نہ دو اور پھر ان چیزوں کی کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے جنکو لوگ خدا کا شریک قرار دیتے تھے اور اس طرح لوگوں کی صحیح فطرت کو اکسایا ہے جسکا اثر یہ ہوا کہ ملک کا ملک شرک کو چھوڑ کر توحید کیطرف لوٹ آیا۔

اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک قانون قدرت بنایا ہے اور جو طاقتیں کسی کو دینی تھیں وہ دیدی ہیں۔ ان سے الگ جو کام انسان کرنا چاہتا ہے۔ اسکے کرنے کی طاقت خدا نے اپنے قبضہ میں رکھی ہے۔ تاکہ اس کی طرف انسان کی توجہ ہو۔ اگر سب کچھ انسان خود کر لیں۔ تو اس کی طرف کون توجہ کرے۔ پس خدا تعالیٰ نے قانون قدرت بنا دیا۔ اور پھر یہ فیصلہ کر دیا کہ اگر کوئی اسمیں فرق کرانا چاہے تو وہ مجھ سے دعا کرے اسکے بدلنے کی طاقت میں کسی اور کو نہیں دونگا۔ بس صرف ایک ذریعہ دعا کا انسان کے ہاتھ میں رکھا گیا ہے اور دعا صرف خدا تعالیٰ سے کیجا سکتی ہے اور کسی سے نہیں۔

دوسرے سے دعا کرانا ۔ اگر کوئی کہے کہ پھر دوسرے سے دعا کرانا بھی ناجائز ہونا چاہیئے۔ یہ کیوں جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی اجازت دینے میں ایک حکمت مخفی ہے۔ اگر یہ حکمت نہ ہوتی تو دوسرے سے دعا کرانا بھی شرک ہوتا۔ اور وہ یہ ہے کہ اکثر انسان کمزور ہوتے ہیں وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے اور ان کے لئے کسی نمونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر نمونہ نہو تو انکا خدا تک پہنچنا مشکل ہو جائے پس خدا تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کے مدارج مقرر کر دیئے ہیں تاکہ لوگ صحبت صالح کی جستجو کریں اور بد صحبت سے اجتناب کریں۔ کیونکہ یہ قدرتی بات ہے کہ جب کوئی شخص دیکھیگا کہ ایک شخص کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے تو اس کی طرف توجہ کریگا اور اسکی صحبت کو قبول کریگا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکے اعمال میں درستی پیدا ہونے لگیگی۔ دوسرے دعا کرانیوالا کبھی یہ فرض نہیں کرتا کہ اس شخص کو خدا تعالیٰ نے کوئی طاقت دیدی ہے بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی دعا کو بوجہ اس کی نیکی کے خدا زیادہ سنتا ہے۔ مگر یہ ضرور شرط ہے کہ جس سے انسان

دعا کرائے اسکے متعلق یہ خیال ہرگز نہ کرے کہ اسکی سب دعائیں اللہ تعالیٰ سنتا ہے۔ اگر ایسا سمجھیگا تو وہ مشرک ہو جائیگا خدا تعالیٰ کے استغناء کو اسے ضرور مدنظر رکھنا چاہیئے +

مردہ سے دعا کرانا شرک ہے

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دوسرے سے دعا کرانا شرک نہیں اور ادھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مردے سنتے ہیں اور احادیث سے بھی یہ امر ثابت ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ مردوں سے دعا کرنا شرک ہی؟ اسکا جواب یہ ہے کہ ان امور کیلئے کسی زندہ سے التجا کرنا بھی شرک ہے جو خدا تعالےٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں اور طبعی قانون کر مانا ہیں۔ پس مردے سے کیونکر جائز ہو سکتا تھا زندہ سے انسان دعا کرتا نہیں بلکہ اس سے دعا کراتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ مُردے سے دعا کرانا تو پھر شرک نہ ہوا؟ اسکا جواب یہ ہی کہ مُردے گو سنتے ہیں مگر ان کا سننا خدا تعالیٰ کے خاص حکم کے ماتحت ہوتا ہے وہ انسانوں کی طرح ہر اک بات جو انکی قبر پر کہی جائے نہیں سنتے۔ ہاں انکی روح کو اپنے دنیوی عزیزوں سے ایک تعلق پیدا کرانیکے لئے بعض امور ان کو سنائے جاتے ہیں۔ پس ایسے وجودوں سے دعا کرانے کی خواہش کرنا جنکا ہر اک بات سننا بھی یقینی نہیں بلکہ خدا کے خاص حکم کے ماتحت ان کو باتیں سنائی جاتی ہیں۔ اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ اتنی دیر انسان خدا سے ہی کیوں دعا نہ کرے ہاں اگر کشف یا وحی سے کسی انسان کو کسی مُردہ بزرگ کی زیارت کرائی جائے اور اسپر منکشف ہو جائے کہ اسے اسکے لئے دعا یا شفاعت کی توفیق دی جائیگی اور وہ اس سے دعا کیلئے کہے تو یہ جائز ہو گا بلکہ یہ خدا تعالےٰ کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہوگی جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنکو خدا تعالیٰ کی طرف سے باریک روحانی علم دیا گیا ہے۔ اگر یہ حالت نہ ہو تو جو شخص اس خیال سے مردہ سے دعا کراتا ہے کہ وہ ضرور اس کی باتیں سُن رہا ہے اور ضرور دعا کریگا اور ضرور اسکی سنی جائیگی وہ مشرک ہے اور مشرکانہ فعل کرتا ہے۔ اور جو شخص سمجھتا ہے کہ طبعی قانون کے ماتحت رہے یہ اور دنیا میں ہیں خدا کا خاص فعل ان کو دنیا کی آوازیں سنا سکتا ہے اور خدا کی خاص اجازت سے ہی یہ دعا کر سکتے ہیں اور خدا چاہے تو ان کی سُنے اور چاہے تو نہ سُنے تو ایسے شخص کا مردہ سے دعا کی خواہش کرنا شرک نہ ہوگا۔ ہاں بسا اوقات ایک عبث فعل اور وقت کا ضائع کرنا ہوگا اور بسا اوقات مکروہ ہوگا اور بسا اوقات ناجائز ہوگا گو شرک کی حد تک نہ پہنچے۔ کیونکہ دوسرے

دعا کرانے کی اصل حکمت صحبت صالح کیطرف توجہ دلانا ہے۔ اگر مُردوں سے دعا کرانیکا دروازہ کھلا ہو تو زندوں سے دعا کرانیکا رواج اور اس طرح صحبت صالح سے فائدہ اُٹھانیکا رواج بہت کم ہو جائیگا اور اس سے دنیا کی روحانی ترقی کو نقصان پہنچیگا۔ میرے نزدیک زندے سے دعا کرانیکا فائدہ خواہ وہ وفات یافتہ سے بہت ہی کم درجہ پر کیوں نہ ہو۔ بہت زیادہ ہوگا (بشرطیکہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مردہ سے دعا کرانیکا اس موقعہ پر اسے کوئی فائدہ ہوا ہے)+

مردہ سے دعا کرانیکا جو استثناء مینے بیان کیا ہے اس کی مثال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ آپکو بعض کشوف کے ذریعہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح ناصری سے ملایا گیا اور ان سے دعا کی خواہش کرائی گئی جسے آپنے اپنی بعض تحریروں میں اور نظموں میں بیان کیا ہے اور جاہل اور نادان خشک ملاؤں نے اسپر اعتراض کیا ہے+

کیا شرک بخشا نہیں جائیگا

جبکہ مینے اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ شرک ایک نہایت باریک سوال ہے تو یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایسے باریک سوال پر اسقدر سخت گرفت کیوں رکھی ہے کہ وہ بخشا ہی نہیں جائیگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ شرک باوجود توبہ کے نہیں بخشا جائیگا۔ کوئی گناہ بھی ایسا نہیں کہ جو توبہ سے بخشا نہ جائے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شرک نہیں بخشا جائیگا تو اسکے صرف یہ معنی ہیں کہ بعض گناہ ایسے ہیں جو بعض نیکیوں کے مقابلہ پر آکر انسان کی روحانی ترقیات میں روک نہیں بنتے۔ پس باوجود ان کے انسان نجات پا جائیگا مگر شرک ان گناہوں میں سے نہیں ہے۔ اگر ایک انسان مشرک ہو تو خواہ دوسرے اعمال اسکے کسقدر بھی اچھے کیوں نہوں اسے اپنی روحانی پاکیزگی کیلئے جدوجہد کرنی پڑے گی اور ایسے حالات میں سے گزرنا پڑیگا کہ جنمیں سے گزرے بغیر روح اگلے جہان میں اپنی امراض کو دور نہیں کر سکیگی۔ اور پھر یہ بھی بات ہے کہ یہ حکم شرک جلی کیلئے ہے نہ کہ شرک خفی کیلئے۔ شرک خفی کے متعلق اس کی نیت اور کوشش کو دیکھا جائیگا+

شرک کے خلاف قرآن کا طریق

شرک کے خلاف لوگ چونکہ غلط بحثوں میں پڑ جاتے ہیں۔ اسلئے ان کی بحثوں کا نتیجہ قطعی نہیں نکلتا۔ مگر جیسا کہ میں مختصراً اوپر ذکر کر آیا ہوں اس مسئلہ کے متعلق بحث زیادہ تر تفصیلی کرنی چاہیئے۔ مثلاً بجائے اسپر بحث کرنیکے

کہ سجدہ کرنا چاہئے یا نہیں اسپر بحث کرے کہ وہ کونسا وجود ہے جو سجدہ کا مستحق ہے اسکو ہمارے سامنے پیش کرو۔ قرآن کریم نے اسی طریق کو اختیار کیا ہے۔ جس کی وجہ سے مشرک کا ناطقہ اس طرح بند ہوگیا ہے کہ اب موحد کے سامنے اسکی زبان نہیں کھل سکتی۔ مثال کے طور پر میں مندرجہ ذیل آیت کو پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ - ۴۰) یعنی تم لوگ سوائے چند ناموں کے جو تمنے اور تمہارے آباء نے آپ ہی رکھ لئے ہیں اور کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ خداتعالےٰ نے ان کے متعلق کوئی دلیل نہیں نازل کی۔ اپنی طاقتیں دینے کا اختیار خداتعالےٰ کے اختیار میں ہے نہ کہ تمہارے اختیار میں پھر ان کو کسنے طاقتیں دیدیں خداتعالےٰ کیطرف سے آنیوالے سب انبیاء تو یہی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں کہ اس کی پرستش کرو۔ یہی سیدھا اور پکا طریق ہے لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہم یہ بحث نہیں کرتے کہ خدا کے سوا کوئی پرستش کے قابل ہے یا نہیں۔ ہمیں یہ بتادو کہ کیا جن جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو ان میں خدا کی طاقت آگئی ہے اگر یہ ثابت کردو کہ وہ بیٹے دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ انسانوں کے دکھ دور کرسکتے ہیں۔ تو انکے معبود ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر ان میں کچھ بھی طاقت نہیں۔ تو وہ معبود کیسے اور ان کی پرستش کیسی؟ فرماتا ہے۔ مشرکوں سے یہی پوچھو کہ جنکو تم خدا کا شریک بناتے ہو انکے خدا ہونے کی دلیل پیش کرو۔ جب خدائی کے اختیار خدا ہی دے سکتا ہے۔ اور وہ فرماتا ہے کہ ان الحکم الا للہ۔ سب اختیار میرے ہی پاس ہیں۔ تو ان کے پاس کچھ نہ ہؤا۔ مگر تم کہتے ہو کہ وہ یہ بات کرتے ہیں۔ یہ کام کرتے ہیں۔ اسلئے ثبوت دو کہ واقع میں انمیں بعض خدائی طاقتیں ہیں؟۔

ایک اور جگہ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ ھٰذا خلق اللہ فارونی ماذا خلق الذین من دونہٖ (سورہ لقمان ع۲) - خدا کی مخلوق تو ظاہر ہی ہے۔ اگر ان میں بھی کچھ طاقت ہے جنکو تم معبود بناتے ہو تو دکھاؤ انہوں نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ کہاں ہے؟

شاید اس موقعہ پر کسی کے دل میں خیال گذرے کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو سامنے

فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا تھا اور یوسف علیہ السلام کو ان کے والد نے سجدہ کیا تھا۔ اگر غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا ناجائز ہے تو پھر ایسا کیوں ہوا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ سجدہ کے معنے اطاعت کے بھی ہیں۔ فرشتوں سے کہا گیا تھا کہ آدم کی اطاعت کرو۔ اور حضرت یوسفؑ کے متعلق جو آیت ہے اسکے یہ معنی ہیں کہ یوسفؑ کی ترقی دیکھکر اور اُن کو سلامت پاکر انکے والد نے شکریہ کے طور پر خدا کو سجدہ کیا نہ یہ کہ یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔

شرک کی سخت ناپسندیدگی کیوجہ

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ شرک کو اتنا ناپسند کیوں کیا گیا ہے؟ کہ سارے قرآن میں اسپر نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

اوّل یہ کہ خدا کا شریک بنانے سے اس کی غیرت بھڑکتی ہے اور وہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی شان کسی اور کو دیجائے۔ اور غیرت بھی اعلیٰ صفات میں سے ہے۔ اور اسکا پایا جانا خدا تعالےٰ کے کامل الصفات ہونے پر دلالت کرتا ہے نہ کہ نقص پر۔

دوم۔ بندوں پر رحم اور مہربانی بھی شرک سے روکنے کا باعث ہی۔ اگر لوگ خدا کے سوا اور معبودوں پر بھی یقین رکھیں گے تو اکثر کم ہمتی کیوجہ سے (تجربہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں) کہہ دینگے کہ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہمنے چھوٹے خداؤں کو خوش کرلیا۔ اس سے آگے جاکر کیا کرنا ہے۔ اور اس طرح خدا تعالےٰ کی عبادت سے جو روحانی ترقیات کیلئے ضروری ہے محروم ہو جائینگے۔ پس لوگوں کو ہلاکت سے بچانے کیلئے شرک کے دور کرنے کی طرف اللہ تعالیٰ دوسرے امور کی نسبت زیادہ توجہ فرماتا ہے۔

سوم۔ یہ کہ جو امور معبودان باطلہ میں تسلیم کئے جاتے ہیں اگر فی الواقع خدا کے سوا اور وجودوں میں پائے جائیں تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے اور بندوں کے درمیان حجاب اور پردے پیدا کر چھوڑے ہیں حالانکہ بنی نوع انسان کو پیدا ہی قرب الٰہی کے حصول کیلئے کیا گیا ہے۔ پس شرک کی وجہ سے چونکہ محبت الٰہی کم ہو جاتی ہے اور پیدائش کی غرض پوشیدہ ہو جاتی ہی یوں معلوم ہوتا ہے گویا اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان روک پیدا کرنی چاہتا ہے اسلئے خدا تعالےٰ اس غلط عقیدہ کو مٹا کر انسان کے دل میں اپنی کامل محبت پیدا کرنی چاہتا ہے جو بلا توحید پر ایمان لانے کے ہو ہی نہیں سکتا۔

چوتھے یہ کہ شرک سے جھوٹ۔ جہالت اور بزدلی پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اسکے بندے ان گناہوں میں مبتلا ہوں اسلئے وہ اس ناپاکی کو دور فرماتا ہے۔ جھوٹ شرک میں یہ ہے کہ جو طاقتیں خدا نے کسی کو نہیں دیں ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں شخص یا چیز میں وہ موجود ہیں۔ جہالت اسلئے کہ جن چیزوں کو خدا تعالیٰ نے انسان کے فایدہ کیلئے اور خدمت کیلئے بھیجا ہے انہیں وہ اپنا افسر اور حاکم سمجھ کر ان سے فائدہ اُٹھانے سے محروم ہو جاتا ہے اور ایسے ذرائع سے ان سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے جس طریق سے وہ نفع حاصل نہیں کر سکتا اور بزدلی اسلئے کہ جن وجودوں سے اسے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں جن سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا وہ ان سے کانپتا اور لرزتا ہے +

حق یہ ہے کہ شرک انسان کا نقطۂ نگاہ بہت ہی محدود کر دیتا ہے اور اس کی ہمت کو گرا دیتا ہے اور اسکے مقصد کو ادنیٰ کر دیتا ہے۔ مشرک انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ براہ راست خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا حالانکہ اور اسے کسی واسطہ کی ضرورت ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور انسان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رکھا وہ سب انسانوں سے یکساں محبت کرتا ہے۔ ہاں اگر انکے اعمال میں فرق ہو تو بے شک وہ اعمال کے لحاظ سے تعلق میں بے شک فرق کرتا ہے۔ لیکن بلحاظ بندہ ہونے کے کافر اور مومن سے اسکا یکساں سلوک ہے اور سب کیلئے اسکے دروازے کھلے ہیں جو چاہے اسکے قرب کی تلاش کرے۔ وہ نہیں چاہتا کہ انسان اور اسکے درمیان کوئی واسطہ بنکے کھڑا ہو۔ خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ انسان خود اسکے سامنے آئے۔ اب دیکھو کہ کوئی بادشاہ اپنی رعایا سے چاہے کہ وہ خود اس سے بات کریں اور وہ دوسروں سے جا کر کہیں کہ تم ہمارا کام کرو۔ ہم بادشاہ کے پاس نہیں جاتے تو کیا وہ پسند کریگا؟ یہ خیال غلط ہے کہ بادشاہ سب سے تعلق نہیں رکھ سکتے آخر ان کے نائب مقرر ہوتے ہیں کیونکہ بادشاہ انسان ہوتا ہے اور اس کی طاقتیں محدود ہوتی ہیں مگر خدا تعالیٰ کی طاقتیں محدود نہیں ہیں۔ بادشاہ کیلئے سب سے تعلق رکھنا ممکن نہیں مگر خدا تعالیٰ کی طاقت اور قدرت میں ہے کہ وہ سب سے براہ راست تعلق رکھے اور وہ پسند نہیں کرتا کہ اسکے اور بندہ کے درمیان کوئی حجاب ہو۔ کیونکہ اسنے انسان کو پیدا ہی اسلئے کیا ہے کہ وہ اسکا قرب حاصل کرے +

دیکھو توحید پر ایمان لا کر انسان کی نظر کس قدر وسیع ہو جاتی ہے۔ اسکا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ اسکا تعلق براہ راست خدا تعالےٰ سے ہو اسے خدا تعالیٰ سے ملنے کیلئے کسی شفیع کی ضرورت نہیں نہ کسی نبی کی نہ کسی ولی کی ۔

نبیوں کی اطاعت کی وجہ اس موقعہ پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر یہ بات ہے۔ تو نبیوں کی اطاعت کیوں کیجاتی ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اطاعت اور چیز ہے اور وسیلہ ڈھونڈنا اور شے ہے۔ اطاعت تو یہ ہے کہ جس رستے پر وہ چلتے ہیں ہم بھی اس راستہ پر چلیں یا متفقہ عمل کیلئے اس نظام کی پابندی کریں جسے وہ مقرر کرتے ہیں۔ مگر وسیلہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی شخص کو اسلئے پیدا کرے یا اس عہدہ پر مقرر کرے کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اندر نہ آسکے یا یہ کہ اپنے بعض ختیار اسے دیدے تا وہ بھی خدا کی بعض صفات کے ذریعہ سے دنیا میں تصرف کرے۔ نبیوں کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک واقف راہ ایسے شخص کو جو کسی مقام کا رستہ نہ جانتا ہو اپنے ساتھ لیجا کر راستہ دکھادے دنیا کا کوئی شخص نہ کہیگا کہ یہ رستہ دکھانیوالا شخص درمیانی اور وسیلہ ہے۔ وہ راہنما کہلا سکتا ہے رہبر کہلا سکتا ہے استاد کہلا سکتا ہے مگر وہ درمیانی ہرگز نہیں ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی طاقتوں پر متصرف نہیں ہے۔ رسول لوگوں کو بلانے آتا ہے نہ کہ ان کے سامنے دروازہ بند کر کے کھڑے ہو جانے کیلئے ۔

خلفاء کا تعلق بھی انبیاء سے یہی ہوتا ہے وہ انبیاء کی تعلیم پر لوگوں کو عمل کرانے اور نظام قائم کرنیکے لئے ہوتے ہیں نہ کہ نبیوں اور لوگوں کے درمیان روک ہوتے ہیں۔ یہی نکتہ تھا جسکو بیان کرتے ہوئے حضرت احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے منہ سے نکل گیا تھا کہ ؎

پنجہ در پنجہ خدا دارم　　　　من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

ایسے نیک انسان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے ادبی کریگا۔ ان کا دوسرا کلام ہرگز اس امر کی تصدیق نہیں کرتا کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بے ادب تھے جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ خدا تعالےٰ نے اپنے ملنے کا راستہ سب کے لئے کھلا چھوڑا ہے اس غرض کیلئے کسی وسیلے کی اسے ضرورت نہیں خواہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کیوں نہوں اور اس میں کیا شک ہو کہ انسان کو قرب الٰہی کے حصول کیلئے کسی وسیلہ کی

ضرورت نہیں گو نمونے اور رہنما کی اسے ضرورت ہے +

انسان کو پیدا کرنیکی غرض

غرض بندہ کو خدا تعالیٰ نے اسلئے پیدا کیا ہے۔ کہ اپنی صفات کی اسپر جلوہ گری کرے۔ جیسے آئینہ بناتے ہیں تا کہ اسمیں اپنا عکس دیکھا جائے۔ اگر کوئی اسپر عکس نہ پڑنے دے۔ تو اس شخص پر کس قدر غصہ آتا ہے۔ اسی طرح خدا اور بندہ کے درمیان اگر کچھ حائل ہو تو اسے خدا ناپسند کرتا ہے +

بچپن میں مینے ایک رویا دیکھی تھی کہ میں ایک جگہ لیکچر دے رہا ہوں۔ اور یہ بیان کر رہا ہوں کہ خدا بندہ کے ساتھ اسی طرح تعلق رکھتا ہے جیسے انسان آئینہ سے۔ پھر کہتا ہوں کہ دیکھو اگر ایک شخص کا آئینہ خراب ہو جائے اور وہ اسمیں چہرہ دیکھنا چاہے مگر چہرہ نظر نہ آئے تو وہ کیا کریگا یہی کہ وہ اسے زور سے اٹھا کر زمین پر دے مارےگا اور اسے چکنا چور کر دیگا۔ اور اسوقت میں نے اپنے ہاتھ میں ایک آئینہ دیکھا جسے زور سے زمین پر دے مارا اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اسکے ٹوٹنے کی زور سے آواز آئی +

میری اس خواب کی یہی تعبیر تھی کہ بندہ کا دل اللہ تعالیٰ کا آئینہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جلوہ گر ہوتی ہیں اور بجائے اسکے کہ وہ اپنے اور بندے کے درمیان خود کسی کو کھڑا کرے اگر کوئی خود آ کھڑا ہو تو خدا تعالیٰ اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔ نبی کی اطاعت کا حکم دینے کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی کو کہیں کہ آئینہ صاف کر دو اور شرک جو وسیلہ قرار دیتا ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آئینہ پر گرد ڈالدے یا اسے سیاہ کر دے۔ ہم لوگ آئینہ ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں صاف کر کے خدا کے سامنے کرنیوالے ہیں کیونکہ انہوں نے خاص قربانی اور خاص اطاعت سے اس طریق کو معلوم کر لیا ہے جس سے انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے وہ ہمیں رستہ بتاتے ہیں اور ہم انکے پیچھے چلتے ہیں۔ لیکن شرک ایک روک ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے +

صفات الٰہیہ کیا ہیں؟

شرک کا ذکر کرنے کے بعد میں اب صفات الٰہیہ کا ذکر کرتا ہوں پہلا سوال یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کیا ہیں۔ صفات الٰہیہ وہ اسماء ہیں کہ جنکے ذریعہ سے بندے اور خدا تعالیٰ کا تعلق بتایا جاتا ہے یا خدا تعالیٰ کے مقام تنزیہ یا نزول کی کیفیت بتائی جاتی ہے

یعنی وہ اپنی ذات میں کیا کمال رکھتا ہے اور بندوں سے کس طرح معاملہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (حشر ع۳) وہ اللہ ہے جسکے سوا اور کوئی معبود نہیں بادشاہ ہے پاک ہے سلامتی کا سرچشمہ ہے۔ امن دینے والا ہے محافظ ہے غالب ہے نقصان کی اصلاح کرنیوالا ہے بلند مرتبہ ہے اللہ پاک ہے ان کے مشرکانہ خیالات سے وہ اللہ ہے خالق شکل بنانیوالا صورتیں دینے والا اسکے اندر تمام اچھی صفات پائی جاتی ہیں اور وہ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

یہ وہ نام ہیں جنکے ذریعہ سے خدا تعالیٰ بندوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یا جن کے ذریعہ تمہارے لئے اپنے قرب کا سامان پیدا کرتا ہے یا جنکے ذریعہ بندہ کو اپنے سے جدا ثابت کرتا ہے نام عربی میں صفت کیلئے بھی آتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے جو نام قرآن اور احادیث میں آئے ہیں ان سے مراد صفات ہی ہیں اور ان میں سے موٹے موٹے نام یہ ہیں قدوس۔ سلام۔ مومن مہیمن عزیز۔ جبار۔ متکبر۔ خالق۔ باری۔ مصور۔ حکیم۔ علیم۔ رزاق۔ سمیع۔ بصیر۔ حفیظ۔ کریم۔ محی۔ قیوم۔ رؤف۔ رحیم۔ غنی۔ صمد۔ ودود۔ ان ناموں کے بتانے کی غرض یہ ہے کہ بندہ ان ناموں کے ذریعہ سے معلوم کر سکے کہ وہ خدا سے کس کس طرح تعلق پیدا کر سکتا ہے۔

خدا کیلئے نام تجویز کرنا

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ خدا نے کہا ہے کہ میرے اچھے نام ہیں، تو کیا ہم خود بھی کوئی اچھا نام دیکھکر خدا کی طرف منسوب کر دیا کریں؟ میرے نزدیک ایسا نہیں کرنا چاہئیے۔ وجہ یہ کہ اس میں بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وللہ الاسماء الحسنیٰ وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ سیجزون ما کانوا یعملون (اعراف ع۲۲) تمام صفات حسنہ خدا کی ہیں۔ اور تم ان لوگوں کو جو خدا تعالیٰ کے ناموں کے اپنی طرف سے باتیں بنا لیتے ہیں تم ان کو چھوڑ دو۔

چونکہ انسان جب خود عقل سے صفات الٰہیہ پر غور کرتا ہے تو کچھ کا کچھ بنا لیتا ہے اسلئے اس طرح کرنا ٹھیک نہیں، ہاں اگر کوئی شخص جوش محبت میں ایسا کر بیٹھے تو ہم اسے کبھی

نہیں کہینگے۔ جیسے مثنوی والے نے ایک قصہ لکھا ہے۔ کہ ایک گڈریا کہ رہا تھا۔ کہ اگر خدا مجھے ملجائے تو میں اسکی جوئیں نکالوں۔ اسے دودھ پلاؤں۔ اسکے پاؤں دباؤں۔ حضرت موسیٰ نے پاس سے گذرتے ہوئے جب یہ سنا تو اسے ڈانٹا کہ اس طرح نہ کہو۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرمایا۔ تمنے اسکا دل کیوں توڑا۔ اسکا اسیقدر علم تھا یہ اپنے علم کے مطابق اظہار محبت کر رہا تھا۔ لیکن اگر یہی خیال جو جوش محبت میں گڈریا ظاہر کر رہا تھا اس کا عقیدہ بنجاتا اور دوسرے لوگ بھی اسکو سیکھتے تو خدا تعالےٰ کے متعلق کیسا بھدا خیال دنیا میں باقی رہجاتا چنانچہ ہندوؤں میں اسی قسم کے خیالات نے بڑی ابتری پھیلائی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب پرمیشور سوتا ہے تو لچھمی اسکے پاؤں سہلاتی ہے۔ چونکہ ان کو دولت سے بہت محبت ہے۔ اسلئے انہوں نے سمجھا کہ پرمیشور کی بھی یہی حالت ہوگی اسلئے انہوں نے سب سے بڑی عظمت خدا کی یہی سمجھی کہ جب وہ سوتا ہوگا تو لچھمی جسے وہ دولت کی دیوی سمجھتے ہیں۔ پرمیشور کے پاس آتی اور اسکے پاؤں سہلاتی ہوگی۔

اسی طرح عیسائیوں کے عجیب و غریب خیالات ہیں۔ آجکل ان میں رواج ہے۔ کہ لوگوں کو مذہب کی طرف توجہ دلانے کیلئے ناٹک دکھلاتے ہیں۔ ایک قصہ مشہور ہے جسمیں یہ نقشہ کھینچا جاتا ہے کہ یسوع کو صلیب پر چڑھانے لگے ہیں۔ ایک دوسرا کمرہ ہے جس میں خدا سو رہا ہے۔ ایک شخص جاتا ہے۔ اور جاکر دروازہ کھٹکھٹاتا اور کہتا ہے۔ کہ باپ اٹھ بیٹا صلیب پر چڑھنے لگا ہے۔ اس پر خدا آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے۔ اور کہتا ہے میری روح کو شیطان ہی لیجائے۔ اگر مجھے اس بات کا پتہ لگا ہو۔

پس پسندیدہ طریق یہی ہے۔ کہ اپنی طرف سے خدا کے متعلق کوئی بات نہ تجویز کیجائے۔ جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے وما قدروا اللہ حق قدرہٖ کہ اپنی طرف سے خدا کے متعلق باتیں بنانیوالے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ جیسے عیسائیوں نے اسے عادل بنایا۔ اور پھر کہدیا۔ کہ وہ رحم نہیں کر سکتا دیکھو وہ کہاں سے کہاں نکل گئے۔ تو خدا تعالےٰ کے اسماء وہی درست ہو سکتے ہیں۔ جو خدا نے خود بتائے ہیں۔

خدا کے کسی فعل سے بھی نام نہیں بنانا چاہیئے

ایک اور سوال ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ

اچھا ہم اپنی عقل سے تو خدا کا کوئی نام تجویز نہ کریں۔ لیکن جو باتیں خدا نے اپنی طرف خود منسوب کی ہیں۔ ان سے نام بنالیں تو کیا حرج ہے؟

میرے نزدیک اس طرح بھی نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا فعل شرائط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ لیکن نام میں وہ بات نہیں ہوسکتی۔ جیسے آتا ہے یضل بہ کثیرًا اور دوسری جگہ فرما دیا وما یضل بہ الا الفاسقین۔ اب اگر کوئی خدا کو یا مضلّ کرکے مخاطب کرے تو یہ درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ یضل کا فعل ایک شرط کے ساتھ استعمال ہوا ہے جو نام سے ظاہر نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ کے نام وہی ہوسکتے ہیں جو اسنے خود بتائے ہیں۔ یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتائے ہیں یا پھر مسیح موعود نے بتائے ہیں۔ کیونکہ خدا کے رسول اپنے پاس سے نام نہیں تجویز کرتے بلکہ الہام الٰہی سے انکو ان پر مطلع کیا جاتا ہے +

صفات الٰہیہ کی اقسام

اب میں یہ بتاتا ہوں۔ کہ صفات الٰہیہ چار قسم کی ہیں۔

اوّل وہ جنمیں خدا کی قدرتوں کا ذکر ہے اور یہ چار قسم کی ہیں۔ اول وہ جو بدء سے تعلق رکھتی ہیں یعنی ان میں خدا اور مخلوق کے تعلق کی ابتداء کا اظہار کیا ہے یعنی اس کی پیدائش اسکا وجود میں لانا وغیرہ۔ ابتدائی جیسے مادہ کو پیدا کیا۔ دوسری جو ایصال خیر سے تعلق رکھتی ہیں جیسے رحیم۔ رحمٰن وغیرہ۔ تیسری جو دفع شر سے تعلق رکھتی ہیں جیسے حفیظ۔ مہیمن وغیرہ۔ چوتھی وہ جو نافرمانی پر سزا دینے کے متعلق ہیں +

دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن سے خدا تعالیٰ اپنا منزہ عن العیوب ہونا بیان کرتا ہے جیسے یہ کہ وہ نہ کسی کا بیٹا ہے نہ باپ۔ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ سوتا ہے۔ ان صفات میں زیادہ تر ان خیالات کا دفع مدنظر ہوتا ہے جو لوگوں میں خدا تعالےٰ کے متعلق رائج ہوتے ہیں اور غلط ہوتے ہیں یا جنکو انسان اپنے پر قیاس کرکے خدا تعالیٰ کیطرف منسوب کرسکتا ہے +

تیسری قسم کی صفات وہ ہیں جنمیں خدا تعالیٰ اپنے ذاتی حسن کو بیان کرتا ہے +

چوتھی قسم کی صفات وہ ہیں جنمیں خدا تعالےٰ اپنے وراء الوریٰ ہونیکو بیان کرتا ہے۔ جیسے صفت احد ہے کہ وہ اسکے کامل طور پر ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے کسی دوسرے وجود کے خیال کو بھی قریب پھٹکنے نہیں دیتی +

کیا خدا کی صفات انسانی صفات جیسی ہیں؟

اسجگہ ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی جو صفات بیان کیگئی ہیں انہیں سے بہت سی ہیں جو انسان میں بھی پائی جاتی ہیں جیسے مثلاً کہتے ہیں کہ خدا محبت کرتا ہے اسی طرح بندہ بھی محبت کرتا ہے تو کیا اسکی محبت ہماری محبت جیسی ہی ہوتی ہے۔ یا جب کہتے ہیں کہ وہ سنتا ہے تو کیا ہماری طرح ہی سنتا ہے۔ یا جب کہتے ہیں کہ وہ بولتا ہے تو کیا ہماری طرح ہی بولتا ہے؟

اسکے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ جو صفتیں ہم خدا تعالیٰ کیطرف منسوب کرتے ہیں۔ انکا یہ مطلب نہیں کہ وہ صفات جیسی ہم میں پائی جاتی ہیں۔ ویسی ہی خدا میں بھی ہیں۔ بلکہ ان کے ذریعہ سے صرف اس قدر بتانا مقصود ہوتا ہے کہ جس طرح مثلاً آنکھوں یا کانوں کے ذریعہ سے ہمیں آواز یا صورت و شکل یا حرکت کا علم ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کو بھی آواز اور صورت و شکل یا حرکت کا علم ہوتا یا کہ جس طرح انسان اپنے ارادہ کو زبان سے ظاہر کر سکتا ہے خدا تعالیٰ بھی اپنا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ اس سے زیادہ مشابہت خدا تعالیٰ اور بندوں کی صفات میں نہیں ہوتی اور اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہوتی کہ جن آلات سے بندہ کام لیتا ہے خدا بھی لیتا ہے یا یہ کہ جو کیفیات بندے کے اندر پائی جاتی ہیں وہی نعوذ باللہ خدا تعالیٰ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً غضب ہے انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اسکے خون میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ دل اور دماغ کیطرف چڑھتا ہے۔ مگر خدا کے متعلق جب یہ آتا ہے کہ اسنے مثلاً یہود پر غضب کیا۔ تو اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہوتی کہ خدا کا بھی جسم ہے اور اس کے جسم میں خون جوش میں آگیا ہے۔ بلکہ اس صفت کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح غضب ہماری بہت سخت ناپسندیدگی پر دلالت کرتا ہے خدا تعالیٰ بھی بعض انسانی افعال کو ناپسند کرتا ہے اور انکے مرتکبین سے بعض قسم کے تعلقات توڑ دیتا ہے۔ یا مثلاً محبت کا جذبہ ہے اس جذبہ کیساتھ بھی انسان کے خون میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اسکے ساتھ تنافر نہیں بلکہ رغبت پیدا ہوتی ہے مگر خدا تعالیٰ کیلئے جب یہ لفظ استعمال کیا جائے تو اسکے ہرگز یہ معنی نہیں ہوتے بلکہ صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ جس طرح ہمیں جس سے محبت ہو اس سے ہم اچھا سلوک کرتے اور اسے دکھوں اور بدیوں سے بچاتے ہیں۔ اور آرام پہنچاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ بعض اشخاص کے اخلاص اور محبت کی وجہ سے

ان سے اسی طرح کا معاملہ کرتا ہے +

اس سے معلوم ہوا کہ ان صفات کے ماتحت جو کام ہم کرتے ہیں وہی خدا بھی کرتا ہے لیکن کیفیت میں اختلاف ہے۔ گویا ظہور صفات میں تو اشتراک ہے لیکن وجود صفات میں اشتراک نہیں گویا باوجود لفظی مشارکت کے اللہ تعالیٰ اپنی ہر صفت کے لحاظ سے بھی لیس کمثلہ شئ ہے اور لفظی مشابہت صرف بندوں کو سمجھانے کیلئے قبول کرلیگئی ہے +

صفات کے متعلق ایک یہ بھی سوال ہے کہ کیا وہ ہمیشہ ظاہر ہوتی رہتی ہیں یا کسی خاص زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات معطل نہیں ہوتیں۔ مومنوں کو بشارت ہو کہ یہ کھڑکی اب بھی کھلی ہے۔ اور یہ دروازہ اب بھی بند نہیں +

خدا کی صفات غیر محدود ہیں

صفات الٰہیہ کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس قدر نام قرآن کریم یا احادیث میں آچکے ہیں۔ خدا تعالےٰ کی صفات اسیقدر ہیں یا اور بھی ہیں؟ اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات بھی اسیطرح غیر محدود ہیں۔ جس طرح کہ اس کی ذات غیر محدود ہے۔ اور ہمیں قرآن اور حدیث میں جو صفات الٰہیہ بتائی گئی ہیں۔ وہ وہ صفات ہیں کہ جو اس دنیا میں انسان سے تعلق رکھتی ہیں۔ انکے علاوہ اور ایسی صفات ہو سکتی ہیں جو ملائکہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا ہم سے تعلق تو رکھتی ہیں۔ لیکن بہشت میں۔ اور اس دنیا کی زندگی سے انکا کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ ان کو ہم یہاں سمجھ سکتے تھے +

خدا کی اور صفات ہونے کا ثبوت

کوئی کہے یہ تو خیال ہی ہے۔ ہمیں کس طرح یقین ہو سکتا ہے کہ خدا کی اور صفات بھی ہیں؟ میں کہتا ہوں جس سے خدا کی ان صفات کا پتہ لگا جو ہمیں معلوم ہیں، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ خدا کی اور صفات بھی ہیں۔ اور وہ ذات بابرکات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہیں۔ آپ کی ایک دعا ہے اللھم انی اسئلك باسم سمیت به نفسك او انزلته فی کتابك او علمته احدا من خلقك او استأثرت به فی علم الغیب عندك اے خدا میں تجھ سے دعا مانگتا ہوں ان ناموں کے ذریعے سے جو تو نے آپ اپنے لئے تجویز فرمائے ہیں، یا جو نام کہ تو نے اپنے کلام میں نازل فرمائے ہیں یا جو تو نے اپنی کسی مخلوق کو سکھائے ہیں، یا جو تو نے اپنی ذات میں ہی مخفی رکھے۔ اور کسیکو ان کا علم

نہیں دیا +

کتنی لمبی صفات چلی گئیں اور کتنی زبردست دعا ہے۔ اور یہ اسی کے ذہن میں آسکتی ہے جسے معرفت کامل حاصل ہو۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خدا تعالیٰ کے ان ناموں سے بھی جو معلوم نہیں ان سے فائدہ اُٹھا لیا ہے۔ اور انکا واسطہ دیکر خدا تعالیٰ سے دعا مانگی ہو۔ اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نام یعنی صفات اور بھی ہیں جو ہمکو معلوم نہیں۔ اور ہمکو کیا نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی معلوم نہ تھے۔ اور نہ کسی اور مخلوق کو معلوم ہیں۔ ہمیں جو خدا کی صفات معلوم ہیں یہ صرف وہ ہیں جو ہمارے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ ان سے زیادہ ہمارے ساتھ اس دنیا میں تعلق رکھنے والی صفات نہیں۔ ورنہ اگر ایک بھی ایسی صفت باقی ہے جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہے اور ہمیں معلوم نہیں تو خاتم النبیین ابھی آنیوالا ہے۔ مگر خاتم النبیین چونکہ آگیا ہے۔ اسلئے خدا تعالیٰ کی وہ تمام صفات جو اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں وہ سب اسنے بیان کردی ہیں +

مسلمانوں کا خیال ہے کہ خدا تعالےٰ کی ۹۹ صفات ہیں جو انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر اُنہوں نے ایک حدیث سے دھوکہ کھایا ہے جس کا مطلب اور ہے۔ درحقیقت اس دنیا میں تعلق رکھنے والی صفات بھی بہت سی ہیں جنمیں سے بعض ظاہر الفاظ میں اور بعض اشارت میں کلام الٰہی میں بیان ہوئی ہیں +

وحدت وجود اس جگہ ایک اور بات بھی میں بیان کرنی چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفت احدیت اور خالقیت یعنی خدا کا ایک ہونا اور کوئی شریک نہونا اور خالق نہ ہوان امور کو مدنظر رکھکر بعض لوگوں نے بعض شبہات پیدا کئے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں۔ اور افسوس کہ مسلمانوں میں سے بھی بعض اس خیال میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کہ خدا کا ایک ہونا اس کی صفات کے لحاظ سے یا الوہیت کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ہر طریق سے ہے۔ اسلئے وہ کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں خدا ہی خدا ہے اور کچھ نہیں۔ انکے اس خیال کو فلسفہ کے اس مسئلہ سے بھی تقویت ملگئی ہے کہ مادہ مادہ سے ہی پیدا ہو سکتا ہے جو چیز نہ ہو وہ وجود میں نہیں آسکتی۔ چونکہ وحدت وجود کا خیال ہمارے ملک میں عام ہے خصوصاً فقرا اکثر اس مرض میں مبتلا ہیں اسلئے اس

خیال کی بیہودگی کو خوب سمجھ لینا چاہئے۔ جہاں بھی فقیر ہمارے ملک میں پائے جائینگے وہاں انکا فقرہ اللہ ہی اللہ ہے اور سب کچھ اللہ ہی ہے۔ بھی سنائی دیگا۔ وہ کہتے ہیں جب خدا ایک ہے۔ تو اگر کوئی دوسرا وجود مانا جائے۔ تو دو ہو گئے۔ اور خدا کی یکتائی باقی نہ رہی۔ مخلوق کی مثال وہ دریا سے دیتے ہیں جسپر حباب تیر رہے ہوں جسطرح وہ حباب الگ وجود نظر آتے ہیں مگر درحقیقت الگ وجود نہیں ہوتا اسیطرح کہتے ہیں کہ گو وہ مختلف شکلیں نظر آتی ہیں مگر درحقیقت خدا کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس طرح حباب پانی کی ہی ایک شکل ہے۔ اسی طرح دنیا میں جو کچھ ہے یہ بھی خدا ہی کی ایک شکل ہے مگر اس قسم کی مثالیں بالکل باطل ہیں۔ مثلاً یہی حباب والی مثال لیلو۔ حباب کیا ہے۔ پانی میں ہوا داخل ہوکر حباب بنگیا۔ اسی طرح مخلوق کی مثال حباب کی سی ہے تو یہاں بھی خدا کے سوا کوئی اور وجود ماننا پڑیگا جو ہوا کی طرح خدا میں داخل ہوکر اسکی مختلف شکلیں بنا دیتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک الخرافات *

بہرحال ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ درصل چیز ایک ہی ہے آگے اس کی شکلیں مختلف ہیں اسکے لئے انہوں نے مذہبی دلیلیں بھی بنا رکھی ہیں۔ مثلاً وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ لا الہ الا اللہ کے معنے ہیں۔ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہزاروں لاکھوں وجودوں کی عبادت کیجاتی ہے تو کیا کلمۂ شریفہ میں یہ دعویٰ جھوٹا کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ پس کلمہ شریفہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے سوا جن چیزوں کی پرستش کیجاتی ہے وہ بھی خدا کا ہی جزو ہیں اسلئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ خواہ جس کی بھی پرستش کرو آخر پرستش تو اللہ کی ہی ہے۔ کیونکہ اسکے سوا کوئی اور وجود ہی نہیں جب اسکے سوا کوئی وجود ہی نہیں تو اسکے سوا کوئی معبود بھی نہیں ہے*

قرآن کریم کی آیت اجعل الالٰھۃ الٰھا واحدًا سے بھی یہ لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ خدا کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ کفار نے کلمہ شریفہ کے معنے یہی سمجھے ہیں کہ جنکی تم عبادت کرتے ہو وہ خدا کا غیر نہیں ہیں بلکہ خدا کا جزو ہیں۔ تبھی وہ کہتے ہیں کہ اسنے تو اتنے معبودوں کو ایک ہی معبود بنا دیا اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ چونکہ کفار جو عربی کے ماہر تھے کلمہ شریفہ کے یہی معنے سمجھتے ہیں اور قرآن کریم نے اس کا رد بھی نہیں کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو معنے

انہوں نے کلمۂ شریفہ کیطرف منسوب کئے ہیں ان کو صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے +

تیسری دلیل یہ لوگ آیت نحن اقرب الیہ من حبل الورید سے پیش کرتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم رگ جان سے بھی انسان کے زیادہ قریب ہیں۔ اب کیسطرح ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر وجود رگ جان سے زیادہ قریب ہو پس اسکے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم خدا کا جزو ہیں کیونکہ وجود مطلق وجود مقید سے زیادہ قریب ہوتا ہے +

چوتھی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے کہ ھو الاول والآخر والظاھر والباطن۔ پس جب خدا ہی اول ہے وہی آخر وہی اندر وہی باہر تو اور کیا چیز باقی رہی؟ +

ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں آیا ہے للہ یسجد من فی السمٰوت والارض زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے خدا کو ہی سجدہ کر رہا ہے۔ اب اگر خدا کے سوا دنیا میں کچھ اور بھی ہے تو پھر یہ غلط بات ہو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اور وجودوں کو بھی سجدہ کرتے ہیں۔ اگر بت خدا نہیں تو معلوم ہوا کہ خدا کے سوا اور کو بھی سجدہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ آیت درست نہیں رہتی اسلئے معلوم ہوا کہ وہ بھی خدا ہی ہیں +

اگر کہا جائے کہ اگر یہ درست ہے تو پھر شرک کیا چیز ہے اور کیوں لوگوں کو دوسری چیزوں کے آگے سجدہ کرنے سے روکا جاتا ہے تو وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ باوجود اسکے کہ سب کچھ خدا ہی ہے پھر بھی بعض مظاہر کی پرستش شرک ہی کہلائیگی۔ کیونکہ جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں وہ انہیں خدا سمجھکر نہیں کرتے۔ بلکہ خدا کے قائم مقام سمجھکر کرتے ہیں۔ پس چونکہ وہ یہ خیال کرتے ہوئے ان کو سجدہ کرتے ہیں کہ یہ خدا نہیں ہیں اسلئے ان کا یہ فعل شرک ہے۔

ہر چیز کو اللہ کہنے والوں کے دلائل کا رد

اب میں ان لوگوں کے دلائل کا رد بیان کرتا ہوں۔ اوّل لا الٰہ الا اللہ کے وہ معنے جو یہ لوگ کرتے ہیں بالکل غلط ہیں الٰہ کے معنے انہوں نے زبردستی سے کر لئے ہیں، اور پھر ان پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھدی ہے۔ حالانکہ عربی میں اس لفظ کے دو معنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی معبود ہو سچا ہو یا جھوٹا۔ دوسرے یہ کہ وہ معبود جو سچا ہو۔ جھوٹا نہ ہو۔ قرآن کریم میں ان دونوں معنوں میں

یہ لفظ استعمال ہوا ہے مگر انہوں نے یہ معنی لے لئے ہیں کہ کوئی جھوٹا معبود بھی نہیں حالانکہ جب قرآن کریم میں دوسری جگہوں پر صاف بیان ہے کہ لوگ خدا کے سوا اور معبودوں کی پرستش کرتے ہیں تو الٰہ کے معنے سچے معبود کے سوا جائز ہی نہیں۔ کیونکہ صحیح معنی وہی ہوتے ہیں جو بولنے والے کے منشاء کے مطابق ہوں۔ اب جب اللہ تعالیٰ دوسری جگہونمیں صاف الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ اسکے سوا بھی لوگ دوسروں کی پوجا کرتے ہیں تو لا الٰہ الا اللہ کے یہ معنی نہیں کئے جا سکتے کہ اسکے سوا نہ کوئی جھوٹا معبود ہے نہ سچا بلکہ اسکے یہی معنے کئے جائینگے کہ اسکے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ اور ان معنوں سے ہرگز وحدت وجود کا مسئلہ نہیں نکلتا +

اب کوئی کہے کہ جب اس لفظ کے دو معنی تھے تو وہی کیوں نہ مانے جائیں۔ جو وحدت وجودی کرتے ہیں۔ اور کیا اس طرح وہ کلمہ جس پر اسلام کی ساری بنیاد ہے مشتبہ نہیں ہو جاتا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ ایک لفظ کے مختلف معنی دیکھکر ہر جگہ پر اسکے تمام معنوں کو استعمال کرنا درست نہیں ہوتا۔ آخر قرآن کریم عربی زبان میں ہے اس زبان کے قواعد کے مطابق ہم فیصلہ کرینگے اور یہ بات کہ ہر لفظ کے ہر معنی ہر جملے میں استعمال نہیں ہوتے۔ عربی زبان سے ہی خاص نہیں سب زبانوں کا یہ قاعدہ ہے کہ لفظ کے خواہ کتنے ہی معنے ہوں جب وہ عبارت میں آجائے تو اسکے وہی معنے کئے جاتے ہیں جو اس فقرے کے مضمون سے یا اس کتاب کی دوسری جگہوں کے مفہوم سے نکلتے ہوں نہ کہ تمام معنے جو اس لفظ کے لغت میں نکلتے ہوں۔ اب چونکہ یہ ثابت ہی کہ قرآن کریم اس کا بار بار ذکر فرماتا ہے کہ مشرک خدا کے سوا اوروں کی پوجا کرتے ہیں تو جب وہ یہ فرماتا ہی کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو ان دوسری آیتوں سے ملاکر اسکے یہی معنی ہونگے کہ خدا کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور جب دوسری عبارتوں سے ملکر کلمہ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں تو شک و شبہ کا سوال اُٹھ گیا +

دوسری آیت یعنی اجعل الالھۃ الٰھًا واحدًا کے بھی وہ معنے نہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں بلکہ یہ ہیں کہ اسنے ساری معبودان باطلہ کو مٹا کر ان کی جگہ ایک معبود قرار دیدیا ہے یہاں جعل بمعنی قرار دینا ہیں۔ ورنہ اگر لفظی معنے ہی لئے جائینگے تو یہ ہوگا کہ ان کو کوٹ کوٹ کر ایک

بنا لیا ہے لیکن یہ نہ تو وہ لیتے ہیں اور نہ ہم۔ اسلئے جعل کے یہی معنے ہونگے کہ بہت سے معبود تھے ان سب کو مٹا کر اسنے ایک قرار دیدیا +

ایسے ہی تیسری آیت نحن اقرب الیہ من حبل الورید اسکے جو معنی ہمہ اوست والے کرتے ہیں وہ بنتے ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں مقید سے مطلق زیادہ قریب ہوتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کس کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ مقید کی اپنی ذات کی نسبت مطلق اسکے زیادہ قریب کیونکر ہو سکتا ہے۔ پس جب غیر کوئی ہے ہی نہیں تو مطلق و مقید کی بحث یہاں پیدا ہوتی ہی نہیں۔ مقید و مطلق تو غیر کو فرض کر کے بنتے ہیں۔ جب چیز ہی ایک ہے تو مقید کو قید کس نے کیا ؟۔

یہ ساری آیت یوں ہے۔ ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (۵۰-۱۵) اور یقیناً ہمنے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور ہمیں پتہ ہے کہ اسکے دل میں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ مگر اسے معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ ہمنے اسے پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا۔ بلکہ ہم حبل الورید سے بھی اسکے زیادہ قریب ہیں +

حبل الورید کے معنی اس رگ کے ہیں جو دل سے دماغ کیطرف خون پہنچاتی ہے اور طب سے پتہ لگتا ہے کہ دماغ کبھی کام نہیں کر سکتا۔ جب تک اسے خون نہ پہنچے۔ تو گویا دماغ کا کام بھی رگ جان کی امداد پر منحصر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زندگی کے ساتھ خیالات اور خیالات کے ساتھ وساوس لگے ہوئے ہیں اور بے شک یہ انسان کے راستہ میں روک بنتے ہیں۔ مگر رگ جان سے بھی انسان کے زیادہ قریب ہیں کہ رگ جان کٹے تو مرتے مرتے انسان کو پھر بھی چند سیکنڈ لگینگے لیکن ہماری مدد بند ہو تو انسان کی تباہی پر کوئی وقت بھی نہ لگے۔ پس کیوں انسان ایسے وساوس اور شبہات کے وقتوں میں ہماری طرف توجہ نہیں کرتا کہ ہم اسکے وسوسوں کو اور شبہوں کو دور کریں۔ کیا وہ باوجود اسکے کہ اس کا ذرہ ذرہ ہمارے قبضہ میں ہے یہ خیال کرتا ہے کہ اسکے وساوس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ حالانکہ وساوس و خیالات زندگی کا ایک شعبہ ہیں اور زندگی خود ہمارے ذریعہ سے ہی پس اسکی مشکلات کو حل کرنا بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے +

غرض حبل الورید ہر جگہ انسان کی زندگی کے سہارے کے معنے میں آیا ہے۔ مگر اسکے غلط معنے لیکر کچھ کا کچھ بنا دیا گیا ہے۔

اور یہ جوان کی دلیل ہے کہ ھو الاول والآخر والظاہر والباطن وہی شروع ہے اور وہی آخر اور وہی اندر ہے اور وہی باہر ہے۔ اس سے یہ استدلال ہوتا ہے کہ سب جگہ خدا ہی خدا ہے۔ یہ دلیل بھی بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اول اور آخر اور ظاہر اور باطن چاروں الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ اگر غیر کوئی ہے ہی نہیں تو پھر اول کہنے اور آخر کہنے کی کیا ضرورت تھی اور ظاہر کہنے اور باطن کہنے کی کیا ضرورت تھی پھر تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ وہی وہ ہے اور کچھ نہیں۔ اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ خدا تعالیٰ محیط ہے۔ یہ نہیں کہ سب کچھ اللہ ہی اللہ ہے۔ اندر اور باہر کے الفاظ بھی اور اول اور آخر کے الفاظ بھی احاطہ پر دلالت کرتے ہیں۔ پس یہ آیت یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کے ساتھ تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

آیت للہ یسجد من فی السمٰوٰت والارض کے معنے یہ ہیں کہ ہر چیز خدا کی فرمانبرداری کر رہی ہے۔ سجدہ کے اصل معنی فرمانبرداری کے ہیں اور زمین پر سر رکھنے کے معنے مجازاً بنتے ہیں اور فرمانبرداری کے لحاظ سے کوئی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے باہر ہے۔ دنیا کا ایک ذرہ ذرہ خدا کی فرمانبرداری کر رہا ہے۔ مثلاً زبان ہے۔ اسے اگر میٹھا دو گے تو میٹھا چکھیگی۔ اگر کڑوا دو گے تو کڑوا چکھیگی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خدا کا انکار کر دے۔ مگر جو کام خدا نے اس کا مقرر کیا ہے اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ اور اس میں نافرمانی نہیں کر سکتی باقی رہا یہ کہ انسان خدا کی نافرمانی بھی کرتا ہے سو سوال یہ ہے کہ کس جگہ نافرمانی کرتا ہے ہیں جہاں خدا نے اسے مقدرت دیکر امتحان کی غرض سے آزاد چھوڑ دیا۔ پس جس امر میں خدا تعالیٰ نے خود انسان کو مقدرت دیکر امتحان کے طور پر آزاد کیا ہے انسان کی اس نافرمانی کی وجہ سے ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ کوئی چیز خدا کی فرمانبرداری سے باہر ہے۔ کیا ابوجہل اور فرعون خدا کے بنائے ہوئے قانون قدرت کی فرمانبرداری کرتے تھے کہ نہیں؟ اگر کرتے تھے تو سب خدا کے فرمانبردار ہیں۔

یہ لوگ ھو السمیع البصیر سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا ہی سنتا اور دیکھتا ہے تو معلوم ہوا کہ سب کچھ خدا ہی خدا ہے۔ کیونکہ سنتے اور دیکھتے ہم بھی ہیں۔ اگر ہم خدا نہیں تو یہ آیت غلط ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس آیت سے بھی یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کیونکہ جو چیز کسی کو دی ہوئی ہو۔ وہ دراصل اسی کی ہوتی ہے۔ پس جب نظر خدا کی دی ہوئی ہے جس سے ہم دیکھتے ہیں۔ اور سننے کی طاقت بھی اسی کی دی ہوئی ہے جس سے ہم سنتے ہیں۔ تو خدا ہی سنتا اور دیکھتا ہے۔

تائیدی آیات قرآنی پھر اس کے مقابلہ میں ہم دوسری آیات دیکھتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کی یہ سب باتیں غلط ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنی ہستی کے متعلق فرماتا ہے۔ لیس کمثلہ شئ کہ اس جیسی کوئی اور ہستی نہیں۔ کوئی چیز خدا کے مشابہ نہیں۔ ہم کہتے ہیں اگر کوئی چیز ہی دنیا میں نہیں۔ بلکہ سب کچھ خدا ہی خدا ہے۔ تو لیس کمثلہ شئ کا کیا مطلب ہوا؟ وحدت الوجود والے کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں کوئی چیز نہیں سب کچھ ایک ہی ہے۔ ہم کہتے ہیں جب ایک ہی ہے تو یہ کہنے کا کیا مطلب کہ خدا جیسی کوئی چیز نہیں۔

دوسری آیت یہ ہے۔ انھم عدو لی الا اللہ۔ خدا کے سوا جو معبود سمجھے جاتے ہیں وہ سب میرے دشمن ہیں کیونکہ ہیں انکا مخالف ہوں۔ اب اگر معبودان باطلہ بھی واقعہ میں اللہ تھے تو اسکے یہ معنے ہوئے۔ کہ مقید شکل میں تو وہ دشمن ہیں۔ اور مطلق میں دوست تھے۔ مگر یہ معنے بالبداہت باطل ہیں۔

تیسری آیت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے سوا بھی اور چیزیں ہیں۔ یہ ہے قل افغیر اللہ تأمرونی اعبد ایھا الجاھلون۔ اے جاہلو کیا تم خدا کے سوا دوسری چیزوں کی عبادت کیلئے مجھے کہتے ہو؟ اس آیت میں ان وجودوں کو جنہیں بت پرست پوجتے تھے غیر اللہ کہا گیا ہے

چوتھی آیت یہ ہے کہ لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم۔ کہ ان معبودوں کو جنکی یہ خدا کے سوا پرستش کرتے ہیں گالیاں نہ دو ورنہ یہ لوگ خدا تعالےٰ کو دشمنی کے جذبات کے ماتحت جہالت و نادانی سے گالیاں دینے لگ جائینگے۔

اب ہم پوچھتے ہیں۔ اگر وہ بھی خدا ہی ہیں تو من دون اللہ کیوں کہا؟ اور اگر کہو کہ

چونکہ مشرک ان کو من دون اللہ کہتے تھے اسلئے ان کو ان کی عقیدہ کے ماتحت من دون اللہ کہا گیا ہے۔ تو پھر یہ سوال ہے کہ بہت اچھا من دون اللہ تو ان لوگوں کے عقیدہ کیوجہ سے کہا مگر پھر یہ کیوں فرمایا کہ ان معبودوں کو گالیاں نہ دو ورنہ وہ خدا کو گالیاں دینے لگ جائینگے یہ کیوں نہ کہا کہ ان معبودوں کو گالیاں نہ دو کیونکہ وہ بھی درحقیقت خدا ہی ہیں مگر یہ نادان مشرک ان کو من دون اللہ سمجھکر ان کی پرستش کر رہے ہیں کیونکہ خدا کے کسی حصہ کو اسلئے گالی دینا منع نہیں کہ کوئی مطلق خدا کو گالی دینے لگیگا بلکہ اسلئے منع ہے کہ وہ خدا ہے +

کیا ہر چیز کو خدا ماننے والونکا ایمان کامل ہوتا ہے؟

پھر وہ کہتے ہیں کہ سوائے ہمارے کسی کو ایمان کامل حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایمان بغیر لقا کے مکمل نہیں ہوسکتا۔ مگر تم خدا کو وراء الوریٰ کہکر اس کا ایسا نقشہ کھینچتے ہو کہ اس کا تصور نہیں آسکتا مگر ہم اسکو محسوسات اور مشہودات میں دیکھتے ہیں۔ اسلئے ہمارا ایمان کامل ہے۔

ہم کہتے ہیں۔ اگر اس طرح تمہارا ایمان کامل ہوتا ہے۔ تو تم سے زیادہ بُت پرست کامل ایمان رکھتے ہیں۔ کہ وہ عین چیز کو سامنے رکھکر اس کی عبادت شروع کرتے ہیں۔ اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ خدا کا تصور قائم کرنے کیلئے اس طرح کرتے ہیں +

اگر کہو کہ وہ غیر اللہ سمجھتے ہیں۔ اسلئے ان کا فعل جائز نہیں تو ہم کہتے ہیں کہ تم عین اللہ سمجھکر ان چیزونکی پرستش کیوں نہیں کرتے۔ تاکہ لقاء زیادہ کامل ہوجائے +

دوسرا جواب یہ ہے۔ کہ ایمان کیلئے تصور کی ضرورت نہیں۔ تصور کے معنے تو صورت کو ذہن میں لانیکے ہیں اور خدا تعالےٰ کی کوئی صورت نہیں اور اگر اسکے معنی صفات کو یاد کرنا کرو تو جو وحدت وجود کے قائل ہیں وہ بھی اس قسم کا تصور کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں اور یہ تصور حضور قلب کے لئے کافی ہوتا ہے۔ دیکھو بجلی نظر نہیں آتی اب بجلی کا لفظ جب بولتے ہیں تو اسکے ظہور ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں۔ مگر کیا ان ظہوروں کا ذہن میں آنا کافی نہیں ہوتا ؟۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ تصور کا لفظ ان لوگوں کی ایجاد ہے۔ خدا تعالےٰ نے کہاں کہا ہے کہ مجھے تصور میں لاؤ۔ خدا نے تو یہ کہا ہے۔ کہ مجھے جانو اور میری معرفت حاصل کرو۔ میرا علم

حاصل کرو۔ اور یہ اسکی صفات سے ہو سکتا ہے +

تیسرا جواب یہ ہے کہ معرفت کے مختلف ذرائع ہیں۔ کبھی کسی چیز کی معرفت تصور سے ہوتی ہے کبھی اسکے آثار کے تصور سے کبھی مشابہ کیفیات کے تصور سے جیسے اپنے غصے پر قیاس کر کے ہم دوسروں کے غصہ کو سمجھ جاتے ہیں۔ اور کبھی معرفت قبل از وقت سنی ہوئی تعریف کو یاد کر کے حاصل ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی معرفت بھی پچھلے تین ذرائع سے ہوتی ہے +

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت جو کچھ بندہ کو معلوم ہوتا ہے اور اسپر جو ایمان اسے حاصل ہوتا ہے اسکی وجہ سے اس کا ذکر آتے ہی صفات الٰہیہ کی یاد اسکے دل میں ایسا ہیجان پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کیطرف کھنچتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی شخص سے کوئی پوچھے کہ اللہ کون ہے؟ تو وہ یہی کریگا کہ اس کی صفات گن دے۔ کہدے کہ وہ رحمٰن ہے رحیم ہے۔ رؤف ہے رخالق ہے۔ مالک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات کا صحیح تصور اس کی صفات ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ بندہ کو اس سے تعلق اسکی صفات ہی کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ دوسری اشیاء کو دیکھکر اصل خیال انہی کا ہوگا نہ کہ خدا کا۔ ہم کس طرح تسلیم کرلیں کہ رحمٰن کے لفظ پر غور کر کے یا خدا کی رحمت کے نشانوں پر غور کر کے تو ہمارے دلمیں حقیقی جذبۂ محبت پیدا نہ ہو لیکن کدو دیکھکر بجائے کدو کے خیال کے خدا تعالےٰ کا خیال پیدا ہو جائے +

کیا ہر چیز کو خدا نہ ماننے سے روئیت الٰہی نہیں ہو سکتی؟

وحدت وجود کے قائل یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہر چیز کو خدا نہ مانا جائے تو پھر روئت الٰہی کا انکار ہو جائیگا۔ کیونکہ وحدت شہود کے عقیدہ کے رو سے رویت محال ہے۔ حالانکہ رویت الٰہی کے سب ائمہ معتقد ہیں۔

مگر میں یہ کہتا ہوں کہ یہ خیال بالکل باطل ہے۔ رویت کا اس عقیدہ سے کچھ بھی تعلق نہیں باوجود خدا تعالیٰ کی ذات کو وراء الوراء ماننے کے پھر بھی رویت ممکن ہے اور ہوتی ہے۔ رویت یا قلبی ہوتی ہے یا صفات الٰہی کی جلوہ گری کو دیکھکر یا اس کی صفات کو اپنے اندر جذب کر کے ہوتی ہے اور ان سب صورتوں میں ہرگز یہ ضروری نہیں کہ ہر ذرہ کو خدا سمجھا جائے +

اگر کہا جائے کہ وحدت وجود والوں کی رویت اعلیٰ ہوگی کیونکہ قلب سے بھی اور آنکھ سے بھی تو میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ایک وسوسہ ہے کیونکہ اگر دنیا کو دیکھکر خدا کی روئیت ہو جاتی ہے تو ہمیں

کمال کیا ہے یہ رویت تو چوروں اور ڈاکوؤں کو بھی ہوتی ہے۔ کیا دیدار الٰہی ایسی حقیر چیز ہے کہ دلمیں یہ خیال کر لینا کہ سب کچھ خدا ہے ہمارے لئے کافی ہوتا ہے۔ بس پھر دنیا کی ہر چیز کو دیکھکر ہمیں رویت الٰہی ہوتی رہتی ہے +

وحدت الوجود کا مسئلہ کہاں سے پیدا ہوا؟

اب میں اس سوال کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ پیدا کہاں سے ہوا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ باقی تو سب ڈھکوسلے ہیں۔ یہ شبہ فلسفہ کے اس مسئلہ کیوجہ سے ہوا ہے کہ نیست سے ہست کیونکر ہو گیا؟ جو لوگ اس سوال کا جواب نہ دے سکے انہوں نے اس طریق کو اختیار کر لیا کہ دنیا میں سب کچھ خدا ہی خدا ہے اور یہ عقیدہ بنا کر اُنہوں نے صوفیا کے کلام کے اس قسم کے فقرات کو آڑ بنا لیا۔ کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب خدا ہی خدا ہے۔ اور سب کچھ خدا کا ہی جلوہ ہے۔ حالانکہ محی الدین ابن عربی جنکو اس خیال کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی کتب میں بھی غیر اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح اس مسئلہ کے قائل نہ تھے۔ دراصل یہ ہوکہ ہے جو صوفیاء کے کلام کے متعلق دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جس اعلیٰ درجہ کے صوفی کے کلام کو بھی دیکھا جائے یہی علوم ہوگا کہ اس قسم کا کلام تشبیہی ہوتا ہے۔ ورنہ اصل بات یہی ہے کہ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ خدا اور ہے اور ہم اور +

وحدت شہود کا عقیدہ

وحدت وجود کے مقابلہ میں وحدت شہود کا عقیدہ ہے اس عقیدے کے ماننے والے کئی فرقوں میں منقسم ہیں۔ اول وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ خدا اور ہے اور مخلوق اور ہے اور خدا مجسم ہے محدود ہے۔ عرش پر بیٹھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کو ایسا ماننے میں حرج ہی کیا ہے؟ اگر پوچھا جائے کہ کیا خدا کے بھی ہاتھ پاؤں ہیں؟ تو کہتے ہیں ہاں ہیں۔ مگر انسانوں کی نسبت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ خدا مجسم ہے۔ اور ان کو مجسمیہ کہتے ہیں +

دوسرا فرقہ

(۲) ایک اور لوگ ہیں۔ جو اہلحدیث کہلاتے ہیں۔ یا وہ جو علوم کو زیادہ تر ظاہر کی طرف لیگئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ خدا وراء الورٰی ہستی ہے۔ جس نے دنیا کو پیدا کیا ہے۔ اور دنیا اس سے علیحدہ چیز ہے۔ لیکن باوجود وراء الورٰی ہونے کے ہم کہتے ہیں کہ وہ عرش پر

بیٹھا ہے اسکے ہاتھ بھی ہیں اور پاؤں بھی ہیں گو ہم اسے مجسم نہیں مانتے لیکن ہم جائز نہیں سمجھتے کہ جو صفات اس کی قرآن کریم میں آئی ہیں یا حدیثوں میں مروی ہیں انکی کوئی تاویل کی جائے۔

تیسرا فرقہ تیسرا فرقہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ وراء الوریٰ ہے ہم اسکے متعلق صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ وہ مخلوق سے بالکل الگ ہے اور یہ اس کی صفات مخلوق کی صفات سے اور طرح کی ہیں ہاتھ وغیرہ کے جو لفظ استعمال ہوئے ہیں یہ سب تشبیہات ہیں مخلوق کیا ہے اس کی نسبت بھی یہی کہہ سکتے ہیں کہ اسے خدا نے پیدا کیا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس طرح پیدا کیا ہے۔ میرے نزدیک عوام الناس کے لئے اس سے زیادہ محفوظ عقیدہ نہیں ہو سکتا

چوتھا فرقہ چونکہ تیسرے فرقے کا جو عقیدہ بتایا گیا ہے گو اپنے ایمان کیلئے کافی ہو سکتا ہے مگر مخالفوں کے حملوں کے جواب میں کچھ نہ کچھ جواب اثباتی پہلو سے بھی دینا پڑتا ہے اسلئے محققین نے پیدائش عالم کے متعلق اور زیادہ وضاحت کی ہے اور آخر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عدم کے آئینہ پر اپنی صفات کا انعکاس ڈالا اور اس سے مخلوق پیدا ہوئی۔ اس گروہ نے بہت حد تک الحاد کو دور کیا ہے مگر اس پر بھی یہ اعتراض پڑتا ہے کہ انعکاس کسی چیز پر ہوتا ہے عدم کوئی چیز نہیں جس پر انعکاس ہو۔ اس عقیدہ کے پیش کرنے والے بڑے پایہ کے لوگ ہیں معلوم ہوتا ہے ان پر حقیقت کھلی ہے مگر یا اسے بیان نہیں کر سکے یا اسے استعارہ میں مخفی کر دیا ہے۔

پانچواں عقیدہ پانچواں عقیدہ یہ ہے کہ دنیا خدا کا غیر ہے لیکن اسکی غیریت اس قسم کی نہیں جس قسم کی کہ انسانی ذہن میں آیا کرتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہے یہ خدا تعالیٰ کے علم اور اسکے ارادہ سے پیدا ہوا ہے نہ نیست سے ہوا ہے کہ نیست کوئی چیز نہیں اور نہ ہست سے ہوا ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی چیز قائم بالذات نہیں بلکہ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے خدا تعالیٰ نے کہا کہ اس قسم کی چیز جو اسکے علم میں تھی ظاہر ہو جائے پس اسکی قضاء نے اسے متمثل کر دیا پس جو کچھ بھی دنیا میں ہے یہ سب متمثلات ہیں جو علم الٰہی کے مطابق قضاء الٰہی سے ظاہر ہوئے۔ باقی رہی پوری کیفیت سو کوئی چیز جب تک غیر حادث نہ ہو اپنی پوری کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی پس انسان کا یہ خیال کہ وہ اس حقیقت کو پوری طرح پالیگا ایک خواہش ہے جو کبھی پوری نہیں ہو سکتی

پہلے عدم تھا پھر مخلوق پیدا ہوئی

اصل میں ساری شبہات اس بات سے پیدا ہوتے ہیں کہ عدم سے وجود کس طرح ہو جاتا ہے۔ مگر کہیں قرآن کریم میں یہ نہیں لکھا کہ عدم سے وجود ہو گیا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں نہ تھیں اور پھر پیدا ہو گئیں۔ عدم سے پیدا ہو گئیں، یہ ایک فقرہ ہے جس سے دھوکا لگتا ہے حالانکہ جو لوگ واقف ہیں وہ کبھی اس کے یہ معنے نہیں لیتے کہ عدم سے گھڑ کر وجود بنا بلکہ ان کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ پہلے نہ تھیں پھر ہو گئیں۔

آریہ مذہب بھی اسی دھوکے کا شکار ہو رہا ہے کہ جب مادہ نہیں تھا تو خدا نے مخلوق کو پیدا کس طرح کیا۔ اسلئے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ نے مادہ کو پیدا نہیں کیا۔ مگر یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ خدا تعالیٰ کی صفات کا بندوں کی صفات پر قیاس کرنا ہی غلط ہے۔ کوئی انسان بغیر آنکھ کے نہیں دیکھ سکتا۔ خدا تعالیٰ بغیر آنکھوں کے دیکھ سکتا ہے۔ کوئی چیز دنیا میں مادہ کے بغیر نہیں بن سکتی خدا تعالیٰ کی نسبت آریہ بھی مانتے ہیں کہ بغیر مادہ کے ہے۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ جب کوئی چیز کہیں رکھی ہوئی ہو تو وہ دوسری چیزوں کی راہ میں روک ہوتی ہے اور ان کے دائرہ کو محدود کر دیتی ہے۔ مگر باوجود اسکے کہ خدا تعالیٰ کے سوا روح اور مادہ کو بھی آریہ مانتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ کو محدود نہیں مانتے۔ ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے متعلق ہم ان قوانین کو جاری نہیں کر سکتے جو مادہ اور روح کی حالتوں پر قیاس کر کے ہماری عقل تجویز کرتی ہے۔ جب یہ بات ہے، تو یہ کس دلیل سے کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ مادہ کو پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی ذات ہماری عقلوں سے بالا ہے تو ہماری عقلوں کے ماتحت اسکے لئے قانون کس طرح بیان کئے جا سکتے ہیں۔

خدا تعالیٰ مادہ کا خالق ہے

یہ بات کہ خدا تعالیٰ مادہ کا خالق ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ انسانی قواعد اور انسانی طاقتوں کو مدنظر رکھکر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اسکے اور طریق ہیں اور میرے نزدیک وہ ایسے سہل ہیں کہ ان پڑھ آدمی بھی ان کے ذریعہ سے حق کو معلوم کر سکتے ہیں دیکھو جب کبھی کسی کھیت کی مینڈھ کے متعلق جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک کہتا ہے میری زمین کی اس جگہ پر حد ہے۔ اور دوسرا کہتا ہے یہاں نہیں وہاں ہے۔ تو اسکے فیصلہ کے لئے

حدود برآری کرایا کرتے ہیں۔ یہاں بھی مادہ کے متعلق جھگڑا پیدا ہوگیا کہ یہ آپ ہی آپ ہمیشہ سے ہے یا خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ اسکے متعلق بھی حدود برآری کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس طریق کے اختیار کرنیکی ضرورت ہے جو حدود برآری کے وقت استعمال کیا جاتا ہے زمین کی حدود براری کیلئے یہی کرتے ہیں کہ ایک مستقل جگہ منتخب کرتے ہیں۔ جو بدلنے والی نہو مثلاً پرانا کنواں یا پرانا درخت۔ کاغذات میں انکو جو جائے وقوع درج ہوگی اسے اصل قرار دیکر حد برآری کرینگے۔ اس کوئیں یا درخت کے آگے جس قدر زمین سرکاری کاغذات میں لکھی ہو اسکے مطابق ناپ لینگے پھر جس قدر زمین کسی کے قبضہ میں ثابت ہو اسے دیدینگے

اسی طرح صفات باری کے متعلق ہم غور کرسکتے ہیں یعنی ایسے امور کو لیکر جو مسلمہ ہیں ہم غور کریں کہ وہ مختلف فیہ مسئلہ کی کس شق کی تائید کرتے ہیں۔ جس خیال اور رائے کی مسلمہ امور تائید کریں وہی تسلیم کرنی ہوگی۔ کیونکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ جس رائے کی دوسرے امور تائید کریں وہ غلط ہو اور جس کی دوسرے امور تردید کریں وہ صحیح ہو۔ یہ اسی طرح ناممکن ہے کہ جسطرح یہ ناممکن ہے کہ مختلف درختوں سے پیمائش کے بعد جو جگہ کھیت کی ثابت ہو وہ غلط ہو اور محض خیالی اور وہمی مقام درست ہو +

اس مسئلہ میں جن مقامات کو ہم حدود براری کیلئے چن سکتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی دوسری صفات ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی وہ صفات جنکے متعلق آریہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسکے اندر پائی جاتی ہیں وہ اس امر کی تائید کریں کہ خدا تعالیٰ مادہ کا خالق ہے تو پھر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ مادہ کا خالق ہے۔ لیکن اگر وہ اس خیال کو رد کریں تو ماننا پڑیگا کہ وہ مادہ کا خالق نہیں ہے +

خدا کی صفت علیم مادہ کے مخلوق ہونے پر دلالت کرتی ہے

میں ان صفات میں سے جو میرے نزدیک اس سوال پر روشنی ڈالتی ہیں خدا تعالیٰ کی صفت علیم کو سب سے پہلے پیش کرتا ہوں۔ آریہ لوگ بھی خدا تعالےٰ کو اسی طرح علیم مانتے ہیں جس طرح کہ ہم مانتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو ہر اک بات کا علم ہے اور اس کا علم کامل ہے۔ پس خدا تعالےٰ کے خالق مادہ ہونے کے سوال کی صحیح حد برآری کرنے کیلئے علم کامل ایسی صفت ہے جسپر کامل طور پر یقین کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ دونوں فریق تسلیم کرتے ہیں کہ یہ غیر متبدل

مقام ہے اسکے حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اب اگر غور سے کام لیا جائے تو علم کامل کے معنے یہ ہیں کہ جس چیز کی نسبت علم کامل ہو اسکے بنانے کی بھی قابلیت ہو۔ چنانچہ سینکڑوں چیزیں جو پہلے طبعی قوانین کے ماتحت دنیا میں پیدا ہوتی تھیں ان کے متعلق یورپ والوں نے علم کامل حاصل کرکے ان کو بنانا شروع کر دیا ہے۔ نیل جسے پہلے بویا جاتا تھا جرمن والے اب اسے بنا رہے ہیں۔ عطر جو پہلے پھولوں سے بنائے جاتے تھے جرمن میں اب ان میں سے اکثر کیمیائی ترکیبوں سے بنائے جاتے ہیں۔ کیونکہ خوشبو جن ترکیبوں سے پیدا ہوتی ہے وہ جرمن والوں کو معلوم ہوگئی ہے۔ وہ مختلف ادویہ کو ملا کر جس پھول کی خوشبو چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں اسیطرح اور بہت سی چیزیں ہیں جو اب مصنوعی بننے لگ گئی ہیں۔ جیسے ریشم وغیرہ۔ غرض ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کو کسی چیز کا کامل علم ہو وہ اسکے بنانے پر بھی قادر ہوتا ہے۔ اس بات کے ثابت ہو جانیکے بعد اس میں کوئی بھی شبہ نہیں رہتا کہ اگر خدا تعالیٰ کو علم کامل ہے تو یقیناً وہ مادہ کے بنانے پر بھی قادر ہے اور اگر وہ مادے کے بنانے پر قادر نہیں تو اس کا علم بھی کامل نہیں۔ پس صفت علم جو ہمارے اور آریوں کی مسلمہ ہے وہ اسی امر کی تصدیق کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ کو مادہ پیدا کرنے پر قادر ہونا چاہیئے۔

صفت مالکیت سے مادہ کے مخلوق ہونیکا ثبوت

اب بھی اگر کسی کی تسلی نہ ہو تو پھر کسی اور صفت کو مستقل قرار دیکر پیمائش شروع کیجا سکتی ہے۔ میں اس غرض کیلئے خدا تعالیٰ کی صفت مالکیت کو لیتا ہوں۔ اس صفت کو ہم بھی مانتے ہیں۔ اور فریق مخالف بھی اب ہم دیکھتے ہیں کہ ملکیت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ ملکیت یا تو اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ کوئی شخص ورثہ سے کوئی چیز حاصل کرتا ہے یا کوئی اسے دیتا ہے یا وہ خریدتا ہے یا خود بناتا ہے یہی چار ذریعے ملکیت کے ہیں یعنی ورثہ۔ تحفہ۔ خرید اور خلق یا صنعت۔ خدا تعالیٰ جو مالک کہلاتا ہے تو کس لحاظ سے آیا اسے مادہ ورثہ میں ملا ہے یا اسے کسی نے تحفہ دیا ہے یا اس نے خریدا ہے یا بنایا ہے آریہ لوگ بھی اس امر کو تسلیم نہیں کرتے کہ پہلے تین ذریعوں سے خدا کو مادہ پر ملکیت حاصل ہوتی ہے اسلئے اگر وہ مالک ہو تو ماننا پڑیگا کہ اسے ملکیت پیدا کرنے کی سبب سے حاصل ہوئی ہے۔ اور اگر یہ ثابت نہیں ہے تو خدا تعالیٰ مادہ کا مالک نہیں ہو بلکہ نعوذ باللہ

غاصب ہے +

خدا تعالیٰ کی دیگر صفات سے مادہ کے مخلوق ہونیکا ثبوت

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات لیکر جب اس مسئلہ کو حل کیا جائے تو آخری نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ کہ مادہ مخلوق ہے۔ مثلاً خدا قادر ہے۔ آریہ لوگ بھی خدا کو قادر مانتے ہیں۔ اور ہم بھی۔ لیکن اگر خدا مادہ کو پیدا نہیں کر سکتا۔ تو اس کی قدرت کامل نہ ہوئی وہ کہتے ہیں کہ روح و مادہ کا جوڑنا خدا کی قدرت ہے۔ مگر ان کا بنانا اس سے بھی اعلیٰ قدرت ہے۔ اسلئے یہی درست ہے کہ خدا نے مادہ پیدا کیا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ خدا مہربان اور رحیم ہے۔ ہم بھی یہ مانتے ہیں۔ مگر ہم پوچھتے ہیں اگر خدا روح مادہ کا خالق نہیں۔ تو اس کا کیا حق ہے کہ روح اور مادے کو کسی سبب سے سزا دے جب وہ اپنے وجود میں اسکے محتاج ہی نہیں تو خدا تعالیٰ کا یہ بھی حق نہیں کہ ان کے لئے کوئی قانون بنائے اور جب اس کا یہ حق نہیں کہ ان کے لئے کوئی قانون بنائے تو اسے یہ بھی حق نہیں کہ اس قانون کے توڑنے پر انہیں کوئی سزا دے۔ جوڑنے جاڑنے سے ہرگز سزا دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ سزا کا حق تو بادشاہت سے حاصل ہوتا ہے اور وہ اسے حاصل نہیں۔ کیونکہ نہ اسنے روح و مادہ کو پیدا کیا نہ انہوں نے اپنا اختیار اس کے ہاتھ میں دیا۔ غرض روح و مادہ کو اگر مخلوق نہ مانا جائے تو خدا تعالیٰ رحیم نہیں بلکہ ظالم قرار پاتا ہے۔ لیکن چونکہ آریہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خدا رحیم ہے اسلئے ماننا پڑتا ہے کہ خدا تعالیٰ مادہ کا خالق ہے +

ان چاروں حدود سے مادہ کا مخلوق ہونا ثابت ہو گیا۔ اب بھی اگر کوئی کہے کہ خدا نے مادہ کو پیدا نہیں کیا تو یہی کہینگے کہ یہ خیال تمہاری سمجھ کے قصور سے پیدا ہوا ہے +

خدا تعالیٰ کی بعض صفات پر اعتراضات اور انکے جواب

اب میں چند موٹے موٹے اعتراضات جو صفات الٰہیہ پر کئے جاتے ہیں انہیں لیکر ان کے جواب دیتا ہوں۔ یہ اعتراضات زیادہ تر دہریوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں اور بعض فلسفیوں کی طرف سے جو گو خدا کے قائل ہیں مگر قادر و قدیر خدا کو ماننے سے گھبراتے ہیں۔

خدا تعالےٰ کی صفات رحمت پر اعتراض

پہلا اور اصولی سوال خدا تعالیٰ کی صفات رحمت پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ واقع میں انہی صفات رحمت کا مالک ہے جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں تو کیا سبب ہے کہ دنیا میں قسم قسم کی بلائیں اور تکالیف نظر آتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اسنے شیر، چیتے سانپ اور اسی قسم کے اور موذی جانور پیدا کئے ہیں؟

اہل یورپ کا جواب

یورپ والے تو اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ خدا کو جو کچھ مل سکا اس سے جو بہتر صورت بنی وہ اس نے بنا دی۔ اسمیں اس کا کیا قصور ہے۔ جیسا مادہ تھا ویسی چیز بنا دی۔ مادہ کا پیدا کرنا اسکے اختیار میں نہ تھا اسلئے اسنے جو اچھی سے اچھی صورت ہو سکتی تھی وہ بنا دی۔ گویا ان لوگوں نے اس اعتراض کو دور کرنیکے لئے خدا تعالیٰ کی قدرت کا ہی انکار کر دیا ہے۔ بعض اہل یورپ یہ جواب دیتے ہیں کہ ان بحثوں میں پڑنا فضول ہے۔ واقع یہ ہے کہ خدا کا رحم قانون قدرت میں نظر آتا ہے اسی طرح شیر و چیتے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ واقعات سب کے سامنے ہیں وجہ دریافت کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں +

اہل ہند کا جواب

اہل ہند نے اس سوال کو اس طرح حل کیا ہے کہ خدا نے شیر چیتے یونہی نہیں بنائے۔ جن روحوں سے قصور ہو گئے۔ ان کو بطور سزا کے ایسے جانور بنا دیا۔ اس سے خدا کے عدل اور رحم پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ ہر ایک چیز اپنے اپنے اعمال کی وجہ سے اچھی اور بری بنی ہے۔ اگر شیر بکری کو کھاتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے اگلے جنم میں بکری نے شیر کو کھایا ہوگا۔ یا کوئی اور قصور کیا ہوگا۔ گویا یورپ والوں اور ہندوؤں نے یہ مان لیا ہے کہ مخلوق میں ظلم نظر آ رہا ہے۔ آگے یورپ والوں نے کہدیا کہ خدا مجبور تھا جو کچھ اس سے بن سکا وہ اس نے بنا دیا۔ اور یہاں کے لوگوں نے کہدیا۔ خدا کیا کرتا۔ بندوں نے خود جو کچھ کیا۔ اسکا بدلہ پا رہے ہیں۔

حقیقی جواب

اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ دنیا میں دیکھو کوئی رحم بھی نظر آتا ہے۔ یا سب ظلم ہی ظلم ہے؟ اگر رحم نظر آتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ خدا رحیم ہے۔ باقی اگر ایسی چیزیں ہیں جو رحم کے نیچے نہیں آتیں تو ان کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ ان کا ہمیں علم نہیں۔ کہ رحم کے نیچے کس طرح آتی ہیں؟ کیونکہ دوسری صفات سے خدا کا رحیم ہونا ثابت ہے۔ اور جن سے

ثابت نہیں ان سے معلوم کرنا باقی ہے۔ اور عدم علم سے عدم شے لازم نہیں آتی +

دوسرا جواب یہ ہے جو خدا تعالیٰ نے قرآن میں دیا ہے۔ کہ ما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ما فرطنا فی الکتاب من شئ ثم الی ربھم یحشرون (انعام رکوع ۴) - خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ تم ہی تو مخلوق نہیں ہو اور بھی مخلوق ہے جس طرح تمہارے پیدا کرنے میں حکمت ہے۔ اسی طرح ان کے پیدا کرنے میں بھی حکمت ہے۔ اگر تمہارے لئے ان کو مسخر کر دیا گیا ہے۔ تو ان کے مسخر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ بلکہ ان کے وجود سے بھی بعض خدا کی خاص صفات کا ظہور ہو رہا ہے +

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ بعض چیزیں مفید نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ہمیں انکے فائدے معلوم نہیں ہوتے۔ اسلئے ان کو نقصان رساں سمجھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمنے ہر ایک چیز تمہارے فائدہ کیلئے پیدا کی ہے۔ اسلئے یہ کہنا درست نہیں کہ بعض چیزیں صرف ضرر رساں ہیں۔ دنیا کی کونسی چیز ہے جسکا صرف نفع ہی ہوتا ہے مگر باوجود اسکے بعض چیزوں کو اچھا کہا جاتا ہے۔ یہ ضرر رساں جانور بھی اپنے اندر فائدے رکھتے ہیں۔ سانپ کا زہر بیسیوں بیماریوں میں مفید ہے۔ شیر کی چربی بیسیوں بیماریوں میں مفید ہے۔ اسی طرح اور بہت سے موذی جانور ہیں جنکے بہت سے فوائد دریافت ہوئے ہیں اور ابھی اکثر حصہ پوشیدہ ہے۔ ابھی علوم چونکہ ابتدائی حالت میں ہیں اسلئے ان کی بنا پر یہ کہنا کہ فلاں چیز مضر ہے درست نہیں۔ بہت سی چیزیں پہلے بیفائدہ سمجھی جاتی تھیں اب مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ اسی طرح کئی چیزیں پہلے موذی خیال کیجاتی تھیں اب ان کے فوائد ظاہر ہو رہے ہیں۔ پس اپنے ناقص علم کیوجہ سے ان چیزوں کی نسبت کہنا کہ یہ صرف مضر ہیں۔ درست نہیں +

چوتھا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ رحیم ہے۔ مگر اپنے خزانوں کو حکمت کے ماتحت تقسیم کرتا ہے۔ اور اس بنا پر کوئی عقلمند اس کی نسبت اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ فلاں شخص ظالم ہے۔ کیونکہ اسنے مجھے دس روپے دیئے ہیں۔ سو نہیں دیئے۔ حالانکہ اسکے گھر میں روپے موجود تھے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس کا دس روپے دینا اس کی رحیمی پر دال ہے نہ کہ ظلم پر۔ اسی طرح خدا تعالےٰ نے چیزوں میں بعض فوائد رکھے ہیں۔ اور بعض مضرتیں مضر تو لوگ

علیحدہ رہو۔ اور جتنے فوایدُ دیئے ہیں ان کو رحم سمجھکر ان سے فائدہ اُٹھاؤ۔ کوئی فقیر نہیں کہیگا۔ کہ فلاں شخص ظالم ہے۔ کیونکہ اسنے مجھے ۸ ر دیئے ہیں روپیہ نہیں دیا۔ دینے والے کا رحم ان آٹھ آنوں سے ظاہر ہوتا ہے جو اسنے دیئے ہیں۔ لیکن اس کا ظلم ہرگز اس ہزار روپیہ سے ظاہر نہیں ہوتا جو اسنے نہیں دیا +

پانچواں جواب یہ کہ مضرتوں کو خدا تعالیٰ نے اسلیئے بنایا ہے۔ تا ظاہر فرمائے کہ کون سے لوگ ناشکرے ہیں۔ پس مضرتوں کا یہ بھی فائدہ ہے کہ ظاہر ہو جاتا ہے کس کی محبت خود غرضانہ ہے اور کسکا تعلق مخلصانہ۔ کئی لوگ ہوتے ہیں جو آرام اور آسائش میں تو خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں لیکن تکلیف پر شور مچا دیتے ہیں۔ لیکن ایسے بھی ہوتے ہیں جو تکلیف کے وقت بھی خدا کو نہیں بھولتے۔ اور دراصل یہی خدا کے پیارے اور محبوب ہوتے ہیں۔ حضرت لقمان کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ ایکدفعہ گرفتار ہو کر کسی کے پاس بک گئے۔ مگر جس مالک کے پاس گئے۔ وہ ان سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا۔ ایک دن اسکے پاس بے فصل کا خربوزہ تحفہ آیا اس نے اسمیں سے ایک پھانک کاٹ کر انہیں کھانے کیلیئے دی۔ جسے انہوں نے بہت ہی مزے سے کھایا اسنے یہ خیال کر کے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خربوزہ انہیں بہت پسند آیا ہے ایک پھانک کاٹ کر اور دی وہ بھی انہوں نے خوب مزے سے کھائی اسنے ایک پھانک اور دی اور اسکے بعد خود شوق سے ایک پھانک کا ٹکڑہ منہ میں ڈالی لیکن اسے وہ خربوزہ ایسا بدمزا معلوم ہوا کہ فوراً قے آگئی۔ اسنے حضرت لقمان سے پوچھا کہ ایسا کڑوا خربوزہ تم مزے لے لیکر کیوں کھاتے رہے؟ کیوں نہ مجھے بتایا کہ میں بار بار پھانکیں کاٹ کر تمہیں دیتا رہا۔ انہوں نے کہا اسی ہاتھ سے مینے کثرت سے میٹھی چیزیں کھائی ہیں۔ اگر ایک چیز کڑوی بھی ملگئی تو کیا حرج تھا۔ کیا میں ایسا ناشکرگذار تھا کہ اتنی میٹھی چیزیں کھانے کے بعد ایک کڑوی چیز ملنے پر شور مچا دیتا؟

غرض شکرگذاری کا پتہ مضرتوں سے ہی لگتا ہے۔ اسلیئے خدا تعالیٰ نے مضرتیں بھی پیدا کی ہیں۔ تاکہ اسنے بندوں پر جو احسان کئے ہیں ان کے ذریعہ سے دیکھے کہ بندے ان احسانات کی کیا قدر کرتے ہیں اور ان میں سے کونسے شکر کے جذبہ کو قائم رکھتے اور کونسے شور مچا دیتے ہیں +

چھٹا جواب یہ ہے کہ موذی اشیاء کو خدا تعالیٰ نے اسلئے بنایا ہے۔ کہ انسانی فطرت ادنیٰ حالت میں ڈر کی محتاج ہے۔ اور خدا کی طرف لانے کیلئے مصیبتیں آتی ہیں تاکہ ان کے ڈر کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا ہو۔ جیسے ایک چھوٹا بچہ کہیں جانے لگے۔ اور اسے ادھر ادھر سے ڈرایا جائے تو سیدھا جاتا ہے۔ اور کسی گڑھے وغیرہ میں گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ یا اس طرح کہ جب کوئی جانور ٹیڑھا جا رہا ہو اور اسے ادھر ادھر جانے سے ڈنڈے کی ذریعہ روک دیا جائے تو سیدھا جاتا ہے۔ مگر وہ اشیاء بھی ایک قسم کے ڈنڈے ہیں جو انسانوں کو سیدھا چلانے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اگر یہ نہوں تو اکثر لوگ جو سیدھے چلتے ہیں ٹیڑھے رستہ پر نکل جائیں +

اگر کہا جائے۔ کہ اچھا ڈر پیدا کیا ہے۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ اگر کسی کو شیر کھا جائے یا بیمار مرجائے تو اسکو ڈرانے نے کیا فائدہ دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی پر شیر نے یا بیماری نے ایسا حملہ کیا کہ وہ مرگیا۔ تو اگر اس حملہ کے وقت اسنے ڈر کر اپنے گناہوں سے توبہ کرلی تو وہ خدا کے انعام کے نیچے آگیا۔ اور اگر اسوقت بھی وہ اپنی شرارت پر مستقل رہا تو پھر ضروری تھا کہ اسکو سزا ملتی۔ اس پر شکوہ کیسا؟۔

پھر دنیا میں ہم دیکھتے ہیں ادنیٰ چیز اعلیٰ کیلئے قربان ہوتی ہے۔ اگر اسکے مرنے سے دوسروں کو عبرت حاصل ہو جائے تو پھر کیا ہوا اگر وہ مرگیا۔ اسکے مرنے پر کئی دوسرے بچ جاتے ہیں +

ساتواں جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کو خدا نے اسلئے پیدا کیا ہے کہ وہ رحیم ہی نہیں۔ بلکہ شدید العقاب بھی ہے۔ جو شریر ہوتے ہیں وہ ان کو ان چیزوں کے ذریعہ سزا دیتا ہے۔ اگر بھیڑیا نہ پیدا ہوتا تو وہ شخص جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شرارت کرنے پر بھیڑیے نے چیرا۔ کس طرح یہ سزا پاتا؟ یا اگر طاعون نہ ہوتی تو مسیح موعود کے مخالفوں پر کس طرح عذاب آتا؟ پس جس طرح خدا تعالیٰ کی رحیمیت کی صفت چاہتی ہے کہ بندوں پر جلوہ کرے اور انہیں آرام و آسائش پہنچائے۔ اسی طرح اس کی شدید العقاب کی صفت کا جلوہ ہونا بھی ضروری تھا اور وہ اسی قسم کی چیزوں کے ذریعہ ظاہر ہو سکتی ہے جنہیں نقصان رساں سمجھا جاتا ہے +

خدا تعالیٰ کی اس صفت پر اعتراض کرنیوالوں کی حالت تو ایسی ہی ہے جیسے شترمرغ

کے متعلق ایک مثال بنی ہوئی ہے۔ کہ اسے کسی نے کہا تھا کہ تو مرغ ہو کر اڑتا کیوں نہیں ؟ کہنے لگا احمق کبھی اونٹ بھی اڑا کرتے ہیں ؟ اسنے کہا اگر تجھے اونٹ ہونیکا دعویٰ ہے تو آ پھر ہم تجھ پر بوجھ لادیں۔ کہنے لگا۔ کبھی پرندے پر بھی کسی نے بوجھ لادا ہے ؟ وہ اڑنے کیوقت اونٹ بنگیا۔ اور بوجھ لادنے کیوقت پرندہ یہی مثال ان لوگوں کی ہے۔ اگر خدا تعالیٰ میں رحم ہی رحم ہوتا۔ تو کہتے اس میں سزا دینے کی طاقت کیوں نہیں ہے۔ اور جبکہ اس میں سزا دینی کی طاقت بھی ہے تو کہتے ہیں۔ یہ کیوں ہے ؟

آٹھواں جواب یہ ہے کہ جب انسان عسر یسیر سے گذرتے وقت صبر و استقامت سے کام لیتا ہی تو اسپر ترقی کے دروازے کھولے جاتے ہیں کیونکہ تمام ترقیات کے پانیکا ذریعہ تنگی اور مشکلات ہی ہیں۔ اور جو انسان ان میں سے کامیابی کے ساتھ گذرتا ہے وہی خدا کا قرب پا سکتا ہے۔ پس اگر مشکلات نہ ہوتیں، تو گویا انسان کو پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ کیونکہ اگر تکلیفیں نہ ہوتیں اور ان میں انسان نہ پڑتا۔ تو اس کو خدا کے انعام کس طرح ملتے۔ اور جس غرض کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے وہ کس طرح پوری ہوتی۔ دیکھو سکولوں میں لڑکوں کو دوڑاتے ہیں اگر کوئی لڑکا نہ دوڑے تو اسکے لئے انعام کیسا ؟ دوڑنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر جو دوڑتا ہے۔ اسی کو انعام ملتا ہے۔ اور تکلیف کے مطابق ہی ملتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ کا قرب جیسا بڑا انعام ہے۔ ویسی ہی بڑی اسکے لئے تکالیف بھی ہیں ❖

پھر کہتے ہیں جو لوگ اس طرح مرتے ہیں۔ ان کے رشتہ دار کیا کہتے ہونگے۔ اس کا جواب یہ ہے، کہ یہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ یا تو خدا کو ماننے والے یا نہ ماننے والے۔ ماننے والے تو کہیں گے کہ خدا کے قانون قدرت کے ماتحت اپنی عمل کے مطابق یا خدا تعالےٰ کی خاص حکمت کے ماتحت مرنیوالے نے جان دی ہے ❖ اور جو نہیں مانتے۔ انہوں نے جب خدا کو مانا ہی نہیں تو انہوں نے کیا کہنا ہے وہ اپنے ذہنی قانون قدرت کو گالیاں دیتے ہونگے۔

دیگر اشیا کے پیدا کرنے کی وجہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ مخلوق تو وہ ہے جو ذی روح ہے ان کے متعلق تمنے کہہ لیا کہ اس کی اپنی جداگانہ ہستی بھی ہے۔ لیکن بجلی وغیرہ نقصان رساں چیزیں کیوں پیدا کیگئی ہیں ؟

اسکا جواب یہ ہے کہ ایسی چیزیں بھی خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت پیدا ہوئی ہیں اور ہمیشہ سے موجود ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ جب کسی پر بجلی گرنی ہوتی ہے۔ اسوقت اسے پیدا کر کے بھیجتا ہے۔ اسنے ایک قانون بنا دیا ہے۔ اس قانون کے خلاف جو چلتا ہے وہ ہلاک ہوتا ہے۔ پھر ایسی چیزوں میں فائدے بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کا فائدہ زیادہ ہے اور نقصان کم ہے۔ مثلاً طبعی طور پر جو دلوں کو ڈرانے والی چیزیں ہیں ان میں سے سب سے زیادہ خطرناک زلزلہ ہے۔ مگر یہی زلزلہ ہے جس کے ذریعہ سے دنیا قابل رہائش بنی ہے اور اب بھی ان کے ذریعہ سے تغیرات پیدا ہو رہے ہیں۔ جنمیں سے بعض کو سائنسدان سمجھتے ہیں اور بعض ابھی ان پر بھی مخفی ہیں۔ درحقیقت زلزلہ دنیا کی زندگی کو لمبا کرنیکے لئے آتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے انسان کیلئے ضروری اشیاء کے خزینے پیدا کرنے یا انہیں محفوظ رکھنے کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔ انبیاء کے وقت اسی لئے زلزلے آتے ہیں۔ کہ دنیا کے قیام کی صورت پیدا ہو۔ اسی طرح اگر کسی پر بجلی گرتی ہے تو اسکے صرف یہ معنی ہیں کہ ایسا شخص ایک عام قانون کی زد میں آگیا ہے۔ اگر وہ مومن ہے تو اسکو اس کا بدلا آخرت میں مل جائیگا۔ اور اگر کافر ہے تو اسکو اسکے اعمال کی سزا مل گئی۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بجلی سے اگر ایک آدمی مرتا ہے تو لاکھوں کی جان بچتی ہے۔ کیونکہ بجلیوں کے ذریعہ سے ہزاروں قسم کے زہرا اور زہریلے جرمز مرتے ہیں۔ اسی بجلی سے روشنی لیجاتی ہے۔ ریلیں چلائی جاتی ہیں۔ کارخانے چلائے جاتے ہیں۔ لاکھوں آدمی ان بجلی کے کارخانوں میں ملازمت کر کے روٹی کماتے اور زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھر ہزاروں بیماریوں سے لوگ اسکے ذریعہ شفا پاتے ہیں۔ کئی بیماریاں اسکے ذریعہ دور ہو جاتی ہیں۔ اس کی موتیں ان لوگوں کو نظر آتی ہیں۔ مگر اسکے زندگی بخش اثر نظر نہیں آتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اعتراض کرنے سے غرض ہے۔ احقاق حق سے غرض نہیں۔

بیماریاں کیا ہیں اور کیوں ہیں؟

دہریے یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ اچھا بجلی زلزلہ وغیرہ میں اور موذی جانوروں میں تو حکمتیں ہیں مگر بیماریاں کیوں پیدا کیگئی ہیں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ بیماری کیا چیز ہے؟ اول جب کسی جگہ زائد فضلہ جمع ہو جائے تو اس کا نام بیماری ہے۔ دوسرے انسان کا جسم کچھ چیزوں سے ملکر

بنا ہے ان میں سے اگر کوئی چیز اپنی مقدار کے لحاظ سے کم ہو جائے تو یہ بیماری ہے +

تیسرے بیرونی چیزوں کے اثرات انسان پر پڑتے ہیں۔ مثلاً انسان کھاتا ہے۔ سانس لیتا ہے۔ سونگھتا ہے، پیتا ہے۔ اسکے جسم کا فعل کبھی تیز ہو جاتا ہے۔ کبھی سست اسی کا نام بیماری ہے +

فضلہ کی زیادتی سے بیماری

اب ہم ان کے متعلق الگ الگ بحث کرتے ہیں۔ فضلہ کی پیدائش کیوں اور کس طرح ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پانی یا روٹی زیادہ کھا پی لے۔ یا کوئی ایسی چیز کھالے۔ کہ جس کو معدہ ہضم نہ کر سکتا ہو اور سُدا بنجائے جیسے گھر کی نالی میں جب کوئی اینٹ روڑا آجاتا ہے۔ تو پانی باہر نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح پیٹ میں کوئی ایسی چیز ڈال لی گئی جو پھنس گئی۔ اب بیماری کے ہونے کے کیا معنی ہوئے۔ کیا یہی نہیں کہ اسکے جسم میں کبھی بھی فضلہ جمع نہ ہوتا جسکے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہیں کہ انسان خواہ کس قدر بھی کھا جاتا اسے بچ جانا چاہئیے تھا۔ اب اس قانون کے ماتحت دنیا کو چلا کر دیکھو تو کس قدر جلد اسپر تباہی آجاتی ہے اب تو یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک حد تک کھا کر چھوڑ دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گو منہ کو مزا آرہا ہے لیکن انجام کار اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلیگا اور جسم میں بیماری پیدا ہو جائیگی۔ لیکن اگر زیادہ کھانے سے بیمار نہ ہوتا۔ تو ایک ہی شخص سینکڑوں آدمیوں کا کھانا کھا جاتا اور پھر بھی سیر نہ ہوتا یا پھر یہ تجویز کیجا سکتی تھی کہ انسان کچھ کھاتا پیتا ہی نہ۔ جسکا یہ مطلب ہے کہ وہ ہر قسم کے تغیر سے محفوظ ہوتا اور گویا خدا ہوتا پھر ایسے انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہوتا مگر اسکے علاوہ بھی میں کہتا ہوں کہ اس حالت کو فرض کر کے ذرا انسانوں سے یہ پوچھ کر تو دیکھو کہ اگر تمہیں سب میٹھی کھٹی، نمکین چیزیں کھانے سے روک دیا جائے۔ اور پھر تمہیں کوئی بیماری نہ ہو۔ تو کیا اسے پسند کرو گے؟ اسکا جواب وہ یہی دینگے۔ کہ یہ تو خود ایک بیماری ہے۔ اس میں مبتلا ہونا کون پسند کریگا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے۔ جیسے ایک ایسا شخص جو ناک کے ذریعہ بو کو بھی سونگھ سکے۔ اور بدبو کو بھی۔ اسکو کہا جائے۔ کہ آؤ تمہاری سونگھنے کی قوت ضائع کر دیجائے۔ تاکہ نہ تم خوشبو سونگھ سکو اور نہ بدبو۔ وہ آدمی خوش نہیں ہوگا بلکہ اسے گالی سمجھکر لڑنے پر آمادہ ہو جائیگا +

اور اگر یہ کہا جائے کہ زیادہ کھانے کی کسی کو توفیق ہی نہ ملتی۔ جب کوئی شخص ایک یا دو یا تین یا چار روٹیاں حسب استعداد کھا لیتا تو فرشتہ آجاتا اور آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ اور کہہ دیتا کہ بس اب نہ کھانا ورنہ فضلہ پیدا ہو کر بیمار ہو جاؤ گے۔ مگر اس طرح تو گویا خدا ہی ان کے پاس آجاتا اور انسان کیلئے امتحان کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہتی اور اس کی پیدائش کی غرض باطل ہو جاتی اسکے دائیں اور بائیں فرشتے ہوتے جو ہر وقت اسے ٹوکتے رہتے کہ یہ نہ کھاؤ وہ نہ کھاؤ اتنا نہ کھاؤ اتنا کھاؤ۔ فرض کرو ایک چیز آدمی کو کھانی مناسب نہ ہوتی۔ مثلاً یہی فرض کر لو کہ ایک شخص کیلئے کدو مضر ہوتا جب وہ بازار سے خریدتا جھٹ ایک فرشتہ آتا اور اس سے چھین کر دوکاندار کو واپس کرتا اور اس سے پیسے چھین کر اسے لا کر دیتا۔ غرض یہ عجیب قسم کی کھیل بنجاتا جس سے انسان کی پیدائش کی غرض بالکل ہی باطل ہو جاتی +

معترض کہتے ہیں۔ کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ معدہ ہی ایسا بنا دیا جاتا کہ جس قدر انسان کے جسم کیلئے ضرورت ہوتی۔ اتنی چیز جذب کر لیتا اور باقی نکال دیتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہوا کہ معدہ کے اندر بھی ایک دماغ بنایا جاتا جو موجودہ دماغ سے بھی اعلیٰ ہوتا اور اسے پوری طرح طب کا علم بھی ہوتا کہ جو چیز مضر ہوتی فوراً اسے نکال کر باہر پھینک دیتا مگر کیا اس سے انسان کی انسانیت کچھ باقی رہجاتی کیا وہ ایک مکمل مشین نہ بنجاتا جس کا اسکے اعمال پر کچھ بھی تصرف نہ ہوتا اور جب اسکا اسکے اعمال پر تصرف نہ ہوتا تو وہ ترقیات کا مستحق کس طرح بنتا۔ اور پھر کیا جو چیز مضر معدہ میں جاتی اسکا نکال کر پھینکدینا خود ایک تکلیف دہ عمل اور بیماری کہلاتا

خارجی اثرات سے بیماری

پھر بیماری خارجی اثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً سردی لگجاتی ہے جس سے کبھی گردوں میں درد ہو جاتی ہے۔ یا کوئی اور تکلیف پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی بیماری نہ ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ کوئی اثر انسان محسوس نہ کرتا۔ نہ اسے سردی لگتی۔ نہ گرمی۔ گویا ایک نئی قسم کا انسان ہوتا۔ گرم گرم روٹی اور ٹھنڈا پانی اسکے لئے کوئی حقیقت نہ رکھتا۔ گرم لحاف اور پہاڑوں کی خوش کن ٹھنڈی ہوا اسکے لئے بے حقیقت ہوتی۔ کیونکہ اس پر سردی گرمی کا کوئی اثر نہ ہو سکتا۔ اب کسی سے دریافت کرو کہ آیا وہ یہ پسند کرتا ہے کہ اسے کبھی کوئی بیماری نہ ہو۔ اور اس کی ساری حسیں ماری جائیں۔ یا حسوں کا باقی رہنا اور بیماری کا

امکان پسند کرتا ہے؟

پھر زبان۔ ناک وغیرہ کی جو حسیں ہیں ان کا غلط استعمال بیماری پیدا کرتا ہے۔ زبان کا مزا بعض دفعہ طاقت سے زیادہ کھانے کا موجب ہوتا ہے۔ بیماری کے اسباب کے مٹانے کے یہ معنی ہیں کہ زبان کا مزا باطل کر دیا جائے مٹی اور شکر انسان کے منہ میں ایکساں معلوم ہوں کڑوا اور میٹھا دونوں اسکے لئے برابر ہوں۔ وہ انسان جو بیماری کا شکار ہوتا ہے۔ اس سے پوچھکر دیکھو تو کہ کیا وہ موجودہ حالت کو پسند کرتا ہے یا اس قسم کی حالت کو جو دہریہ تجویز کرتے ہیں۔

پھر بیماری کا باعث جسم کی وہ حس ہے جس سے وہ سختی اور نرمی کو محسوس کرتا ہے۔ یا انسان کے جسم کی نرمی ہے جس سے وہ اپنی ذات میں آرام محسوس کرتا ہے۔ اس نرم جسم پر اگر زور سے چوٹ لگے تو وہ زخمی بھی ہو گا۔ بیماری کے اسباب کے مٹانے کے ایک یہ معنی بھی ہونگے کہ ان حسوں کو مٹا دیا جائے۔ مگر ان کو مٹا کر دیکھو کیا نتیجہ نکلیگا۔ اپنے عزیزوں کو ہاتھ لگائیگا اور ان کے جسم کو پتھر کی طرح سخت پائیگا بلکہ اپنے جسم میں حس نہ ہوگی اور کچھ محسوس ہی نہیں کریگا جسطرح فالج زدہ کے جسم کو کوئی چیز چھوتی ہے اور وہ کچھ محسوس نہیں کرتا۔ کیا کوئی شخص بھی اس حالت کو پسند کریگا؟ دنیا کے بہت سے لطف اور بہت سی دلبستگیاں چھونے کی حس سے ہیں اور اپنے جسم کی نرمی میں ہیں۔ اب اگر بیماری کو دور کرنے کیلئے اس حس کو اور اس نرمی کو دور کر دیا جائے تو بے شک درد اور زخم تو مٹجائیگا مگر انسان کا کیا باقی رہیگا؟ وہ ایک پتھر ہو گا جو نہ اپنے جسم کے آرام کو محسوس کر سکیگا نہ دوسروں کے چھونے کا کوئی لطف اسے حاصل ہو سکیگا۔ بلکہ ایسے شخص کو کوئی اٹھا کر بھی لیجائیگا تو اسے کچھ معلوم نہ ہو گا +

اس نقشہ کو کھینچکر اپنے دل میں دیکھو کہ سردی گرمی کا احساس مٹجائے۔ گرمی سردی کا موسم یکساں ہو جائے۔ ٹھنڈے پانی اور گرم پانی کا احساس باقی نہ رہے۔ میٹھا۔ کڑوا۔ سلونا کوئی مزا محسوس نہ ہو سختی نرمی کا کچھ پتہ نہ لگے۔ جسم لوہے کی طرح سخت ہو۔ خوشبو اور بدبو کا امتیاز باقی نہ رہے اور اسکے نتیجہ میں بیماری بھی پیدا نہ ہو تو کیا اس زندگی کو دنیا خود بیماری کہیگی یا نعمت سمجھیگی؟ کسی عقلمند انسان کے سامنے اس تجویز کو پیش کر کے دیکھو وہ اسے جنون قرار دیگا۔ خواہ لاکھ اسے سمجھاؤ کہ اس طرح بیماری کا دروازہ بند ہو جائیگا وہ کبھی تسلیم نہ کریگا

اور یہی کہیگا کہ بیماری تو کبھی کبھی اور کسی کسی کو آتی ہے مگر تمہاری تجویز سے تو ہر شخص کیلئے زندگی کا ہی دروازہ بند ہو جائیگا۔ یہی حسّیں تو روزانہ میرے کام آتی ہیں اور میری زندگی کو دلچسپ بنانے کا موجب ہیں +

اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے زندگی کو دلچسپ بنانے کیلئے انسان کو یہ حسّیں دی ہیں ان کے استعمال میں جب انسان غلطی کر بیٹھتا ہے تو بیمار ہو جاتا ہے۔ اور بیماری اسطرح اڑائی جا سکتی ہے کہ یا یہ حسیں اڑا دی جائیں یا پھر انسان کا اپنا ارادہ ہی باقی نہ رہے وہ اپنے ہر کام میں مجبور رہو۔ ثانی الذکر صورت کے اختیار کرنے سے انسان کی پیدائش کی غرض باطل ہو جاتی ہے۔ اور اول الذکر صورت اختیار کرنیکو خود انسان ہی پسند نہ کریگا۔ پس وہی طریق سب سے مناسب ہے جو خدا تعالےٰ نے پیدا کیا ہے +

ہر کام میں تکلیف ہوتی ہے اس قسم کے اعتراض کرنیوالوں کو یہ بھی سوچنا چاہئیے کہ تکلیف تو دنیا کے سارے پیشوں میں ہی ہوتی ہے۔ زمیندار ایک کھیت تیار کرتا ہے تو کیا یونہی کر لیتا ہے؟ ہل چلاتے وقت بیسیوں چکر کاٹتا ہے۔ سردی۔ گرمی کی تکلیف برداشت کرتا ہے۔ اسکے بیوی بچّے الگ محنت میں شریک ہو کر تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ پس یہی نہیں۔ کہ بیماری سے ہی انسان کو تکلیف ہوتی ہے۔ بلکہ کھانے پینے کا انتظام کرتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اسلئے اگر تکلیفوں کو دور کرنے سے ہی خدا تعالیٰ کی صفات رحمت کا پتہ چل سکتا ہے تو یہ بھی سوال ہونا چاہئیے کہ سب پیشے موقوف کئے جائیں سب محنتیں اڑا دیجائیں۔ اب علم حاصل کرنے کیلئے برسوں محنت کرنی اور تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے ہونا یہ چاہئیے کہ ادھر بچّہ پیدا ہو ادھر سارے علوم کے خزانے اسپر کھُل جائیں۔ اب زمیندار کو فصل تیار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ مگر چاہئیے یہ کہ آپ ہی آپ غلہ اُگے۔ آپ ہی گھر میں آ جائے۔ آپ ہی آپ روٹی پکے۔ اسی طرح کپڑوں کی تیاری میں تکلیف ہوتی ہے چاہئیے یہ کہ آپ ہی آپ کپڑا تیار ہو۔ آپ ہی آپ لباس سیئے جائیں۔ غرض کہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ آپ ہی آپ ہو جائے۔ تمام کاروبار بند ہو جائیں اور سب پیشے موقوف ہوں نہ لوہار رہے نہ ترکھان۔ نہ دھوبی رہے نہ درزی۔ نہ ڈاک والے رہیں نہ ریل والے۔

کوئی بھی نہ رہے۔ گویا جس طرح پرانے زمانہ میں ابدی خانے ہوتے تھے (جن کا نام برعکس تھا۔ کیونکہ ان میں ایسے لوگ رکھے جاتے جو بے ہاتھ ہوتے) ساری دنیا ہی ابدی خانہ بن جائے سب لوگ چارپائیوں پر پڑے ہوئے ہوں نہ چلنے کی تکلیف نہ اُٹھنے کی ضرورت نہ کوئی ہاتھ ہلائے نہ پاؤں۔ سب کام آپ ہی آپ ہوں۔ سب ترقیاں بند ہو جائیں۔ سب مقابلے روک دیئے جائیں۔ یہ دنیا ہے جو تکلیف کے سلسلے کے بند ہونے کے خواہشمند پیدا کرنی چاہتے ہیں۔

اگر موت نہ ہوتی اب میں ایک اور پہلو کو لیتا ہوں اور وہ یہ کہ مرنے سے جو تکلیف ہوتی ہے۔ اسے اڑا کر دیکھو۔ کیا صورت بنتی ہے۔ اگر نئی نسلیں تو پیدا ہوتی رہیں۔ لیکن کسی پر موت نہ آئے تو ایک ہزار سال کے عرصہ میں ہی دنیا پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہے اور نہ غذا ہی کافی ملے اور یہی لوگ جو ان امور کو دیکھکر خدا تعالیٰ کے رحم پر اعتراض کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو بُرا بھلا کہنے لگ جائیں۔ کہ ہمارے باپ دادوں کو دفع بھی نہیں کرتا کہ کہیں گھر خالی ہوں اور ہم اپنے سر چھپائیں اور روٹی پیٹ بھر کر کھانے کو ملے۔

پھر میں کہتا ہوں اگر دنیا کی موجودہ حالت فی الواقع تکلیف دہ ہے۔ تو خودکشی کا دروازہ کھلا ہے۔ کیوں ایسے معترض یا دوسرے لوگ خودکشی نہیں کر لیتے؟ مگر کس قدر لوگ ہیں جو اس فعل پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جو اس فعل کے مرتکب ہوتے بھی ہیں تو انہیں دنیا کیا کہتی ہے؟ یہی نہ کہ وہ عارضی طور پر پاگل ہو گئے تھے۔ اگر فی الواقع یہ دنیا تکلیف ہی کی جگہ ہے تو خودکشی کرنیوالے پاگل نہیں بلکہ سب سے زیادہ عقلمند ہیں جو ایک منٹ میں اپنی تکلیفوں کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ پس خودکشی نہ کرنے اور خودکشی کرنیوالوں کو پاگل سمجھنے سے معلوم ہوا کہ باوجود ان شبہات کے یہ معترض بھی یہی چاہتے ہیں کہ اور جئیں۔ مگر جب دل کی یہ حالت ہے تو پھر اعتراض کیوں کرتے ہیں؟۔

غرض یہ سب باتیں انسان کیلئے ضروری ہیں اور ان پر اعتراض کرنا لغویت ہے۔ یہ نہ تو اس لئے ہیں کہ خدا کی طاقت محدود ہے اور نہ تناسخ انکا موجب ہے۔ بلکہ ان سب میں خدا تعالیٰ نے حکمتیں رکھی ہیں۔

مصائب پر افسوس کیوں کیا جاتا ہے؟ پچھلے بیان پر معترضین ایک اور اعتراض

کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر یہ درست ہے کہ یہ سب امور حکمت پر مبنی ہیں اور انکے بغیر دنیا کا گزارہ نہیں ہو سکتا تھا پھر جب کسی گھر میں ماتم ہو جاتا ہے تو گھر والے خوشی کیوں نہیں مناتے اور تکلیف کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اسی طرح جب کوئی بیمار ہو جائے تو خوش کیوں نہیں ہوتے رنج کیوں کرتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ہمنے یہ نہیں کہا کہ بیماری سے تکلیف نہیں ہوتی۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر بیماری کے اسباب کو مٹا دیا جاتا تو پھر جو کچھ ہوتا وہ زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔ پس ہم یہ نہیں کہتے کہ جو شخص بیمار ہوتا ہے۔ اسے آرام ملتا ہے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا قانون بنایا جائے جس سے بیماری دور ہو جاتی تو وہ یا تو انسان کو محض مجبور بنا دیتا اور یہ ہو نہیں سکتا تھا اور یا پھر اس کی حسوں کو باطل کر دیتا جو بیماری کی نسبت ہزار ہا درجے زیادہ ناقابل برداشت تھا۔ پس ان ترقیات کو مد نظر رکھتے ہوئے جو موجودہ قانون کی وجہ سے انسان کے سامنے ہیں بیماریاں تکلیف وغیرہ سب ایک رحمت ہیں یا رحمت سے بھاگنے کی سزا پس انکے باوجود خدا تعالےٰ کی رحمانیت اور رحیمیت پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔

مصائب پر افسوس کیوں کیا جاتا ہے؟

یاد رکھنا چاہئے کہ مصائب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ قسم اول کے مصائب وہ ہوتے ہیں جو احکام شریعت کے رد کرنے یا ان کی بے قدری کرنے کے سبب سے نازل ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے مصائب وہ ہیں کہ جو قانون قدرت کے توڑنے کے سبب سے آتے ہیں جیسے مثلاً ایک شخص کے معدہ میں تین چپاتیاں پچانے کی طاقت ہے مگر وہ چار کھاتا ہے۔ اور بیمار ہو جاتا ہے۔ تیسری قسم کے مصائب وہ ہیں جو اتفاقاً پیش آجاتے ہیں۔ ایک شخص کا قصور کچھ نہیں ہوتا لیکن وہ اتفاقاً اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں خدا تعالیٰ کی قہری تجلی نازل ہو رہی ہے تو یہ بھی اس میں مبتلا ہو جاتا ہے جیسے مثلاً کوئی شخص راستہ پر جا رہا تھا پہلو کے مکان کی دیوار گری اور وہ نیچے آکر مر گیا ان تینوں قسم کی تکلیفوں کو الگ الگ معلوم کرنا انسان کے لئے عام طور پر مشکل ہے اسلئے ایک خشیت اللہ رکھنے والے دل کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ مصیبت کو اپنے اعمال کا نتیجہ سمجھے اور آئندہ نتائج سے خائف ہو۔ پس ایک باعث بھی مصائب پر افسوس کرنیکا ہے۔

دوسرے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ تکلیف کا احساس ایک علیحدہ بات ہے اور اسکی حکمت کے ماتحت سمجھنا علیحدہ بات ہے۔ دیکھو جب ڈاکٹر کسی کی بیمار آنکھ میں دوائی ڈالتا ہے۔ تو یہ اچھی بات ہوتی ہے یا بری؟ اس بات کو کوئی بدی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن دوائی لگاتے وقت بیمار درد کی وجہ سے شور مچایا کرتا ہے۔ یا ہنس ہنس کر یہ کہا کرتا ہے کہ آہا ہا اس کا نتیجہ بہت اچھا ہوگا۔ انسانی تکالیف کے متعلق یہ اعتراض تو تب صحیح مانا جائے کہ اگر وہ تکلیف دہ امور جن کا نتیجہ یقیناً دہریوں کے نزدیک بھی اچھا ہوتا ہے انپر وہ خوش ہوا کریں مثلاً جب ڈاکٹر کسی کا موتیا کاٹ کر نکالے تو وہ خوشی سے ہنستا جائے کہ اسکا نتیجہ بہت اچھا ہوگا۔ تو نتیجہ پر خوش ہونا اور بات ہوتی ہے اور درمیانی تکلیف پر افسوس کرنا اور۔ ہم درمیانی تکلیف پر افسوس کرتے ہیں۔ نہ کہ نتیجہ پر ٭

حیوانات کو کیوں تکلیف دیجاتی ہے؟

اب یہ سوال کیا جاتا ہے۔ کہ خدا جانوروں کو کیوں تکلیف دیتا ہے؟ چھپکلیاں بھنگے وغیرہ کھا جاتی ہیں۔ بکری کو شیر کھا لیتا ہے۔ ان جانوروں کو تکلیف دینے کی کیا وجہ ہے؟ اور ان کو اس کی کیا جزا ملیگی؟ انسان بکری کا گوشت کھا کر مزا حاصل کرتا ہے۔ لیکن بکری کو اس تکلیف کے بدلے کیا ملا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اس عالم کا ذرہ ذرہ خدا تعالیٰ کے حکم میں لگا ہوا ہے۔ اور اسکے حکم کے ماتحت کام کر رہا ہے۔ اور ہر ایک ذرہ اجر کا مستحق ہے۔ اسلئے نہیں کہ وہ اس کا حق دار ہے۔ بلکہ اسلئے کہ خدا نے اس کا حق مقرر کر دیا ہے وہ حق دار تو نہیں مگر اسے حق مل رہا ہے۔ دیکھو وہی ذرہ جو ایک بکری میں ہو۔ اس بکری کے ذبح ہونے پر اگر وہ ذرہ ایک بہت بڑے مصلح یا نفع رساں وجود کے جسم کا حصہ بنجائے تو کیا یہ اسکا انعام نہیں اور کیا وہ اس ذریعہ سے ایک بلند مقام پر نہیں پہنچ گیا؟

ہر چیز کو بدلا ملیگا

قانون قدرت ہمیں بتاتا ہے کہ ہر چیز کو اسکے عمل کے مطابق بدل مل رہا ہے سروائول آف دی فٹسٹ یا بقائے انسب کا قانون صاف بتا رہا ہے کہ ہر چیز اپنا بدلہ پا رہی ہے خواہ گھاس کی پتی ہی کیوں نہو۔ ہاں بدلے اپنی اپنی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ انسانی حس چونکہ سب دوسری چیزوں سے ترقی یافتہ ہے۔ انسان کا بدلہ بھی دائمی اور

ابدی ہے دوسری چیزوں کی حستیں چونکہ بالکل محدود ہیں اسلئے ان کے بدلے بھی محدود ہیں گو بدلے ہیں ضرور۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم۔ الخ زمین پر چلنے یا رینگنے والے جانور یا ہوا میں اُڑنے والے پرندے سب کے سب تمہاری طرح کی امتیں ہیں جو تمہاری طرح ایک جنس ہیں۔ ہمنے اپنے فیصلہ میں کسی قسم کی بھی کمی نہیں کی پھر یہ سب ایک دن اپنے رب کے حضور میں پیش کئے جائینگے کس وضاحت سے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے سوا دوسرے حیوان بھی اپنے فرائض کی ادائیگی پر بدلے پائینگے۔ ہاں وہ بدلہ انکی اپنی جنس کی طاقتوں کے مطابق ہوگا نہ انسان کی طرح کا۔ پس یہ غلط ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کا بدلہ ملیگا۔ اور ان چیزوں کو نہیں ملیگا۔ سب کو ملیگا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ اگر ایک بکری نے دوسری بکری کا سینگ توڑا ہوگا تو قیامت کے دن دوسری سے خدا تعالیٰ کہیگا کہ تو اس کا سینگ توڑ۔ تو کوئی روح ایسی نہیں ہوسکتی جو جزا نہ پائے۔ ہاں جیسی جیسی روح ہوگی ویسی ویسی اسکو جزا ملے گی۔ ہمیں سب کی تفصیلوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں +

غرض کوئی ایسی شے نہیں۔ جو بدلہ نہ پائے گی۔ لیکن انسان چونکہ کامل ہے۔ اسلئے یہ ابدی نجات پائیگا۔ اور دوسری چیزیں کامل نہیں اسلئے ان کو ابدی زندگی نہیں ملیگی۔ دیکھو جو انسان مارا جاتا ہے اس کا اس کی بیوی بچوں پر کیسا اثر پڑتا ہے۔ مگر بکری ماری جائے تو اسکے بچے کو پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ اور اگر غم ہوتا بھی ہے تو صرف چند دن کا۔ پھر انسان پر شریعت کی پابندیاں ہوتی ہیں مگر دوسرے جانوروں پر نہیں ہوتیں +

مخلوق کا پیدا کرنا خدا کے غنی کے خلاف نہیں

صفات رحمت کے علاوہ خدا تعالیٰ کی صفت غنا پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر خدا غنی ہے۔ تو اسنے مخلوق کو پیدا کیوں کیا۔ کیا وہ محتاج ہے کہ اسے مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک فقیر کسی سخی کو کہہ سکتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو تو سخاوت نہ کرسکتا اسلئے تو میرا محتاج ہے۔ تو ایک بندہ بھی خدا کو کہہ سکتا ہے کہ خدا میرا محتاج ہے۔ مگر کبھی کسی نے نہ سنا ہوگا کہ کسی فقیر نے کہا ہو کہ فلاں سخی محتاج تھا جس سے میں نے آٹھ آنے یا چار آنے لئے

اور تب جا کر اس کی احتیاج پوری ہوئی۔ تعجب ہے کہ ایک شخص آٹھ آنے یا چار آنے لیکر تو کہتا ہے کہ یہ امر میری احتیاج پر دلالت کرتا ہے نہ دینے والے کی احتیاج پر مگر خدا کے متعلق انسان زمین و آسمان اور ان کے اندر جو چیزیں ہیں ان کو لیکر کہتا ہے۔ کہ خدا میرا محتاج ہے میں نہ ہوتا تو یہ چیزیں کون استعمال کرتا؟

دوسرا جواب یہ ہے کہ احتیاج اس چیز کی ہوتی ہے جو مستقل حیثیت رکھتی ہے اور جو ہماری اپنی صفت کا ظہور ہو وہ احتیاج نہیں کہلاتا۔ مثلاً یہ احتیاج ہے کہ ایک ہمارا کام بغیر کسی اور شخص کی مدد کے نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنی کسی صفت کا اظہار احتیاج نہیں ہے بلکہ اسے قدرت کہتے ہیں۔ چونکہ خدا تعالیٰ کسی غیر چیز کی مدد نہیں چاہتا وہ محتاج نہیں کہلا سکتا وہ تو اپنی قدرت سے ایک عالم کو پیدا کرتا ہے پس وہ محتاج نہیں بلکہ مقتدر ہوا اور اس نے ایک چیز پیدا کی اور اسے چن لیا اور اسے بزرگی دی +

خدا تعالیٰ کی قدرت پر اعتراض اور اسکا جواب

خدا تعالیٰ کی صفت قدرت پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر وہ قادر مطلق ہے تو اتنی دیر میں کیوں پیدا کرتا ہے؟ خصوصاً یہ اعتراض زمین و آسمان کی پیدائش پر کیا جاتا ہے جس کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا +

زمین و آسمان کتنے عرصہ میں بنے؟

اسکا جواب یہ ہے کہ یہ تمہاری غلطی ہے۔ کہ آسمان و زمین چھ دن میں بنے۔ یوم کے معنے دن کے نہیں بلکہ وقت کے ہوتے ہیں۔ چونکہ دن وقت کا پیمانہ ہے اسلئے دن کیلئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے ہم تو سمجھتے ہیں کہ زمین و آسمان لاکھوں کروڑوں سال میں بنے کیونکہ موجودہ علوم اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس پر غالباً کہا جائیگا۔ کہ اس طرح تو اعتراض اور بھی مضبوط ہو گیا۔ کیونکہ تم کہتے ہو کہ زمین و آسمان لاکھوں کروڑوں سال میں بنے ہیں +

پہلا جواب

اس کا جواب ایک تو یہ ہے۔ کہ کسی واقعہ کی موجودگی میں جس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے، واقعہ پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا تعالیٰ ہے اور اسنے اس دنیا کو بنایا ہے تو اسکا قادر ہونا تو ثابت ہو گیا باقی رہا یہ سوال کہ کیوں نہ اس نے

ایک ہی منٹ میں بلکہ اس سے بھی کم میں دنیا کو پیدا کر دیا تو اس کی نسبت یہ کہا جائیگا کہ اس سے اس کی قدرت پر اعتراض نہیں پڑسکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائیگا کہ اس امر کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ✦

دوسرا جواب دوسرا جواب یہ ہو کہ خدا تعالےٰ نے صرف زمین و آسمان کو ہی آہستہ آہستہ پیدا نہیں کیا بلکہ وہ اس دنیا کی سب چیزوں کو اسی طرح پیدا کرتا ہے اور اس کی حکمت یہ ہے کہ ہر چیز اپنی اردگرد کی چیزوں سے مناسبت حاصل کر سکے۔ تاکہ تمام چیزیں اس سے مل کر کام کر سکیں۔ پس چیزوں کا آپس میں لگاؤ اور انس پیدا کرنے کیلئے اسنے ایسا کیا ہے۔ خدا تعالےٰ تو قادر تھا۔ کہ فوراً کوئی چیز پیدا کر دیتا۔ مگر ہمیں ضرورت تھی کہ آہستہ آہستہ پیدائش ہو۔ تاکہ ہم ایکدوسرے کو جذب کر سکیں۔ جس طرح اگر اسپنج کو جلدی پانی میں سے نکال لیا جائے تو وہ اچھی طرح گیلا بھی نہیں ہوتا۔ پانی جذب کرنے کیلئے کچھ دیر پانی میں رکھے رہنے کا محتاج ہے۔ یا جیسے ماش کی دال بھیگنے کیلئے دیر تک پانی میں رہنے کی محتاج ہے۔ پس یہ دیر خدا تعالیٰ کے ضعف کی وجہ سے نہیں بلکہ ہمارے ضعف کے سبب سے ہے ✦

تیسرا جواب تیسرا جواب یہ ہو کہ اگر اس کی قدرت فوراً پیدا کر دینے کا تقاضا کرتی ہو تو چاہیئے تھا کہ ہر اک چیز ہی فوراً پیدا ہو جاتی مگر ذرا دنیا میں اس قانون کو جاری کر کے دیکھ لو دنیا کیا بنجاتی ہے۔ اس قانون کے ماتحت بچہ کو ۹ ماہ کے بعد پیدا نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ فوراً پیدا ہو جانا چاہیئے۔ سوچو تو سہی اس کا کیا نتیجہ نکلیگا۔ سردی کا موسم ہو آدھی رات کا وقت ہو ایک غریب آدمی کی جھونپڑی میں یکدم بچہ پیدا ہو جائے۔ اسوقت وہ کہاں سے اسکے لئے کپڑا مہیا کر سکیگا۔ پھر اگر مضبوط آدمی ہوا۔ اور اس نے پھر ایسا ہی فعل کیا جس سے بچہ پیدا ہو جاتا ہو تو اسی وقت ایک اور بچہ پیدا ہو جائیگا۔ اور اگر تیسری دفعہ پھر وہی فعل اس سے ہوا تو تیسرا بچہ پیدا ہو جائیگا۔ اس طرح تو ایک ایک رات میں بعض لوگوں کے کئی کئی بچے پیدا ہونے ممکن ہونگے اور صبح ہوتے ہوتے ایک بڑے کنبے کی پرورش کا بوجھ سر پر پڑ جائیگا۔ خود ہی اندازہ کر لو کہ اس قانون کے ماتحت ایک سال میں یہ تعداد کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ ایسی حالت ہوتی تو عورت مرد آپس کے تعلقات سے کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ کہ ہم اسکے قریب نہ جائینگے۔

پھر ایک بچہ پیدا ہونے پر عورت کو اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ اس کا برا حال ہو جاتا ہے اور ولایت میں تو عورتیں رحم ہی نکلوا دیتی ہیں۔ تاکہ بچہ پیدا ہونے کی تکلیف نہ برداشت کرنی پڑے۔ لیکن اگر ایک ہی وقت میں پے در پے بچے پیدا ہو سکتے تو نہ معلوم وہ کیا کرتیں شادی کا ہی نام نہ لیتیں۔ یا پھر ایک ایک مرد کو کئی کئی سو عورتیں کرنے کی اجازت ہوتی۔

اگر خدا آہستہ نہ بڑھاتا پھر آہستہ پیدا کرنے والا اعتراض آہستہ بڑھانے پر بھی پڑتا ہے۔ کہ آہستہ آہستہ کیوں خدا بڑھاتا ہے۔ اس طرح بھی نہ ہو۔ بلکہ ادھر بچہ پیدا ہوا۔ ادھر یکدم بڑا ہو گیا۔ مگر اس طرح ایک اور مصیبت شروع ہو جائیگی۔ بچے کے پیدا ہونے پر جوں توں کر کے ماں نے جلدی سے اسکے اندازہ کا کرتا سیا۔ کہ سردی سے مر نہ جائے لیکن جب وہ پہنانے لگی تو کیا دیکھتی ہے کہ وہ پانچ چھ سال کا بن گیا ہے۔ پھر وہ سات آٹھ سال کے بچے کے اندازہ کا کپڑا سی کر لائی۔ مگر دیکھا کہ وہ تو داڑھی والا مرد بنا بیٹھا ہے۔

غرض فوراً پیدائش اور بڑھنے کی وجہ سے دنیا میں ایک ایسی آفت آجائے۔ کہ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں۔ کانوں کو ہاتھ لگائیں اور کہہ اٹھیں کہ ہم نے خدا کی قدرت دیکھ لی اور ہم اعتراضوں سے باز آئے۔

ایک لطیفہ مشہور ہے۔ کہ کوئی شخص باغ میں گیا اور جا کر دیکھا کہ زمین پر پھیلی ہوئی بیلوں کو تو بڑے بڑے پھل لگے ہوئے ہیں اور بڑے بڑے اونچے درختوں کو چھوٹے چھوٹے اسنے کہا لوگ تو کہتے ہیں اللہ میاں بڑا دانا ہے۔ مگر اس نے یہ کیا کیا ہوا ہے۔ انہی خیالات میں وہ ایک آم کے درخت کے نیچے سو گیا۔ اوپر سے ایک آم اس پر گرا۔ اور وہ اٹھکر کہنے لگا۔ اللہ میاں مجھے تیری اس حکمت کی سمجھ آگئی۔ اگر مجھ پر کدو گرتا تو میرا کام ہی تمام ہو جاتا تونے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ میری گستاخی تھی جو مینے اعتراض کیا۔

غرض خدا تعالیٰ کی قدرتوں پر اعتراض کرنیوالے اول درجہ کے جاہل ہوتے ہیں اور نادانی سے اس ذات پر اعتراض کرتے ہیں جو ان کو پیدا کرنیوالی ہے۔ اور جس کے مقابلہ میں وہ مکھی جتنی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔

خدا کی ہادی صفت پر اعتراض اور اسکا جواب پھر کہا جاتا ہے۔ کہ خدا کی ہادی

صفت نے کیا کیا۔ زیادہ دنیا تو گمراہی کی طرف جا رہی ہے +

اگر اس اعتراض کا یہ مطلب ہے کہ خدا کسی کو بُرے کام کیوں کرنے دیتا ہے۔ تو اسکے یہ معنی ہوئے۔ کہ خدا لوگوں پر جبر کیوں نہیں کرتا؟ گویا جب کوئی شراب پینے جائے تو اسے روک دے لیکن اگر یہ حالت ہو۔ تو پھر کوئی انعام کا کس طرح مستحق ہو۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے معترض اعتراض کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں۔ کہ دنیا کو خدا نے کیوں پیدا کیا ہے۔ اس بات کو بھلا کر اعتراض کرتے ہیں۔ یا پاگلانہ طور پر اعتراض کرتے ہیں۔ دنیا کو خدا تعالیٰ نے اسلئے پیدا کیا ہے۔ کہ انسانوں کو انعام اور ترقیاں دے۔ لیکن اگر جبر ہوتا تو انعام دینا غلط ہوتا۔ پس خدا تعالیٰ نے انعام دینے کیلئے انسان کو نیکی اور بدی کا علم دیکر اسے قدرت دیدی ہے اور بتا دیا۔ کہ یہ کام کرو گے تو انعام ملیگا۔ اور یہ نہ کرو گے تو سزا۔ اور یہ صاف بات ہے۔ کہ انعام پانیوالے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ سارے نہیں ہوا کرتے۔ دیکھو یہ جو یونیورسٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں تیس پینتیس فیصدی طلبا پاس ہوتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ان کا کیا فائدہ ہے تو اسکے جاہل ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے مگر ان یونیورسٹیوں کے کام کا نتیجہ تو بہت ادنیٰ ہوتا ہے خدا تعالیٰ نے جس مقصد کیلئے انسان کو پیدا کیا ہے وہ بہت شاندار ہے اسلئے اسکا امتحان بھی بہت سخت ہے +

خدا نے امتحان آسان رکھا ہے۔

اگر کہا جائے۔ کہ اگر خدا تعالیٰ کا یہ منشا تھا کہ انعام دے۔ تو امتحان آسان رکھنا چاہئے تھا۔ اس کا یہ جواب ہے کہ اس سے زیادہ کیا آسان ہو سکتا ہے کہ اکثر نیکیاں خدا تعالیٰ نے وہی رکھی ہیں۔ جن میں انسان کا اپنا فائدہ ہے۔ ان کو نہ کرنا تو ایسا ہی ہے۔ جیسا کسی کو کہا جائے۔ کہ تم اپنے گھر کو لیپ پوت چھوڑنا۔ مگر وہ ایسا نہ کرے اور کہے کہ اتنا سخت کام ہے۔ اور مزدوری دیتے نہیں۔ تو میں کیوں کروں۔ دیکھو خدا تعالیٰ کہتا ہے چوری نہ کرو۔ اب اگر کوئی چوری کرتا ہے۔ تو اسکا کسے نقصان ہے۔ خدا تعالیٰ کو یا خود اسے؟ یا خدا تعالیٰ نے کہتا ہے۔ جھوٹ نہ بولو۔ اب اگر کوئی جھوٹ بولتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کا کیا نقصان خود اس کا اعتبار نہیں رہتا۔ اسی طرح جس قدر سوالات خدا نے اس امتحان میں پاس ہونے کیلئے دیئے ہیں۔ وہ انسان کے ہی فائدہ کیلئے ہیں۔ اور چند ایک ایسے بھی ہیں جو بظاہر انسان کے

دنیوی یا اخلاقی فائدہ کے نظر نہیں آتے جیسے نماز۔ روزہ۔ حج اور زکوٰۃ کے احکام ہیں مگر درحقیقت ان میں بھی انسان کا ہی فائدہ مدنظر ہے۔ جیسا کہ نماز کے متعلق آتا ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ کہ نماز برائیوں اور بدیوں سے روکتی ہے سو اگر سوچا جائے تو خدا تعالیٰ نے امتحان اسطرح کا لیا ہے کہ اپنے دروازہ پر روغن مل دینا۔ چھت پر مٹی ڈال دینا اپنے کپڑے دھونا۔ کھانا دیکھکر کھانا۔ تاکہ اس میں مٹی وغیرہ نہ ہو۔ سردی کے وقت آگ جلانا تاکہ تمہاری صحت خراب نہ ہو۔ اور پھر پوچھے کہ کیا تم نے یہ کام کر لئے ہیں؟ اور جنہوں نے کئے ہوں۔ انہیں جنت میں داخل کر دے۔ اس سے زیادہ آسان اور کیا امتحان ہو سکتا ہے؟ اس سے آسان تو پھر یہی ہو سکتا ہے کہ کہدیا جائے جو مرضی ہو کرو۔ تمہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

کیا خدا کی بعض صفات بعض سے افضل ہیں؟

صفات الٰہیہ کے متعلق یہ بھی ایک سوال ہو سکتا ہے کہ کیا خدا کی بعض صفات بعض سے افضل ہیں؟ اس کا یہ جواب ہے کہ افضل نہیں ہوتیں بلکہ ہر ایک کے الگ الگ دائرے ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک انتظام کے ماتحت ہوتی ہیں۔ ہاں کبھی یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ بعض بعض سے وسیع ہوتی ہیں یعنی بعض کا ظہور زیادہ وسیع ہوتا ہے بعض کی نسبت۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ رحمتی وسعت کل شئی۔ کہ میری رحمت ہر ایک چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یعنی مخلوق پر صفات غضبیہ کی نسبت صفات رحمت کا ظہور زیادہ ہوتا ہے۔ پس ہم صفات کیلئے لفظ وسعت کا استعمال کرتے ہیں۔ فضیلت کا نہیں۔ کیونکہ ایک صفت کو دوسری سے افضل کہنا بے ادبی ہے۔

کیا خدا کی صفات ایکدوسری کے متضاد ہو سکتی ہیں؟

پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی صفات ایک دوسری کے متضاد ہیں تو ان کا عمل کسطرح ہوتا ہے؟

اسکا جواب یہ ہے۔ کہ ایک وجود میں دو باتوں کا پایا جانا تضاد نہیں ہوتا۔ تضاد تو یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک چیز آجائے۔ تو دوسری نہ ہو سکے۔ اور یہ بات خدا تعالیٰ کی صفات کے متعلق نہیں کہی جا سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر خدا رحیم ہے تو پھر شدید العقاب کیونکر ہو سکتا ہے؟ اگر رحیم ہے تو وہ شدید العقاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر شدید العقاب ہے تو رحیم نہیں ہو سکتا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس اعتراض کے اُٹھانیوالے اپنے متعلق ہی غور کریں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ فلاں شخص رحم دل ہے۔ لیکن دوسرا شخص جواب دے کہ نہیں وہ رحم دل نہیں کل میں نے اسے اپنے لڑکے کو مارتے دیکھا تھا۔ تو کیا یہ بات صحیح تسلیم کیجائے گی؟ ہرگز نہیں کیونکہ وہ رحم کے موقع پر رحم کرتا ہے۔ اور سزا کی ضرورت کے وقت سزا دیتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر شدید العقاب ہی تو رحیم نہیں ہو سکتا۔ اور اگر رحیم ہے تو شدید العقاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ رحم کے موقع پر رحم کرتا ہے۔ اور سزا کے موقع پر سزا دیتا ہے۔ اور سزا کے موقع پر یعنے جہاں سزا سے اس شخص کی اصلاح مدنظر ہو جسے سزا دیگئی ہے سزا کا دینا ہرگز رحم کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ رحم ہی کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے +

اسجگہ ایک اور اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ انسان میں رحم اور غضب الگ الگ موقعوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن خدا میں تو تم ایک ہی وقت میں ساری باتیں مانتے ہو تمہارے نزدیک خدا کے حکم سے ایک ہی وقت ایک کے ہاں بیٹا پیدا ہو رہا ہے۔ اور اسی لمحہ میں دوسرے کے ہاں موت واقع ہو رہی ہے۔ ادھر نبی پر وہ برکتیں نازل کرتا ہے۔ اور دوسری طرف اسی وقت کافروں پر لعنت ڈال رہا ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ محدود وجود کے اعمال محدود ہوتے ہیں۔ انسان ایک وقت میں دو باتوں پر غور نہیں کر سکتا۔ لیکن خدا تعالےٰ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ غیر محدود طاقتیں رکھتا ہے وہ جس طرح ایک ہی وقت میں ساری دنیا کے کاموں کو معلوم کر لیتا ہے اسی طرح ایک ہی وقت میں اس کی صفت رحم اور صفت شدید العقاب کام کر رہی ہوتی ہیں۔ انسان کی طاقتوں پر خدا کی قدرتوں کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ لیس کمثلہ شئی ہے +

تمام صفات الٰہیہ کا ظہور کس طرح ہوتا ہے؟

یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ خدا تعالیٰ کی مختلف صفات ایک وقت میں کس طرح جاری ہوتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی ایک صفت ایسی بھی ہے جو بعض اصول کے مطابق بعض صفات کو جاری کرتی ہے اور بعض کو بند کرتی ہے۔ یہ صفت بعض آیات قرآن کریم سے بھی مستنبط ہوتی ہے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعض الہامات سے بھی معلوم ہوتی ہے

اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا تعالیٰ کے متعلق شافی کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں یہ لفظ اس طرح خدا تعالےٰ کیلئے نہیں گو مضمون سے مستنبط ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ شافی ہے۔ جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول قرآن کریم میں نقل ہے کہ فھو یشفین +

حضرت مسیح موعود پر خدا کی ایک خاص صفت کا اظہار

حضرت مرزا صاحب بھی چونکہ نبی تھے۔ اور آپ نے لکھا ہے کہ نبی غوامض بیان کرنے کیلئے آتے ہیں یعنی مخفی امور نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ تو آپ بھی چونکہ نبی تھے۔ اسلئے ضروری تھا کہ غوامض بیان کرتے۔ انہی میں سے ایک بات یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی کئی صفتیں ایسی بیان کی ہیں جو خدا تعالیٰ نے آپ پر کھولی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کی صفات میں سے ایک صفت ایسی بھی ہے جو مختلف صفات کی حد بندیوں کو ظاہر کرتی ہے۔ اس صفت پر حضرت مسیح موعود کا مندرجہ ذیل الہام دلالت کرتا ہے:۔

انی مع الرسول اقوم افطر واصوم

اب نہ افطر کا لفظ قرآن کریم میں خدا کے لئے آیا ہے اور نہ اصوم کا۔ اور جس طرح انسان کیلئے خدا کا کوئی اسم بنانا ناجائز ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کیطرف کوئی تشبیہی فعل منسوب کرنا بھی ناجائز ہے۔ مگر خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود کو خود آپکے الہام میں افطر و اصوم کے الفاظ استعمال کر کے بتایا ہے کہ اس کی صفات میں افطار و صوم کی مشابہ ایک صفت ہے جو صفات کے عمل کو جاری کرنے یا بند کرنیکا کام کرتی ہے۔ افطر سے مراد یہ ہے کہ میں اپنی صفت کو جاری ہونیکا حکم دیتا ہوں۔ اور اصوم کا یہ مفہوم ہے کہ میں اپنی صفت کے ظہور کو روک دیتا ہوں +

حضرت مسیح موعود کے ایک الہام کا مطلب

لوگ اس الہام پر اعتراض کرتے ہیں۔ کیونکہ اسکے لفظی معنے یہ ہیں، کہ میں روزہ رکھتا ہوں اور روزہ کھولا کرتا ہوں اور لغوی معنے یہ ہیں کہ میں رکتا ہوں۔ اور روک کے دور کرنے کے وقت کو پاتا ہوں۔ مگر مراد یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے۔ کہ میں بعض صفات کو روک دیتا ہوں۔ اور دوسرا وقت ایسا

آتا ہے کہ میں انہیں جاری کرتا ہوں۔ پس معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی ایک صفت ایسی ہے جو دوسری صفات سے کام لیتی ہے۔ بعض کو آگے پیچھے کرتی ہے۔ بعض کو روکتی ہے۔ اور بعض کو جاری کرتی ہے +

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر اس الہام کا یہی مطلب ہے۔ کہ خدا تعالےٰ ایک وقت اپنی صفات کو روکتا اور پھر جاری کرتا ہے۔ تو پھر افطر اور اصوم کیوں کہا۔ یہ کیوں نہ کہدیا کہ میں صفات کو روکتا بھی ہوں۔ اور کھولتا بھی ہوں +

الہام مسیح موعود کے پرحکمت الفاظ

اس کا جواب یہ ہو کہ خدا تعالیٰ کی باتیں وسیع معنے رکھتی ہیں اور میں رکتا ہوں اور کھولتا ہوں کہنے میں وہ لطف نہوتا جو افطر واصوم میں ہے۔ ان الفاظ کہکر خدا تعالیٰ نے اپنے فعل کو روزہ دار کے فعل سے تشبیہ دی ہے اور تین موٹی موٹی باتیں ہیں جو روزہ دار میں پائی جاتی ہیں۔ اول یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے رکتا ہے جو اسکے قبضہ اور اختیار میں ہوتی ہیں۔ مثلاً کھانا ہوتا ہے مگر وہ نہیں کھاتا۔ گویا وہ احتیاج کے طور پر نہیں رکتا بلکہ باوجود قدرت کے اپنی مرضی سے رکتا ہے۔ اسی طرح جب افطار کرتا ہے تو بھوک یا پیاس کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ اپنے ارادے کے ماتحت اور اپنی خوشی سے ایسا کرتا ہے +

گویا اس مشابہت سے خدا تعالیٰ نے یہ بتایا۔ کہ بعض صفات جن کو خدا تعالیٰ روکتا ہے اپنی مرضی سے روکتا ہے نہ بوجہ احتیاج کے اور بعض صفات جن کو کھولتا ہے ان کو بھی اپنی مرضی سے کھولتا ہے نہ کہ بسبب احتیاج کے +

دوسرے اس مشابہت سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ خالی رکنا اندرونی تکان کے سبب سے بھی ہو سکتا ہے یعنی گو بیرونی مجبوری کوئی نہو لیکن اپنے نفس میں تکان پیدا ہو جائے جیسے آدمی کھاتے کھاتے پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ لیکن روزہ دار اسلئے کھانے سے نہیں رکتا کہ وہ کھا نہیں سکتا۔ یا اس میں کھانے کی طاقت نہیں رہتی۔ بلکہ اپنی مرضی سے رکتا ہے۔ سو اس مشابہت سے بتایا کہ خدا تعالےٰ تھک کے اپنی صفات کو نہیں چھوڑتا اور نہ اس میں نئی طاقت آجاتی ہے تو ان کو جاری کرتا ہے بلکہ اپنی مرضی سے اور اپنی خاص

حکمت سے صفات کو جاری کرتا یا روکتا ہے۔ تیسری بات اس مشابہت سے یہ بتائی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات قہریہ ہمیشہ روحانی تاریکی کے وقت جاری ہوتی ہیں (کیونکہ یہ الہام صفات قہریہ کے متعلق ہے) اور یہ صفات روحانی صفائی پیدا ہونے پر روک لی جاتی ہیں کیونکہ صوم یعنی رکنے کا وقت نور کے شروع ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ اور افطار ظلمت کے شروع ہونے سے۔ تو گویا اس مشابہت کے ذریعہ سے حضرت مسیح موعود کو اس الہام میں عذاب کے متعلق بتایا گیا۔ کہ جب نیکی اور تقویٰ ہوتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ عذاب دینے کی صفات کو روک دیتا ہے۔ اور جب ظلمت اور تاریکی پھیل جاتی ہے۔ لوگ گناہوں اور بدکاریوں میں بکثرت مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو ان صفات کو چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ لوگ تباہ و برباد ہوں +

اب دیکھو کتنی وسیع اور پرحکمت تعلیم اس میں بیان کی گئی ہے۔ کہ جب نور جاری ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ عذاب کی صفتوں کو روک دیتا ہے۔ اور جب بدی پھیل جاتی ہے۔ تو ان کو کہہ دیتا ہے کہ اب تمہارا دور جاری ہو جائے +

الہام مسیح موعود کے ایک اور معنے

پھر خدا کی صفت خلق قائم مقام نور ہے۔ اور عدم قائم مقام ظلمت۔ چنانچہ عربی میں خلق کو فلق بھی کہتے ہیں اور فلق کے معنے پو پھٹنے کے ہیں۔ گویا مخلوق بھی نور ہوتی ہے۔ اور عدم کیا ہوتا ہے؟ کچھ نہ ہونا۔ اب ہونا تو روشنی ہوئی اور نہ ہونا اندھیرا۔ اسلئے افطروا صوم کے یہ معنی ہوئے۔ کہ خدا کی بعض صفات ایسی ہیں جو عدم کے وقت جاری ہوتی ہیں اور بعض وجود کے وقت۔ جیسے کہتے ہیں کہ اب مادہ کو خدا کیوں نہیں پیدا کرتا اسی لئے کہ جب عدم تھا تو خدا تعالیٰ کی مادہ کو پیدا کرنے کی صفت جاری ہو گئی۔ اور جب وجود میں آگیا تو اب مخلوق کے قائم رکھنے کی صفات جاری ہو گئیں +

تو یہ کتنا بڑا علم ہے۔ جو حضرت مسیح موعود کے اس الہام سے ظاہر ہوا۔ اب دشمن اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ کیا خدا بھی کھانا کھاتا ہے۔ کہ اسنے چھوڑ دیا۔ ہم کہتے ہیں معترض نادان ہیں۔ جو خدا کے کلام کے معارف نہیں جانتے۔ خدا تعالیٰ نے ایسا علم حضرت مسیح موعود کے ذریعہ دیا ہے۔ اور آپنے وہ غوامض بیان فرمائے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے بعد ۱۳ سو سال میں کسی نے نہیں بیان کئے۔ یہ ایک ہی الہام دیکھ لو۔ کتنے وسیع مضمون اس میں بیان کئے گئے ہیں ◆

خدا کی صفات کس طرح جاری ہوتی ہیں؟

اب یہ بات رہ گئی کہ خدا کی صفات کس طرح جاری ہوتی ہیں؟ اسکے متعلق پہلے تو یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ بندوں سے خدا تعالےٰ کی جو صفات تعلق رکھتی ہیں ان میں خدا نے رحمت کا وسیع دائرہ کھینچا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے رحمتی وسعت کل شیئٍ میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ تو اس صفت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور یہ سب صفات کے ظہور پر غالب ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ خدا تعالےٰ کے علم پر بھی رحمت ہی غالب ہے۔ شائد اس بات پر تعجب ہو کہ خدا تعالیٰ کے علم پر رحمت کس طرح غالب ہے۔ مگر اس کا پتہ اس سے لگتا ہے۔ کہ مبشرات خدا تعالیٰ کی طرف سے زیادہ آتے ہیں۔ اور منذرات کم۔ حتیٰ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر منذر رؤیا زیادہ آئیں تو شیطانی ہوتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے منذر رؤیا نہیں آتیں۔ کیونکہ ایسی خوابیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی آتی تھیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جسے ڈراونی خوابیں ہی آتی رہیں وہ خدا کیطرف سے نہیں ہوتیں کیونکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جس شخص کو متواتر سلسلہ الہامات کا جاری ہو اس میں مبشرات کا پہلو غالب ہوتا ہے کیونکہ متواتر الہام خدا کے پیاروں کو ہی ہو سکتے ہیں اور جو پیارے ہوں وہ عذاب کی نسبت انعام کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ غرض خدا تعالےٰ کا علم جو بندوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پر بھی اس کی رحمت وسیع ہوتی ہے۔ اور دنیاوی علوم کے انکشاف میں بھی صفت رحمت ہی وسیع ہے۔ کیونکہ جو علوم دریافت ہوتے ہیں ان میں رحمت کا پہلو غضب کے پہلو پر غالب ہوتا ہے ◆

خدا کی صفت رحمت کی وسعت

یہ وسعت کئی طریق پر ہوتی ہے۔ ایک تو اس طرح کہ انسان گناہ کرتا ہے۔ اور خدا تعالےٰ معاف کر دیتا ہے۔ کئی قسم کی بدپرہیزیاں انسان کرتا ہے۔ مگر اکثر ان کے نتائج سے بچ جاتا ہے اور کبھی پھنس بھی جاتا ہے ◆

دوسرے اس طرح کہ خدا تعالےٰ گناہوں کی سزا میں جس کا وہ کسی وجہ سے مستحق ہوتا ہے

کمی کر دیتا ہے۔ اور جس قدر سزا دیجاتی ہے اس میں بھی رحمت غالب رہتی ہے۔ تو سزا جو شدید العقاب صفت کے ماتحت ہوتی ہے۔ اسپر بھی رحمت ہی محیط ہے۔ گویا سب سے بڑا دائرہ رحمت کا ہے۔ اور اس کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ سزا بالکل معاف کرا دیتی ہے۔ دوسرا یہ کہ سزا کم کرا دیتی ہے۔ اور تیسرا یہ ہے کہ اگر سزا ملے تو آخر میں بند کرا دیگی۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دن دوزخ میں سے سب لوگ نکال لئے جائینگے۔ اور ہوا دوزخ کے دروازے کھٹکھٹائیگی +

دوسرے اس صفت کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ گناہوں سے بچنے کے سامان پیدا کرتا رہتا ہے۔ نبی بھیجتا ہے۔ مجدد آتے ہیں۔ مامور مقرر ہوتے ہیں۔ اور پھر مشکلات اور مصائب آتے ہیں تاکہ بندہ کی توجہ خدا کی طرف پھیریں +

چوتھے اس طرح کہ جب خدا تعالیٰ کسی کے متعلق کسی سزا کا حکم دیتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کی دوسری صفاتِ رحمت نہیں روکی جاتیں بلکہ مختلف صفات اپنے اپنے حلقہ میں کام کرتی رہتی ہیں۔ ایک دوسری کے راستہ میں روک نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کسی پر خدا تعالےٰ کی ناراضگی ہو اور جس رنگ کا اسنے قصور کیا ہے اسکے مطابق کوئی صفتِ رحمت اس سے روک لیجائے تو یہ نہیں کیا جائیگا کہ دوسری صفات رحمت کو بھی اس سے روکدیا جائے وہ پہلے کی طرح اس شخص کو اپنے اپنے دائرہ عمل میں فائدہ پہنچاتی رہینگی یہ خدا تعالےٰ کا فعل انسانی افعال سے بالکل مختلف ہے۔ کسی انسان کا کوئی نوکر جس کو اسنے ہزار روپیہ خرچ کرنے کیلئے دیا ہو۔ اسمیں کچھ خیانت کرلے تو وہ اس کو نوکری سے ہٹا دیگا۔ پھر اسی پر بس نہ کرے گا بلکہ اس سے بولنا بھی ترک کر دیگا۔ اور سارے تعلقات قطع کرلیگا۔ اسکے برخلاف خدا تعالیٰ کسی گناہ کی وجہ سے کسی صفت رحمت کو روک لیتا ہے تو باقی رحمت کی صفات کو بند نہیں کر دیتا۔ بلکہ ان کو بھی جاری رکھتا ہے۔ مثلاً نبی کے مخالفوں کے متعلق ادھر تو صفت شدید الانتقام جاری ہوگی کہ جو اس کا شدید مخالف ہے۔ اسے مار دو۔ مگر ادھر خدا تعالیٰ کی صفت ستاری بھی اپنا عمل کر رہی ہوگی۔ اسکے دل میں جو کچھ گند ہوتا ہے اسکو ظاہر نہیں کیا جائیگا۔ لوگوں کو اسکے پوشیدہ در پوشیدہ گناہ نہیں بتلائے جائینگے۔ اگر بیماری کا حکم ہوا ہے تو جائدادیں برابر محفوظ رہینگی رزق ملتا رہیگا پھر مرنے کے بعد بھی خدا تعالیٰ کی محی کی صفت جاری ہوگی

اسکو زندہ کیا جائیگا۔ اور اصلاح کی صفت جاری ہوگی۔ جہنم کے علاج کے ذریعہ سے اس کی روحانی بیماریوں کو دور کیا جائیگا۔ غرض خدا تعالیٰ کی صفات کے جاری ہونے کا اور قاعدہ ہے۔ ہمارا تو یہ حال ہوتا ہے کہ اگر کسی سے محبت ہوئی تو ہر رنگ میں محبت ہی کیجاتی ہے اور اگر ناراضگی ہوئی تو ہر رنگ میں ناراضگی ظاہر کیجاتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اگر اپنی ایک صفت کو انسان کی کسی غلطی سے روکتا ہے تو باقی صفات کو جاری رکھتا ہے۔ غرض خدا کی صفات کا دائرہ مقرر ہے اور وہ اپنے اپنے دائرہ میں کام کرتی ہیں۔ اور ان میں رحمتی وسعت کل شئ کا نظارہ نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک کافر ہے جو اچھا بھلا ہے۔ اسکے گناہوں کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ کہ اسے پاگل کردو۔ اور اسے پاگل کر دیا جاتا ہے۔ اگر ہمارا اتنا اختیار ہو۔ تو ایسے شخص کا گلا ہی گھونٹ دیں اور اسے ماردیں۔ مگر ادھر خدا تعالیٰ کی صفت شدید العقاب کہہ رہی ہوتی ہے۔ کہ اسے پاگل کردو۔ مگر ادھر خدا تعالیٰ کی صفت رزاق کہہ رہی ہوتی ہے کہ یہ ہمارا بندہ ہے اسکو رزق دو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی اور صفات بھی جاری ہوتی ہیں +

خدا کی صفات کے متعلق ایک اور قانون

دوسرے خدا تعالیٰ کی صفات کے ظہور کیلئے یہ بھی قانون ہے کہ وہ اس قانون کی تائید کرتی ہیں جو قانون قدرت کہلاتا ہے۔ اس قانون کے ماتحت انسان کے اعمال یا دنیا کے تغیرات جو رنگ اختیار کر لیتے ہیں اسکے مطابق خدا تعالیٰ کی صفات ظاہر ہوتی رہتی ہیں گویا اس طرح وہ انسانی اعمال یا طبعی تغیرات کی مددگار ہو جاتی ہیں جیسا جیسا عمل ہو اسکے مطابق نتیجہ نکلتا چلا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس قاعدے کے متعلق فرمایا ہے کہ کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ۔ ہر شخص جس قسم کی کوشش کرتا ہے اسکے مطابق ہم قطع نظر اسکے کہ وہ مومن ہے کہ کافر نتائج نکالتے رہتے ہیں +

خدا کی صفات کے دو چکر

تیسرا قاعدہ ظہور صفات کے متعلق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات دو دائروں میں کام کرتی ہیں جس طرح زمین کی دو حرکتیں ہیں ایک اپنے اردگرد اور ایک سورج کے گرد۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی صفات کا ایک تو ایسا فرض ہے۔ جو ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ سوائے اسکے کہ احدیت کے مقابلہ میں آئے۔ اگر اس کے مقابلہ میں آئے تو فوراً بند ہو جاتا ہے۔ دوسرا چکر ان کا یہ ہے کہ انسان اپنے عمل سے جب ان کے اثر کو کھینچے تو انکا اثر ظاہر ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ آگے ان صفات کا کھینچنا دو طرح ہوتا ہے۔ ایک قانون قدرت کی مدد سے۔ اور دوسرے بذریعہ دعا۔ مثال پہلی بات کی یعنے

صفات الٰہیہ کے ہر وقت ظاہر ہونے کی یہ ہے کہ رزق خدا تعالیٰ ایک رنگ میں ہر وقت دے رہا ہے۔ انسان کے جسم کے ہر ایک ذرے کو اگر خون نہ ملے۔ تو انسان مرجائے۔ اسی طرح ہوا انسان کے اندر جا رہی ہے جس سے خون صاف ہوتا ہے۔ ہر وقت خدا تعالیٰ کی صفات یہ ضرورت پوری کر رہی ہیں۔ خواہ انسان سوتا ہو یا جاگتا۔ ہوش میں ہو یا بے ہوشی میں۔ اسی طرح ستر ہے۔ ہر وقت ستر ہو رہا ہے۔ خدا تعالےٰ نے قانون رکھا ہے کہ انسان کے دماغ کا حال دوسرے کو معلوم نہو۔ انسانی دماغ میں بیسیوں گندے خیال گذرتے ہیں۔ اگر یہ صفت نہوتی تو لوگ آپس میں ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے۔ کوئی کسی کو ملنے کیلئے جاتا۔ مصافحہ کرتا اور اسے مارنے لگجاتا۔ کہ تمہارے دل میں میرے متعلق فلاں بُرا خیال آیا تھا۔ اسی طرح میاں بیوی کے دل میں ایک دوسرے کے متعلق کبھی کوئی بُرا خیال آتا۔ تو وہ ایک دوسرے کو معلوم ہو جاتا۔ اور ان کی محبت میں فرق آجاتا۔ تو خدا تعالےٰ کی ستاری کی صفت بھی ہر وقت اپنا عمل کر رہی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کی غفاری کی صفت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں برابر گناہ ہو رہے ہیں کہیں جسمانی اور کہیں شرعی۔ جس طرح کھانے میں کبھی بے احتیاطی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی جسم کے ذرات بھی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ بیماریوں کے کیڑے جسم میں داخل ہوتے رہتے ہیں مگر ان بے اعتدالیوں میں سے اکثر کے اثر کو خدا تعالےٰ کی صفات رحمت آپ ہی آپ مٹاتی رہتی ہیں صحت پیدا کرنیوالے اجزا فوراً بیماری کے اثرات کو مٹا دیتے ہیں بیماری کے کیڑوں کے مقابلہ میں ان کو ہلاک کرنیوالے کیڑے یا زہر پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔

معترضین اعتراض کرتے ہیں کہ خدا نے انسان پر کیا رحم کیا۔ مگر طب سے پتہ لگتا ہے کہ ۹۹ فیصدی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کی انسان کے اندر ہی اندر اصلاح ہو جاتی ہے۔ تو ایک تو صفات الٰہیہ کا ظہور ہر آن میں ہو رہا ہے۔ اور وہ کسی وقت معطل نہیں ہوتیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ سمیع ہے۔ اگر کوئی منہ سے دعا نہیں کرتا تو اس کا ذرہ ذرہ خدا تعالےٰ سے مدد کی التجا کر رہا ہوتا ہے۔ پھر وہ مجیب ہے وہ ہر ایک عضو کی پکار کو سنتا ہے۔

دوسرا حصہ" صفات کا یعنے جو بلانے سے ظاہر ہوتا ہے دو قسم کا ہے۔ ایک وہ جس کی مدد قانون قدرت کے ذریعہ سے حاصل کیجاتی ہے۔ دوسرا وہ جس کی مدد قانون قدرت نہیں

بلکہ قانون شریعت کے ذریعہ سے حاصل کیجاتی ہے۔ قانون قدرت کے ذریعہ سے جن صفات کی مدد حاصل کیجاتی ہے ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی کھانا پکاتا ہے تو ضرور اسکا کھانا پک جائیگا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی ایک صفت تو ظاہر ہوگی لیکن اسکا ظہور انسانی فعل کے نتیجہ میں ہوگا یا مثلاً ستاری کی صفت کو لیلو اس صفت کے ظہور کیلئے خدا تعالیٰ نے ایک قانون بنا رکھا ہے۔ اگر اسکے ماتحت کوئی شخص چوری بھی کریگا تو بچ جائے گا۔ مثلاً اندھیرے میں چوری کرے۔ اس امر کی احتیاط کرے کہ کوئی دیکھتا نہو لیکن اگر اس قانون کی خلاف ورزی کریگا تو اس کی چوری ظاہر ہو جائے گی۔ اسی طرح خدا تعالےٰ کی غفاری کی صفت ہے۔ اگر انسان بدی کے ساتھ نیکی کرتا ہے یا بدپرہیزی کے ساتھ علاج کرتا رہے تو اس صفت کا اثر ظاہر ہوتا رہتا اور ایک حد تک بد نتائج سے انسان بچتا رہتا ہے۔

دوسرا ظہور ان صفات کا شرعی ذرائع سے ہوتا ہے۔ جیسے مثلاً دعا سے۔ دعا طبعی قانون کا جزو نہیں بلکہ شرعی قانون کا جزو ہے اور اسکے ذریعہ سے بھی خدا تعالےٰ کی وہ صفات جو خاص اوقات میں ظاہر ہوتی ہیں جلوہ گری کرتی ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ اس ذریعہ سے جسقدر صفات الٰہیہ کو متحرک کیا جاسکتا ہے اس قدر قانون طبعی کے ذریعہ سے بھی نہیں کیا جاسکتا +

غرض خدا تعالیٰ کی صفات مختلف دائروں میں عمل کر رہی ہیں۔ اگر ان کو مدنظر رکھا جائے تو صفات الٰہیہ کے ظہور کا مسئلہ مشتبہ ہو جاتا ہے +

کیا خدا سے تعلق ہو سکتا ہے؟

خدا تعالےٰ کے متعلق ان معلومات کے حاصل ہونے کے بعد جو اوپر بیان کی گئی ہیں طبعًا انسان کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے خدا سے میرا بھی کوئی تعلق پیدا ہوسکتا ہے؟ اسلام کہتا ہے کہ ہاں ہوسکتا ہے۔ اور اسکا طریق یہ ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں ان اللہ وتر یحب الوتر۔ خدا وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے۔ پھر فرمایا ان اللہ جمیل یحب الجمال کہ خدا خوبصورت ہے۔ اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے +

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بندہ کا خدا سے تعلق پیدا کرنا جائز رکھا گیا ہے۔ اور طریق یہ بتایا ہے۔ کہ انسان خدا کی صفات کو اپنے اندر لے اور اپنے اوپر منعکس کرے۔ اسیطرح ایک اور حدیث ہے جس سے تعلق پیدا کرنے کا پتہ لگتا ہے۔ اور وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں جو شخص ان کو یاد کرے وہ جنت میں جائیگا حِفظ کے معنے محفوظ کرنے کے ہیں۔ اور ضائع نکرنے کے۔ اسلئے حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جب انسان خدا کی صفت غفاری کا لفظ سُنے تو اسے ضائع نہونے دے بلکہ اپنے اندر اسکے مفہوم کو پیدا کرلے۔ اسی طرح جب رحمٰن کی صفت سُنے تو اس صفت کو اپنے اندر محفوظ کرلے۔ ورنہ اسکا یہ مطلب نہیں کہ جو خدا کے ۹۹ نام یاد کرلے۔ وہ جنت میں چلا جائیگا۔ کیونکہ اسطرح تو جنت ایک کھیل بنجاتا ہے۔ پس حق یہی ہے کہ حفظ کے معنے محفوظ کر لینے اور باہر نہ نکلنے دینے کے ہیں۔ اور اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان سبحان۔ قدیر۔ رحمٰن۔ رحیم وغیرہ بنجائے۔ اور وہ انسان جو اپنے اندر خدا تعالےٰ کی ۹۹ صفتیں پیدا کرلیگا وہ جنت میں نہ جائیگا۔ تو پھر اور کون جائیگا؟

رویت الٰہی جب اسبات کا پتہ لگجائے کہ انسان خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا کرسکتا ہے۔ تو عالم ہی بدل جاتا ہے۔ پہلے تو یہی سوال تھا کہ خدا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اسکی کیا صفات ہیں؟ جب صفات کا پتہ لگا تو ان پر غور کیا۔ کہ ان کا ہم پر کیا اور کس طرح اثر پڑتا ہے؟ پھر جب معلوم ہوا کہ وہ نہایت وسیع ہیں۔ اور پھر یہ معلوم ہوا کہ وہ صفات میرے اندر آسکتی ہیں۔ اور اس طرح خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا ہوسکتا ہے۔ تو اس مقام پر انسان کے خیالات میں عجیب تغیر پیدا ہو جائیگا۔ اس وقت کی اسکی حالت ایسی ہی سمجھ لو جیسے کسی بچہ کو شہر میں لیجائیں۔ وہ ضرور کہیگا کہ بس یہ چیز بھی لیلوں۔ اور یہ بھی لیلوں۔ اسی طرح بندہ کا حال ہوگا۔ جب مذکورہ بالا طاقتوں والا خدا ثابت ہوگیا تو اسکے دلمیں طبعاً خواہش ہوگی کہ میں اسے دیکھوں اور اسکا قرب حاصل کروں اور وہ ضرور سوال کریگا کہ کیا رویت الٰہی حاصل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ اسلئے کہ پچھلے علمائے روحانی میں اسکے متعلق اختلاف ہوا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ رویت الٰہی ناممکن ہے۔ کیونکہ خدا وراء الورٰی ہے۔ اور بندہ مادی ہستی ہے۔ اسلئے ممکن ہے کہ

بندہ خدا کو دیکھ سکے۔ بندہ بندہ ہے اور خدا خدا۔ پس رویت الٰہی بندہ کیلئے نہ اس دنیا میں ممکن ہے اور نہ اگلی دنیا میں۔ کیونکہ وہاں بھی وہ بندہ ہی رہیگا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ خدا کو خواب میں دیکھنا بھی ناممکن ہے۔ اگر انسان خواب میں خدا کو دیکھ سکتا تو ان آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا۔ اسلئے وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی خواب میں خدا کو دیکھے۔ تو شیطان دھوکہ دینے کیلئے اسے دکھائی دیتا ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں کہ اس جہان میں انسان خدا کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن اگلے جہان میں دیکھ لیگا۔

(۳) بعض کہتے ہیں کہ دونوں جہان میں خدا کو دیکھنا ممکن ہے۔ یہاں بھی انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے اور اگلے جہان میں بھی دیکھیگا۔

رویت الٰہی سے مراد کیا ہے؟

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ دونوں جہان میں خدا کو دیکھنا ناممکن ہے ان کو ہم کہتے ہیں۔ تمہارے اس خیال کی بنیاد اس بات پر ہے کہ خدا وراء الوریٰ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رویت الٰہی سے مراد کیا ہے؟ آیا یہ کہ انسان خدا کی ذات پر محیط ہو جائے۔ اگر یہ ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ کہ اس طرح انسان خدا کو کہیں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر رویت الٰہی سے یہ بھی مراد نہیں ہو سکتی۔ کہ خدا تعالیٰ کی صورت نظر آئے کیونکہ جو لوگ رویت کے قائل ہیں وہ خدا تعالےٰ کی کوئی صورت تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی مراد اگر رویت الٰہی سے کچھ ہے تو یہی کہ خدا تعالیٰ کی صفات تنزل اختیار کر کے تمثیلی صورت میں آتی۔ اور انسان انکا جلوہ دیکھتا ہے یا یہ کہ اپنے قلب میں انسان خدا تعالیٰ سے ایک ایسا روحانی اتصال پاتا ہے کہ اسے سوائے دیکھنے کے اور کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتا اور اس قسم کی رویت کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اس طرح اور کئی چیزوں کو انسان دیکھ لیتے ہیں۔ مثلاً علم اور حیا شکل اختیار کر کے آجاتی ہیں۔ اور ہم دیکھ لیتے ہیں۔ حالانکہ علم اور حیا معانی ہیں اجسام نہیں پس اگر خدا تعالیٰ کی بعض صفات اگر بطور تنزل بندے کیلئے متمثل ہوں یعنی تمثیلی زبان میں ان پر بندہ کو آگاہ کیا جائے تو یہ بات بندہ کیلئے اسی طرح مفید ہوگی جس طرح کسی وجود کا دیکھنا مفید ہو سکتا ہے اور اگر قلب پر صفات الٰہیہ کی تجلی ہو

تو یہ بھی ویسی ہی بلکہ اس سے بھی بڑھکر مفید ہوگی +

موٹی مثال ہے۔ کلام اللہ نازل ہوتا ہے۔ ہم اسے پڑھجاتے ہیں اسکے بعد لفظ تو غائب ہوجاتے ہیں مگر ایک بات انسان کے اندر پیدا ہوجاتی ہے جو ہمیشہ اسکے ساتھ رہتی ہے۔ پس معانی کا شکل اختیار کرنا کوئی بعید بات نہیں۔ اسی طرح خدا تعالےٰ کی صفات کو تصویری زبان میں دکھا دیا جانا بھی ناممکن نہیں ہے +

حضرت موسیٰؑ اور رویٔت الہٰی

وہ لوگ جو کہتے ہیں۔ کہ اگلے جہان میں خدا کی رویٔت ہوسکیگی اس جہان میں نہیں ہوسکتی۔ وہ مندرجہ ذیل آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا وکلمہ ربہ قال رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی فلما تجلیٰ ربہ للجبل جعلہ دکاً وخر موسیٰ صعقا فلما افاق قال سبحانک تبت الیک وانا اول المؤمنین (اعراف رکوع ۱۷)۔ وہ کہتے ہیں دیکھو قرآن سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ خدا کے پاس گئے اور جاکر کہا اے خدا مجھے اپنا وجود دکھا۔ اللہ نے کہا تو ہرگز نہیں دیکھیگا۔ اور کہا کہ پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اگر وہ ٹھہرا رہا۔ تو تم بھی دیکھ لوگے۔ لیکن جب پہاڑ پر بجلی گری اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ تو حضرت موسیٰ بے ہوش ہوگئے۔ اور جب انہیں افاقہ ہوا تو کہا اے اللہ تو پاک ہے میں توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا مومن بنتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رویٔت الہٰی ناممکن ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے اس کی خواہش کی۔ مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ بے ہوش ہوگئے +

پہلا جواب اس کا یہ ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ رویٔت الہٰی نہیں ہوسکتی۔ درست نہیں۔ کیونکہ جواب میں یہ نہیں کہا گیا کہ تو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکیگا بلکہ کہا گیا ہے کہ لن ترانی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکیگا۔ اب اگر اسکے یہ معنی ہیں کہ رویٔت الہٰی ناممکن ہے تو پھر اگلے جہان میں بھی وہ ناممکن ہوگی۔ اسلئے جو لوگ اگلے جہان میں رویٔت کے قائل ہیں انہیں بھی اس آیت کی کوئی توجیہ کرنی پڑے گی +

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ جو خدا تعالےٰ کے نبی تھے کیا وہ یہ نہ سمجھ سکتے تھے

کہ رویت الٰہی ممکن ہے یا نہیں۔ اگر کوئی اور معمولی بات ہوتی تو اور بات تھی مگر یہ تو ایسا مسئلہ تھا کہ جس دن حضرت موسیٰ نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اسی دن پتہ لگ جانا چاہیئے تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو پہلے رویت ہوئی تھی۔ چنانچہ آتا ہے وھل اتٰک حدیث موسٰے اذرای نارًا فقال لاھلہ امکثوا انی انست نارًا لعلی اٰتیکم منھا بقبس او اجد علی النار ھدًی۔ فلما اتٰھا نودی یاموسیٰ انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوًی وانا اخترتک فاستمع لما یوحیٰ (طٰہٰ رکوع ۱)۔

حضرت موسیٰ نبی ہونے سے قبل آرہے تھے۔ کہ انہوں نے آگ کی روشنی دیکھی۔ اور سمجھ لیا کہ یہ جلوہ الٰہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ جب انہوں نے اس کو دیکھا تو اپنے اہل کو کہا کہ مینے ایک آگ دیکھی ہے۔ یہ ایک کا لفظ بتاتا ہے کہ موسیٰ جانتے تھے کہ یہ کشفی نظارہ ہے ورنہ وہ کہتے کہ وہ دیکھو آگ نظر آرہی ہے اور جب کشفی نظارہ تھا تو اس سے مراد جلوہ الٰہی ہی ہو سکتا ہے اور آگے جو لفظ قبس وغیرہ کے استعمال کئے گئے ہیں وہ بھی حقیقی آگ پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ جب کسی چیز کو کسی اور چیز سے تشبیہ دیجاتی ہے تو اس کی صفات کو بھی اس کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے جیسے کہ کسی کو شیر کہیں تو یہ نہیں کہینگے کہ وہ شیر کیطرح تقریر کرتا ہے بلکہ یہ کہ شیر کی طرح چنگھاڑتا ہے۔ پس چونکہ جلوہ الٰہی کا نام آگ رکھا گیا تھا اسلئے آگے اسکے آثار وغیرہ کا نام بھی انگارہ رکھا گیا۔ اور یہ جو حضرت موسیٰ نے کہا کہ میں انگارہ لاتا ہوں یا ہدایت پاکر آتا ہوں تو اسکا مطلب یہ تھا کہ حضرت موسیٰ نے اسوقت تک یہ نہیں سمجھا تھا کہ یہ جلوہ نبوت ہے یا جلوہ ولایت۔ اسلئے انہوں نے اپنے اہل سے کہا کہ اگر وہ ہدایت نبوت ہوئی اور حکم ہوا کہ دوسروں کو بھی تعلیم دو۔ تو تمہارے لئے بھی لاؤنگا۔ اور اگر ہدایت ولایت ہوئی جو اپنی ذات تک ہوتی ہے تو میں خود ہدایت پا جاؤنگا۔

پس جب وہ وہاں گئے۔ تو معلوم ہوا کہ جلوہ الٰہی ہے۔ اور کہا گیا کہ فاخلع نعلیک یعنے دنیاوی تعلقات چھوڑ دو۔ پس جب وہ وہاں جلوہ الٰہی دیکھکر آئے تھے۔ تو انہیں شک ہی کس طرح ہو سکتا تھا کہ رویت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ طور پر ان کی مراد رویت سے ذات کی رویت سے تھی تو یہ حضرت موسیٰ پر اتہام ہوگا کیونکہ وہ شخص

جو فرعون سے لمبے عرصہ تک خدا تعالیٰ کے وراء الوریٰ ہونے پر بحث کرتا رہا ہے کیا ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ یہ مطالبہ کرے کہ میں خدا تعالیٰ کی ذات کی حقیقی رویت کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا سوال تو پاگل کے سوا کوئی نہیں کر سکتا +

حضرت موسیٰ نے کس رؤیت کیلئے سوال کیا؟

اسپر سوال ہوتا ہے کہ پھر انہوں نے رؤیت کیلئے سوال کیوں کیا؟ اگر کہا جائے کہ جسطرح بھی چیز کو انسان بار بار دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے کیا۔ تو کہتے ہیں کہ پھر یہاں کیوں بیہوش ہوگئے؟ پہلی دفعہ کیوں بے ہوش نہ ہوئے تھے؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس مقام پر حضرت موسیٰؑ کو بتایا تھا کہ ہمارا ایک رسول (محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تیرا مثیل ہو کر مگر تجھ سے بہت اعلیٰ شان میں آئیگا۔ اس خبر کو معلوم کر کے حضرت موسیٰ کے دل میں طبعًا یہ خواہش پیدا ہوئی کہ دیکھوں تو سہی اسپر خدا تعالے کا کس رنگ میں جلوہ ہوگا۔ اور انہوں نے خواہش کی کہ مجھے بھی جلوہ محمدی دکھایا جائے میں بھی تو دیکھوں کہ اس وقت آپ کس شان سے ظاہر ہونگے؟ خدا تعالیٰ نے فرمایا تو اسکے جلوہ کو برداشت نہیں کر سکیگا۔ چنانچہ خدا تعالے نے ان کی خواہش تو پوری کر دی۔ مگر وہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جلوہ کو برداشت کر لیا کیونکہ آپکا وہ اصل مقام تھا +

لیکن اگر یہ معنے بھی نہ کئے جائیں تب بھی رؤیت کا امکان ثابت ہے کیونکہ منکرین رؤیت مانتے ہیں کہ موسیٰ کو خدا کی رویت سے غش آگیا تھا۔ تو ہم کہتے ہیں۔ تم تو کہتے ہو رویت ناممکن ہے پھر ناممکن کو دیکھنے کا کیا مطلب؟ دیکھو یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ سورج کو دیکھکر آنکھیں چندھیا گئیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علم کو دیکھکر آنکھیں چندھیا گئیں۔ پس یہ غش والا لفظ بتاتا ہے کہ کوئی ایسی چیز تھی جسے انہوں نے دیکھا اور جب انہوں نے کچھ دیکھا تھا گو اس سے بیہوش ہی ہوگئے ہوں مگر یہ تو معلوم ہوگیا کہ اس کا دیکھنا انسانی طاقت میں ہے +

پھر ہم کہتے ہیں اس آیت میں یہ کہاں لکھا ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ پر تجلی کی تجلی تو جبل پر کی ہے۔ پس جب خدا تعالیٰ کی تجلی ادنے مخلوق پر آ سکتی ہے۔ اور وہ برداشت

کر سکتی ہے۔ تو انسان جو اعلیٰ مخلوق ہے اسپر کیوں نہ آئی۔ اگر کہو کہ پہاڑ میں جو مخفی طاقتیں تھیں ان میں خدا ظاہر ہوا تو پھر حضرت موسےٰ نے اس تجلی کو دیکھا کس طرح؟

اگر کہا جائے کہ حضرت موسےٰ زلزلہ سے ڈر گئے تھے تو ہم پوچھتے ہیں۔ کیا مومن اور خاصکر نبی ایسے ہی بزدل ہوتے ہیں۔ اور اگر یہی بات تھی تو انہوں نے بیہوشی سے اٹھکر یہ کیوں کہا کہ انا اول المؤمنین وہ کس چیز پر ایمان لائے تھے؟ کیا اسبات پر کہ میں زلزلہ دیکھکر ڈر گیا تھا۔ ان الفاظ کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں اس رسول پر جسپر تیری اس شان سے تجلی ہونیوالی ہے سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ کی نسبت آیا بھی ہے کہ فامن و استکبرتم وہ تو ایمان لے آیا مگر تمنے تکبر کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسیوجہ سے فرماتے ہیں کہ لو کان موسیٰ و عیسےٰ حیین لما وسعھما الا اتباعے کہ اگر حضرت موسےٰ اور حضرت عیسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے سوا چارہ نہ تھا۔

حضرت موسیٰ کی توبہ اور اگر کہا جائے کہ اگر اس کا یہ مطلب ہے۔ تو حضرت موسیٰ کے توبہ کرنے کے کیا معنے ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو معنے تم کرتے ہو اسپر بھی یہی اعتراض پڑتا ہے کیونکہ اگر اسکے معنی گناہ سے توبہ کرنے کے ہیں۔ تو انہوں نے کیا گناہ کیا تھا؟ اگر نظارہ کے دیکھنے کی درخواست کرنا گناہ ہوتا تو خدا تعالیٰ اسی وقت ڈانٹ دیتا۔ جس طرح حضرت نوح ؑ نے جب اپنے بیٹے کیلئے دعا کی۔ تو خدا تعالیٰ نے ان کو روکدیا۔ تو چاہئے تھا کہ خدا تعالیٰ ان کو بھی منع فرما دیتا کہ ایسی بات مت کہو۔ نہ یہ کہ جس طرح انہوں نے چاہا اسی طرح کرنے لگجاتا۔ پس تبت الیک کے معنے گنہ سے توبہ کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اسکے یہ معنی ہیں کہ اے تمام صفات کے جامع خدا۔ تیرا اتنا بڑا درجہ ہے۔ کہ میں تیری طرف جھکتا ہوں۔ اور اس رسول کا اوّل مومن ہوں۔

بعض احادیث کا مطلب رویت الٰہی کے منکر یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں کہ لن یریٰ احد ربکم حتی یموت۔ کہ تم میں سے کوئی اپنے رب کو نہ دیکھیگا۔ جب تک مر نہ جائے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اس روئیت کے معنے وسیع نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قیامت والی رویت بیان کرتے ہوئے اس کی نفی کی ہے۔ کہ جب تک کسی پر

موت نہ آجائے۔ وہ اس قسم کی رویت نہیں پا سکتا۔ اور یہ ہم بھی مانتے ہیں۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے هل رئيت ربك فقال نور انی اراه یعنی لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا آپنے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ آپنے فرمایا کہ وہ تو نور ہے میں اسے کس طرح دیکھ سکتا ہوں؟ اس حدیث سے بھی منکرین رویت استدلال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا دیکھنا ناممکن ہے۔ مگر یہ حدیث سائل کے سوال کے جواب میں ہے۔ ممکن ہے سائل نے خدا کی ذات کے متعلق پوچھا ہو۔ کہ کیا آپنے اس کی ذات کو دیکھا ہے یا نہیں؟ اور اس کا جواب دیا گیا کہ میں اسے کیا دیکھ سکتا ہوں؟

رویت الٰہی کے متعلق احادیث

اب میں رویت کے دلائل بیان کرتا ہوں۔ قیامت میں رویت کے متعلق بہت سی احادیث میں ذکر آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کیلئے رویت کا امکان ثابت ہے۔ حدیث میں آتا ہے خیر الرؤیا ان یری ربه فی المنام او یری ابویه کہ اچھی خواب وہ ہے کہ انسان خدا کو یا ماں باپ کو خواب میں دیکھے جو نیک ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کو انسان دیکھ تو سکتے ہیں اور جب لوگ دیکھ سکتے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کیوں نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح معبرین لکھتے ہیں کہ اگر کوئی خواب میں خدا کو دیکھے۔ تو جنت میں جائیگا۔ خوابوں کی تعبیریں صلحاء کی خوابوں پر رکھی گئی ہیں۔ اگر یہ ٹھیک نہیں۔ تو ان کو خوابیں کس طرح آئیں۔ اور اگر خدا تعالےٰ کی رویت ناممکن ہے تو پھر علم تعبیر میں اسے بیان کیوں کیا گیا ہے؟

رویت کے مدارج

غرض جو آیات یا روایات رویت الٰہی کے رد میں پیش کیجاتی ہیں انکا وہ مطلب نہیں جو منکرین رویت سمجھتے ہیں اور دوسری آیات اور روایات ایسی ملتی ہیں جو رویت الٰہی کا امکان ثابت کرتی ہیں بلکہ خود ان آیات سے بھی جو رد میں پیش کیجاتی ہیں امکان بلکہ حدوث رویت ثابت ہوتا ہے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رویت الٰہی کے کئی درجے ہیں حتیٰ کہ ایک ایسی ادنیٰ درجہ کی رویت بھی ہے کہ جو بظاہر مومن لیکن بباطن منافق ہوتا ہے اسے بھی ہو جاتی ہے اور اعلیٰ درجوں کے لحاظ سے اسکے اسقدر درجے ہیں جو کبھی ختم ہی نہیں ہوتے۔

مختلف رویت الٰہی

ذات کی رویت تو ایک ہی ہوتی ہے اور ایک ہی ہونی چاہئے

لیکن صفات کی رویت مختلف ہوتی ہے۔ دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو حضرت خلیفہ اول رض نے بھی پہچانا اور حضرت مولوی عبدالکریم صاحب نے بھی۔ مگر حضرت خلیفہ اول کی رویت اور تھی۔ اور مولوی عبدالکریم صاحب کی اور۔ پس خدا تعالیٰ کی رویت چونکہ صفاتی ہے۔ اسلئے لازماً اسکے بہت سے مدارج ہونے چاہئیں۔ کیونکہ جب بھی صفات باری جلوہ گر ہونگی اس شخص کے درجہ کے مطابق جلوہ گر ہوں گی جو دیکھنے والا ہوگا۔ جیسا جیسا کوئی شخص ہوگا ویسی ویسی اسکو رویت حاصل ہوگی۔ کیونکہ ہر چیز اپنی جنس کو دیکھ سکتی ہے۔ غیر کو نہیں دیکھ سکتی۔ ہم چونکہ مادی ہیں۔ اسلئے مادہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ جوہر کو نہیں دیکھ سکتے۔ پھر بعض ایسی چیزیں ہیں۔ جو ہم سے زیادہ اعلیٰ مادہ سے بنی ہیں۔ یا جنکے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مادی ہیں یا اور کوئی چیز ہیں۔ بہرحال وہ ایسی چیزیں ہیں جو ہماری جنس کی نہیں ہیں۔ ان کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ تو جب تک ایک چیز کو دوسری سے جنسی مناسبت ہو نہیں دیکھ سکتی۔ رویت الٰہی کیلئے بھی مناسبت ہونی ضروری ہے۔ اور اس مناسبت میں اختلاف بھی ضروری ہے کسی کو زیادہ ہوگی۔ کسی کو کم۔ اسلئے ہر ایک کو اس مناسبت کے مطابق رویت ہوگی۔ جو اسمیں پائی جائے گی۔ اور خدا تعالیٰ اس مناسبت کے لحاظ سے تنزل کر کے اسے رویت کرائیگا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص ایک اونچی جگہ کھڑا ہو اور مختلف قدوں والے لوگوں نے جو اس سے نیچے کھڑے ہوں اس سے مصافحہ کرنا ہو تو اس وقت اس شخص کو بڑے قد والوں کے لئے کم جھکنا پڑیگا۔ اور چھوٹے قد والوں کیلئے زیادہ۔ اسی طرح رویت کے معاملہ میں جن لوگوں میں صفات الٰہیہ سے زیادہ مناسبت ہوگی ان کیلئے خدا تعالیٰ کو کم نیچے آنا پڑیگا۔ اور جن میں کم ہوگی ان کے لئے زیادہ۔ اور جتنا خدا زیادہ نیچے آئیگا اتنی ہی رویت ادنےٰ ہوگی۔ اور جتنا انسان اعلیٰ ہوگا اتنی ہی رویت اعلیٰ ہوگی +

رویت الٰہی کے مدارج کا علو

یہ رویت الٰہی کے مدارج ایسے اعلیٰ ہیں کہ انسان اس دنیا میں انہیں طے کر سکتا نہیں بلکہ دائمی زندگی میں بھی طے نہیں کر سکتا۔ آریہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب انسان کے اعمال دائمی نہیں تو دائمی نجات کیونکر ہو سکتی ہے؟ ہم کہتے ہیں۔ دائمی نجات خدا تعالیٰ کی ایک صفت دینا چاہتی ہے۔ اور وہ صفت احدیت ہے۔ اور صفت احدیت ظاہر نہیں ہوتی

اگر بندہ کچھ عرصہ کے بعد مرجاتا۔ تو کہہ سکتا تھا۔ کہ اگر میں اور زندہ رہتا تو خدا تعالیٰ کی حقیقت اور علم کو معلوم کر سکتا تھا۔ مگر خدا تعالیٰ نے دائمی نجات دیکر کہا۔ اب بھی تو میری حقیقت معلوم نہیں کر سکتا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں ملاءِ الاعلیٰ یتلونہ کما تتلونہ۔ یہ مت سمجھو کہ تم خدا کو دریافت کر سکو گے۔ ملأ اعلیٰ والے بھی اسی طرح اس کی دریافت میں لگے ہوئے ہیں۔ جس طرح تم اس کی دریافت میں لگے ہوئے ہو۔ مگر کوئی انتہائی درجہ کا قرب نہیں پا سکتا جس طرح دوسرے لوگ اس جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی لگے ہوئے ہیں۔ کہ خدا کی ساری صفات کو دیکھیں۔ مگر جوں جوں کوشش کرتے ہیں اور زیادہ صفات نکلتی آتی ہیں۔ اور وہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتیں۔ اور نہ کسی ایک صفت کی سیر ہی ختم ہوتی ہے +

غیر محدود انسانی ترقی

مگر یہ سنکر کہ رویت کے مدارج لا انتہا ہیں۔ گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ ہم خدا کی ذات کو نہیں دیکھ سکتے۔ اور اسکے دیکھنے کے پیچھے نہیں پڑے ہوئے۔ بلکہ ہمنے اس کی صفات کو دیکھنا ہے۔ اور ان کے غیر محدود ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ہماری ترقی بھی غیر محدود ہے۔ اور ہم بہت بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی شخص کو کوئی سونے کی کان ملجائے اور اسے کھودنے پر اسے معلوم ہو کہ اس کا سونا کبھی ختم ہی نہیں ہوگا۔ تو یہ شخص افسردہ نہیں ہوگا بلکہ خوش ہوگا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے قرب کی راہوں کا کبھی طے نہ ہونا اور اس کی رویت کے مدارج کا کبھی ختم نہ ہونا ہمارے لئے حوصلہ شکن نہیں ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ ہماری ترقی غیر محدود ہے۔ اور ہمارے لئے آگے ہی آگے بڑھنے کا سامان موجود ہے +

اب میں ان رویتوں کے بعض وہ موٹے موٹے مدارج بیان کرتا ہوں۔ جو حدیثوں سے معلوم ہوتے ہیں +

رویت الٰہی کا پہلا درجہ

ایک تو وہ درجہ ہے جس میں منافق بھی شامل ہیں۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ قیامت کو جب حشر میں لوگ کھڑے کئے جائینگے تو آواز آئیگی کہ صلیب کے متبع اسکے پیچھے اور بتوں کے پجاری بتوں کے پیچھے اور دوسرے مشرک جن جن کو خدا کا

شریک مقرر کرتے تھے۔ ان کے پیچھے چل پڑیں اور یہ چیزیں ان کے لئے متمثل کر کے لائی جائینگی
ان کے پجاری ان کے پیچھے چلے جائینگے۔ ان کے جانے کے بعد مسلمان باقی رہجائینگے۔ یعنے
ساری امتوں کے مسلمان۔ ان کے ساتھ منافق بھی ہونگے۔ تب خدا آئیگا۔ اور ایسی شکل
میں آئیگا۔ کہ جسے بندے پہچانتے ہونگے۔ اور کہیگا کہ میں خدا ہوں میرے پیچھے آؤ۔ وہ کہیں گے
نعوذ باللہ منك نعوذ باللہ منك اللہ ربنا۔ ہم تیرے پیچھے نہیں چلتے۔ اور ہم خدا کی
پناہ مانگتے ہیں۔ پھر خدا تعالےٰ غائب ہوجائیگا۔ اور کسی دوسری شکل میں جلوہ گری کرے گا۔
اور کہیگا میرے پیچھے آؤ۔ اسوقت وہ کہیں گے ھذا مکاننا حتیٰ نریٰ ربنا۔ کہ ہم تیرے
متبع نہیں اور ہم یہاں سے نہیں ہٹینگے۔ جب تک خدا تعالےٰ کو نہ دیکھ لیں +

یہ ظاہر ہونیوالا وجود بھی درحقیقت خدا تعالےٰ کی متمثل صفات ہی ہونگی اسلئے اس کا
دیکھنا بھی خدا کا دیکھنا ہی ہے اور منافق اس روئیت میں مومنوں کے شریک ہونگے لیکن
کافر اس سے بھی محروم رہینگے۔ جس طرح منافقوں نے ظاہر میں اسلام کو دیکھا ہوتا ہے حقیقی
طور نہیں دیکھا ہوتا۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ اپنی اصلی صفات میں جلوہ گر نہیں ہوگا۔ بلکہ
اس کی صفات تنزل کا ایک نہائت ہی کثیف پردہ اوڑھے ہوئے ہونگی جیسے کہ خواب
میں بعض لوگ خدا تعالیٰ کو باپ کی شکل میں دیکھ لیتے ہیں اور جس کے متعلق کہ بندہ کو
خیال بھی نہ آسکیگا۔ کہ یہ خدا کا جلوہ ہے۔ اسوقت تو منافق دو قسم کی تجلی دیکھ لیں گے
مگر جب پھر اسکے بعد خدا آئیگا۔ اور اعلےٰ تجلی کر کے کہیگا۔ کہ سجدہ کرو اور سب اسکے آگے جھکینگے
تب منافقوں کی آنکھیں چندھیا جائینگی اور وہ سجدہ کرنیکی کوشش کرینگے۔ مگر جھک نہ سکینگے
تب ان کو کہا جائیگا۔ کہ تم میرے لئے عبادت نہ کرتے تھے اسلئے آج حقیقی تجلی پر عبادت
کی توفیق چھینی گئی۔ اسوقت ان کو جہنم میں گرا دیا جائیگا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے
یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون خاشعة ابصارھم
ترھقھم ذلة وقد کانوا یدعون الی السجود وھم سالمون۔

اس سے معلوم ہوا کہ روئیت الٰہی کے دو مدارج تو ایسے ہیں کہ ان میں منافق بھی
خدا کو دیکھ سکینگے۔ لیکن تیسری تجلی کی جو حقیقی تجلی تھی وہ برداشت نہ کر سکینگے۔

خدا تعالےٰ کی رویت کے مختلف مدارج کا ثبوت حدیث سے

پھر دوسری حالت کے متعلق آتا ہے کہ جب مومن جنت میں داخل ہو جائینگے تو آواز آئیگی کہ خدا نے تم سے جتنے وعدے کئے تھے وہ سب پورے کر دیئے۔ صرف ایک وعدہ باقی ہے جنتی کہینگے خدا نے تو ہم سے سارے وعدے پورے کر دیئے۔ اور کیا باقی ہے؟ وہ کہیگا۔ کہ میں نے اپنے آپ کو ابھی تمہیں دکھانا ہے۔ یہ وعدہ باقی ہے۔ حالانکہ تین دفعہ وہ پہلے دیکھ آئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رویت کے اس قدر مدارج ہیں کہ بعض رویتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے ادنیٰ درجہ کی رویتیں رویت کہلانے کی بھی مستحق نہیں ہوتیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تین رویتوں کے بعد اللہ تعالےٰ یہ نہ فرماتا کہ ابھی میرا رویت والا وعدہ پورا نہیں ہوا۔

رویت الٰہی کے حصول کا طریق

اس دنیا میں رویت الٰہی کے حصول کا طریق یہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی جتنی زیادہ صفات انسان جمع کرے۔ اتنا ہی زیادہ جلوہ دیکھتا ہے۔ اور چونکہ [illegible]ن کا درجہ بڑھتا جاتا ہے اسلئے اس کی رویت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اور جو رویت اگلے جہان میں ہونے والی ہے وہ بھی ترقی کرتی چلی جائےگی۔ بعض کو تو اس دنیا کے ہفتہ کے عرصہ میں خدا تعالےٰ دوسرا جلوہ دکھائیگا۔ یعنے بعض ایسے لوگ جنت میں ہوں گے کہ جن کی روحانیت صرف اس درجہ تک ترقی یافتہ ہوگی کہ وہ روحانی ترقی کا اگلا جہان ایک ہفتہ میں طے کر سکینگے اسلئے ان کو ہر دوسری رویت ایک ہفتہ کے بعد ہوگی اور جو ان سے بڑھکر ترقی یافتہ ہونگے انہیں صبح بھی دیدار ہوگا اور شام کو بھی اور اسکے یہ معنے ہونگے کہ اگر صبح انہیں ایک روحانی درجہ حاصل تھا تو شام کو اور درجہ حاصل ہوگا اور اگلی صبح اور درجہ حاصل ہوگا ممکن ہے کہ اس سے بڑے مدارج کے لوگ بھی ہوں جنکو اس سے بھی کم عرصہ روحانی ترقی کے حصول میں لگے لیکن حدیث سے اسی قدر معلوم ہوتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مدارج کے لحاظ سے مختلف رویتیں حاصل ہوتی ہیں اور جتنی روحانی طاقت زیادہ انسان یہاں پیدا کریگا اتنی ہی جلدی وہاں رویت

میں ترقی ہوگی اور کم از کم ایک ہفتہ کے اندر اس کی گویا نئی پیدائش ہوگی۔ اسکی روح اتنی ترقی کرے گی کہ نئی بنجائے گی۔ اور اعلیٰ درجہ کے مومن تو ۱۲۔ ۱۲ گھنٹے میں ترقی کرینگے۔

دیکھو خدا تعالےٰ کے انبیاء کیسے لطیف اشارات سے استدلال کرتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کو صبح بھی تجلی ہوگی۔ اور شام کو بھی۔ اسپر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ رسول کریم صلعم کا علم کس قدر وسیع تھا۔ اور آپ کی نظر کہاں سے کہاں پہنچتی تھی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر تم خدا کی رویت چاہتے ہو تو صبح اور عصر کی نماز کی خوب پابندی کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے استدلال کیا ہے کہ ان نمازوں کی وجہ سے ہی تجلی ہوگی۔ کیونکہ خدا فعل پر نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ صبح کی نماز کے فعل پر صبح کی روئیت اور عصر کی نماز کے فعل پر پچھلے پہر کی رویت ہوگی +

اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صبح اور عصر کی نمازوں کی خوب پابندی کرو۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ چونکہ رسول کریم نے ان نمازوں کا خاص حکم دیا ہے۔ اسلئے باقی چھوڑی بھی جاسکتی ہیں۔ ان نمازوں کے متعلق تاکید کرنے سے صرف یہ مراد ہے کہ چونکہ ان دونوں اوقات میں انسان کے پچھلے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اسلئے ان اوقات کی نماز کو باجماعت ادا کرنیکے لئے خاص تعہد کرنا چاہئے ورنہ یہ مراد نہیں کہ دوسری نمازوں کی اہمیت کم ہے +

روئیت الہیٰ کا پہلا فائدہ کہ وہ خوبصورتی پیدا کرتی ہے

ہر رویت انسان کے اندر تغیر پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وجوہ یومئذ ناضرۃ الیٰ ربھا ناظرۃ (قیامتہ رکوع ۱) کہ اس دن خدا کے حضور میں حاضر ہونے والوں کے منہ بڑے خوبصورت ہونگے۔ کیوں؟ اسلئے کہ اپنے رب کو دیکھ رہے ہونگے۔ جب خدا کی تجلی سامنے ہوتی ہے تو اسکی بابرکت شعاعوں سے مومن بھی خوبصورت ہوجاتا ہے۔ اور جب تجلی ہوتی ہے تو اس کا روح پر اثر پڑتا ہے۔ اور روح یکدم ترقی کرکے اوپر کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ ہماری آج جو روح ہے۔ آخرت میں یہ جسم ہوگی اور عالم برزخ میں نئی روح تیار ہوگی۔ پھر وہ روح بھی ترقی مدارج کے ساتھ نئی روحانی پیدائشیں حاصل کرتی چلی جائے گی +

غرض خدا تعالیٰ نے یہ طریق رکھا ہے کہ رویت کے نتیجہ میں خوبصورتی حاصل ہوتی ہے حدیث میں آتا ہے کہ جب خدا کی لوگوں پر تجلی ہوگی اور وہ واپس گھر جائینگے تو گھر والے کہینگے کہ تمہاری شکلیں کیسے بدل گئیں؟ وہ کہینگے۔ ہم حقدار تھے۔ کہ ہماری شکلیں بدل کر خوبصورت ہو جاتیں۔ کیونکہ ہمنے خدا کو دیکھا ہے +

تو جنکو رویت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی روحیں بدلتی جاتی ہیں۔ اسی دنیا میں دیکھ لو۔ جنکو خدا کی رویت ہوتی ہے۔ ان کی روحیں کیسی اعلیٰ اور اور ہی طرح کی ہو جاتی ہیں۔ اور نہ صرف ان کی روحیں اعلیٰ ہو جاتی ہیں۔ بلکہ ان کے جسم پر بھی نور برستا اور انکی نیکی ظاہر ہوتی ہے +

خدا کا شکل اختیار کرنا شاید بعض کے دل میں خیال پیدا ہو کہ رویت الٰہی کی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ خدا کی صفات متمثل ہو کر نظر آتی ہیں۔ پس اصل چیز تو نہ دیکھی گئی پھر دیدار کے کیا معنے ہوئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کی رویت بھی وہمی رویت نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقی رویت ہوتی ہے۔ اسلئے کہ غیر محدود ذات کی رویت اسی طرح ہو سکتی ہے۔ اصل غرض تو نتائج سے ہے اور رویت کے جو نتائج ہوا کرتے ہیں وہ اسی قسم کی رویت سے پورے ہو جاتے ہیں اس کی مثال سورج کی سی ہے جسے آجتک کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ شاید بعض لوگ حیران ہونگے کہ یہ کیا بات ہو۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ اصل سورج کو کسی نے نہیں دیکھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح اور چیز دنیکی رفتار پر وقت لگتا ہے اسی طرح روشنی کی رفتار پر بھی وقت لگتا ہے جس کا اندازہ فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا ہے۔ چونکہ سورج دنیا سے نو کروڑ میل فاصلہ پر ہے اسلئے سورج کی روشنی دنیا میں آٹھ منٹ کے قریب میں پہنچتی ہے۔ اور چونکہ زمین چکر کھا رہی ہے اسلئے جس وقت سورج کی روشنی ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہے اس وقت تک سورج اس جگہ سے آٹھ منٹ کا سفر آگے کی طرف طے کر چکا ہوتا ہے اور ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ سورج نہیں بلکہ اسکی آٹھ منٹ پہلے کی شعاعیں ہوتی ہیں اور جس جگہ سورج کو دیکھتے ہیں درحقیقت وہ وہاں بھی نہیں بلکہ اس سے قریباً سوا سو میل آگے

ہوتا ہے کیونکہ اس عرصہ میں زمین سوا سو میل کے قریب چکر کھا چکی ہوتی ہے۔

اسی طرح جب ہم دیکھتے ہیں کہ سورج ڈوب رہا ہے تو اس سے سات منٹ پہلے سورج ڈوب چکا ہوتا ہے۔ ہم اس عرصہ میں اسکی آٹھ منٹ پہلے کی شعاعیں دیکھتے رہتے ہیں جسے وہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اور ہم انہیں سورج سمجھتے ہیں۔ پس کبھی حقیقی سورج کسی نے نہیں دیکھا۔ اسکی شعاعیں آتی ہیں جو ایک ٹکی بناتی ہیں اور اتنے عرصہ میں سورج آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ چونکہ حقیقی سورج کبھی کسی نے نہیں دیکھا اسلئے اس رویت کا کوئی فائدہ نہیں۔ باوجود اسکے کہ سورج ڈوب چکا ہوتا ہے مگر اسکی پیچھے چھوڑی ہوئی شعائیں ہمیں روشنی دیتی ہیں اور ہم ان سے وہی فائدہ اٹھاتے ہیں جو سورج سے۔ اسی طرح گو خدا تعالیٰ نظر نہیں آتا کیونکہ اس کی ذات غیر محدود ہے مگر ہم اس کی صفات کے تمثلات کو دیکھکر ویسا ہی فائدہ اُٹھاتے ہیں جو کسی ذات کے دیکھنے سے ہوا کرتا ہے سوائے شکل کی حد بندی کے اور خدا تعالیٰ شکل سے پاک ہے اس لئے اس کا کوئی نقصان نہیں۔ جب ہم ایسی محدود ذاتوں کا نظارہ بھی جو کہ بڑی ہوتی ہیں تمثیلی طور پر ہی کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی غیر محدود ذات کا نظارہ حقیقی طور سے کس طرح کر سکتے ہیں؟ چنانچہ سورج کو دیکھو وہ پچیس لاکھ میل لمبا چوڑا ہے۔ لیکن ہمیں وہ بہت چھوٹا نظر آتا ہے کیونکہ ہماری آنکھ اس قدر بڑے جسم کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ ہمیں وہ صرف ایک ٹکیا کے برابر نظر آتا ہے کیونکہ اسکے بعد کی وجہ سے اتنا ہی عکس ہماری آنکھ پر پڑتا ہے اور اس بات کو پرانے زمانے کے دیہاتی لوگ بھی جانتے تھے کہ سورج اس سے بڑا ہے جسقدر کہ ہمیں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک مثل تھی کہ۔ تارا کھاری چند گھماں۔ سورج دا کچھ اوڑک ناں۔ یعنے ستارے ایک بڑے ٹوکرے کے برابر ہوتے ہیں اور چاند دو بیگھے زمین کے برابر اور سورج اتنا بڑا ہے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ گو یہ اندازہ غلط ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرانے زمانہ کا زمیندار طبقہ بھی اس امر کو سمجھتا تھا کہ دور کی چیزیں اور بڑی چیزیں اپنے فوکس اور ہماری آنکھ کے اندازہ کے مطابق ہی نظر آتی ہیں۔ مگر باوجود اسکے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سورج کا دیکھنا غیر حقیقی ہے اور اس کا کوئی

فائدہ نہیں یہی حال رویئت الٰہی کا ہے ۔

رویئت الٰہی کا دوسرا فائدہ دوسرا فائدہ رویئت الٰہی کا یہ ہوتا ہے۔ کہ جو صفت سامنے آتی ہے اس سے قلب میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ تعجب ہے خدا کے متعلق تو لوگ کہتے ہیں کہ اسکی رویئت کا کیا فائدہ۔ لیکن اگر ان کا کوئی عزیز جدا ہونے لگے۔ تو اس کی تصویر اتروا لیتے ہیں یا اگر کوئی مرا ہوا بچہ یا رشتہ دار خواب میں نظر آئے تو بہت ہی خوش ہوتے اور اس نظارے سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ اگر ان باتوں سے فائدہ ہوتا ہے۔ تو خدا کی حقیقی جلوہ گری کیوں نہ فائدہ دے گی ؟ ۔

تیسرا فائدہ رویئت الٰہی میں تیسرا فائدہ یہ ہے کہ خدا کی تجلی خارق عادت چیز ہوتی ہے۔ ہوتی تو ایسی ہے کہ بندہ دیکھ سکے مگر اسکے ساتھ ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ قلوب کو منور اور روشن کر دیتی ہے اور گویا مخفی اثرات کے ذریعہ سے قلوب کو صاف کر دیتی ہے پس رویئت حقیقی کے بعد انسان اپنے خلاق اور اپنی روحانیت کے اندر ایک نہایت ہی عظیم الشان تغیر پاتا ہے اور اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کیطرف جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے جیسا کہ انبیاء و اولیاء کا حال ہے یہ نتائج صرف رویئت سے ہی پیدا ہو سکتے ہیں ۔

ہم خدا سے کس حد تک تعلق پیدا کر سکتے ہیں؟ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ سے ہم کس حد تک تعلق پیدا کر سکتے ہیں ؟ یہ سوال گو ہستی باری تعالیٰ کی تحقیق کی ابتداء میں بھی پیدا ہوتا ہے مگر اسوقت اسکا باعث علمی تحقیق کا خیال ہوتا ہے مگر مذکورہ بالا تحقیق کے بعد دوبارہ یہی سوال انسان کے دل میں اسلئے پیدا ہوتا ہے کہ اب وہ عمل کے ساتھ خدا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس مقام پر پہنچکر گویا انسان کی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ جیسے کسی کے سامنے زمین و آسمان کے خزانے کھول کر رکھ دیئے جائیں۔ اور وہ پوچھے کہ ان سے کیا فائدہ حاصل کروں اور کہاں اور کس طرح خرچ کروں۔ پس اب ہم یہ بات حل کرتے ہیں۔ کہ خدا کی صفات کے غیر محدود خزانوں سے ہم کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کس طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں ؟ اور ان کے ذریعہ سے اپنی روحانی حالت کو کس حد تک درست کر سکتے ہیں ؟

خدا تعالیٰ کی صفات کے گہرے علم سے ہمیں کیا فائدہ ہوتا ہے؟ پہلا فائدہ تو یہ ہوگا

جس بندہ کو خدا کی صفات کا علم ہو۔ خواہ وہ ایک حرف بھی نہ پڑھا ہوا ہو۔ دنیا کا بڑے سے بڑا سائنس دان بھی اسکے مقابلہ میں کچھ نہیں ہوتا۔ پس پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ ایسے شخص کے ہاتھ میں علم کا خزانہ آجاتا ہے۔ جبتک کسی چیز کا پتہ نہ ہو۔ تو اس کو استعمال کرنے کا خیال نہیں آتا۔ مثلاً اگر یہ معلوم نہ ہو کہ بخار کا کوئی علاج ہے تو انسان علاج کرنے کی کوشش ہی نہیں کریگا۔ لیکن جب معلوم ہو جائے کہ علاج موجود ہے تو علاج کرنے کی طرف بھی توجہ پیدا ہوگی۔ تو خدا کی صفات کے خزانوں کے معلوم ہونے سے انسان کے خیالات ہی بدلجاتے ہیں۔ جس طرح ایک ایسا شخص جس کو معلوم ہو کہ اس کی بیماری کا علاج ہے وہ دوائی لیکر استعمال کریگا۔ جس سے صحتیاب ہو جائیگا۔ لیکن جس کو علاج ہی معلوم نہیں وہ گھر بیٹھا رہیگا۔ اور اسی بیماری سے جس کا علاج کرا کر صحتیاب ہو سکتا تھا مر جائیگا۔ جیسے پہاڑی اقوام میں ہوتا ہے۔ ان کے بیمار یونہی معمولی بیماری سے مرجاتے ہیں۔ کیونکہ کوئی علاج نہیں کرتے۔ اسی طرح خدا تعالےٰ کی صفات کا علم رکھنے والے کے لئے ہر وقت اپنی اصلاح اور روحانی ترقی کا دروازہ کھلا رہیگا لیکن جو ان صفات کا علم نہیں رکھتا وہ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا رہیگا اور روحانی ترقی کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوگی۔

دوسرا نفع یہ ہے کہ جب انسان خدا کا غیر محدود جلوہ دیکھتے ہیں۔ تو معلوم کر لیتے ہیں کہ علوم کا کوئی احاطہ نہیں۔ بلکہ علوم غیر محدود ہیں۔ اور کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ سائنس یا حساب یا ڈاکٹری یا انجینئرنگ میں جتنی ترقی ہونی تھی ہو چکی ہے۔ بلکہ وہ سمجھیگا کہ چونکہ یہ علوم غیر محدود ہستی کی طرف سے آئے ہیں اسلئے ان کی ترقی بھی کبھی ختم نہ ہوگی۔ یہ سمجھکر وہ کسی علم میں ترقی کرنے سے پیچھے نہ ہٹیگا۔ مسلمانوں نے غلطی کی ہے کہ یونانیوں کے پیچھے چل کر کہدیا۔ کہ فلاں علم بھی ختم ہو گیا۔ اور فلاں بھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا قدم ترقی کی طرف سے ہٹ گیا اور آخر جہالت پیدا ہونے لگ گئی جو ایک جگہ ٹھہر جانیکا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر وہ خدا تعالےٰ کی صفات پر غور کرتے تو آج ہر علم کے سب سے بڑے عالم دنیا میں مسلمان ہی ہوتے۔ پس خدا تعالےٰ کی صفات کے سمجھنے سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ ایسا انسان کسی علم کو محدود نہیں قرار دے سکتا۔

کوئی مسلمان علوم کو محدود نہیں مان سکتا

اب میں اس امر کی مثالوں سے تشریح کرتا ہوں۔ مثلاً بعض بیماریاں ایسی ہیں کہ ان کے علاج معلوم تھے اور بعض کے نہیں اور آج سے پہلے بعض بیماریوں کے متعلق کہا جاتا تھا کہ لا علاج ہیں۔ حالانکہ لا علاج کا لفظ ایک بیہودہ لفظ ہے۔ کیونکہ اگر خدا قادر مطلق ہے۔ تو کوئی بیماری لا علاج کس طرح ہو سکتی ہے؟ ہاں اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ فلاں بیماری کا علاج ہمیں معلوم نہیں تو اور بات ہے۔ ورنہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں بیماری کا کوئی علاج ہی نہیں۔ تو وہ مشرک ہے، وہ خدا کو قادر مطلق نہیں مانتا۔ آجتک بعض بیماریوں کے متعلق لوگ لکھتے چلے آئے ہیں کہ لا علاج ہیں لا علاج ہیں مگر محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جنہیں یہ لوگ اُمی کہتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا ما من داء الا له دواء الا الموت۔ کہ کوئی بیماری نہیں جس کا علاج نہ ہو۔ یہ آپ نے کیوں کہا؟ اسلئے کہ آپ کو معلوم تھا۔ کہ خدا شافی ہے۔ اسلئے سب بیماریوں کا علاج ہونا چاہیئے۔ اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۱۳ سو سال پہلے وہ نکتہ دریافت کر لیا۔ جو یورپ نے آج بھی نہیں کیا۔ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت جبکہ طب کا علم نہایت محدود تھا۔ فرماتے ہیں۔ یہ نہ کہنا کہ فلاں بیماری کا کوئی علاج نہیں۔ یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ تم دریافت کرنے میں لگے رہو۔ اس کا علاج ضرور نکل آئیگا۔ اگر خدا شافی ہے تو اس نے اس مرض کا علاج بھی ضرور قانون قدرت میں رکھا ہوگا۔ تم کوشش کرو۔ اور اسے تلاش کر لو۔ دیکھو شافی صفت کا علم رکھنے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نگہ اپنے ہم عصروں سے بلکہ اپنے بعد آنیوالے لوگوں کے نقطۂ نگہ سے بھی کس قدر بدل گیا دوسرے لوگ تو یہ خیال کرتے تھے اور آپکے بعد بھی اب تک یہی خیال کرتے رہے کہ جو باتیں ہمیں معلوم ہو چکی ہیں ان سے بڑی اور کیا ہو سکتی ہیں۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کے علم کی بنیاد صفات الٰہیہ کے علم پر تھی باوجود امی ہونیکے فرماتے ہیں کہ یہ کہدینا کہ اس مرض کا علاج نہیں بالکل غلط ہے۔ علاج ہر ایک شے کا موجود ہے دریافت کرنا تمہارا کام ہے آپکے اس ارشاد کے مقابلہ پر علم کا دعوٰی رکھنے والوں کی مایوسی کہو یا تعلی کہو کس قدر حقیر کس قدر ذلیل اور کس قدر زشت و بد صورت معلوم ہوتی ہے۔ کجا علم کے دعوٰی کے باوجود یہ کہنا کہ گو دنیا کے آرام

کے سب سامان میسر نہیں آتے مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سامان پیدا ہی نہیں کئے گئے اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ کہ یہ کہنا کہ علم طب ختم ہوگیا ہے۔ جہالت ہے۔ ابھی تو ہر بیماری کا علاج نہیں نکلا حالانکہ ہر بیماری کا علاج اللہ تعالےٰ نے پیدا کیا ہے۔ آپکے مقابلہ پر دوسرے مدعیان علم کی حالت بالکل اس مینڈک کی حالت کی طرح معلوم ہوتی ہے جو کوئیں کو ہی بہت بڑا سمجھتا ہے۔ اور آپکی حالت یوں معلوم ہوتی ہے کہ گویا سمندر بھی آنکھوں میں نہیں جچتا +

لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک امریکن انگلستان میں آیا۔ اور وہ ایک گاڑی پر بیٹھا، گاڑی والے نے اس سے پوچھا کیا امریکہ میں دریا ہوتے ہیں؟ وہ کہنے لگا ہاں ہوتے ہیں۔ گاڑیبان نے کہا بڑے بڑے بھی ہوتے ہیں؟ اسنے کہا بڑے بڑے بھی ہوتے ہیں۔ (امریکن نے تو امریکہ کا وہ دریا دیکھا ہوا تھا۔ جو ساری دنیا کے دریاؤں سے بڑا ہے۔ اور گاڑیبان نے صرف اپنے ملک کا دریا ٹیمز دیکھا ہوا تھا۔ جو بڑی نہروں کے برابر ہے) گاڑیبان نے ٹیمز کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ کیا اتنا بڑا دریا بھی امریکہ میں کوئی ہے؟ امریکن نے جواباً دریافت کیا کہ تم دریا کے متعلق پوچھتے ہو یہ تو ایک نہر ہے۔ اسے دریا کون کہہ سکتا ہے۔ اس پر گاڑیبان کو اس قدر اشتعال آیا کہ مسافر کو کہنے لگا کہ تو بالکل جھوٹا انسان ہے۔ اب میں تجھ سے بات ہی نہیں کرونگا +

اہل یورپ ایک محدود دائرہ میں یہی حالت ان لوگوں کی ہے جن کے دل میں صفات الٰہیہ نے گھر نہیں کیا۔ ان کا دائرہ علم بہت محدود ہوتا ہے۔ یورپ والے علم علم کہتے ہیں۔ لیکن وہ بھی کیسے محدود دائرہ میں گھرے ہوئے ہیں۔ ذرا کوئی نئی بات نکال لیتے ہیں تو شور مچا دیتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ خدا نہیں گویا کہ اگر دنیا ایک جاہلانہ اصول پر چلتی ہے تو تو خدا ہے اور اگر اسکے کام میں کوئی نظام اور قاعدہ نظر آتا ہے تب کوئی خدا نہیں وہ نادان نہیں جانتے کہ خدا تعالےٰ کا تو ہر فعل حکمت پر مبنی ہے اور اس کے بنائے ہوئے تمام قوانین مضبوط اور باریک نظام پر مشتمل ہیں۔ ابھی انہوں نے دریافت ہی کیا کیا ہے۔ مثلاً ان لوگوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ انسان بہ حیثیت ذات ایک منفرد وجود

نہیں بلکہ انسانی جسم باریک ذرات سے بنا ہوا ہے جو خود اپنی اپنی جگہ زندگی رکھتے ہیں گویا یہ ذی حیات وجود کی بستی ہے اور پھر اس سے بڑھکر انہوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ وہ ذرات جن سے انسان بنا ہے خود باریک باریک ذرات سے ملکر بنے ہیں گویا وہ خود مرکب ہیں ان امور سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عالم وجود ایک قانون کے ماتحت بنا ہے اسلئے معلوم ہوا کہ اس کا بنانیوالا کوئی نہیں مگر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ یہ تو دو قدم مبدأ حیات کی طرف جاکر اس قدر بھول گئے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ انسان اور خدا کے درمیان ستر ہزار حجاب ہیں۔ یعنی کثیر التعداد واسطے در واسطے چلے جاتے ہیں تب کہیں جاکر امر محض تک پیدائش عالم کا سلسلہ پہنچتا ہے اس علم کے مقابلہ میں یورپ کی تحقیق کس قدر حقیر ٹھہرتی ہے بلکہ جہالت نظر آتی ہے*

موت کے ذریعہ ترقی اہل مغرب کا ہر تحقیق پر یہ شور مچا دینا کہ انہوں نے پیدائش عالم کی گویا کہ وجہ دریافت کرلی ہے اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ علم کو محدود سمجھتے ہیں ورنہ اگر وہ یہ سمجھیں کہ ابھی تو غیر محدود علوم چھپے چھپے پڑے ہیں تو اس قدر خوش کیوں ہوں اور اترائیں کیوں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ آپ کس طرح ایک صفت الہیہ پر قیاس کرکے علوم کے غیر محدود ہونیکا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ مگر آپنے ایک شرط ساتھ لگائی ہے اور وہ یہ کہ موت کا کوئی علاج نہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ موت ترقی کے رستہ میں روک نہیں بلکہ ترقی کا ایک ذریعہ ہے۔ اسکے ذریعہ سے انسان ترقی کرتا ہے کیونکہ موت کے بعد ہی انسان ان وسیع قوتوں کو پاتا ہے کہ اس دنیا کی عمر بھر کی ترقی اس دنیا کے گھنٹوں کی ترقی کے برابر نہیں ہو سکتی

خدا کی مخلوق کی وسعت قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً (کہف رکوع ۱۲) کہ اگر سمندر سیاہی بنجائیں۔ اور ان سے خدا تعالیٰ نے جو علوم بنائے ہیں انہیں لکھنا شروع کیا جائے تو سمندر ختم ہو جائینگے۔ مگر یہ نہیں ہوگا کہ خدا کے بنائے ہوئے علوم ختم ہو جائیں۔ خدا کے منکر تو ایک ایک ذرہ پر خوش ہوتے ہیں کہ ہمنے یہ بات معلوم کرلی۔ اور یہ معلوم کرلی۔ لیکن خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ اگر تم تحقیقاتیں کرکے

ان کو سمندر سے لکھتے جاؤ۔ تو پھر بھی خدا کے خزانے ختم نہ ہونگے۔ یہ انسانی نقطہ نگہ کے مطابق غیر محدود ترقی علوم صفت واسع کے ماتحت ہے +

پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ ہماری دنیا کی چیزیں تو ختم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کوئلہ ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ تک یہ ختم ہو جائیگا؟ ہمارے ملک میں کوئلہ کے ختم ہونے کے نتائج کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ مگر یورپ کے اکثر کام چونکہ اسکی مدد سے ہو رہے ہیں وہ اسے بہت بڑی مصیبت سمجھتا ہے۔ غرض کہا جاتا ہے کہ اگر کوئلہ یا تیل ختم ہو جائے۔ تو پھر دنیا کیا کرے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں خدا تعالٰے کے متعلق آتا ہے۔ کہ وہ کفایت کرنیوالا ہے (قرآن میں تو یہ صفت فعل کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ لیکن رسول کریم نے اسم کے طور پر اسے استعمال کیا ہے یعنی خدا کا نام کافی بتایا ہے) اب دیکھ لو اگر ایک چیز ختم ہونے لگتی ہے تو اس کی قائم مقام اور نکل آتی ہے۔ کوئلہ ختم ہونے لگا تو تیل نکل آیا۔ اب تیل کے ختم ہونے کا ڈر پیدا ہوا۔ تو ایسی تحقیقاتیں ہو رہی ہیں کہ سورج کی شعاعوں سے یہ کام لے لیا جائے۔ تو دنیا جب گھبرا اٹھتی ہے۔ کہ اب مرے۔ اسوقت مومن ہنستے ہیں کہ یہ لوگ کیسے نادان ہیں۔ خدا کوئی اور سامان ضرور کریگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے +

خدا کو قادر ماننے کا اثر درحقیقت صفات الٰہیہ کو ماننے والا انسان ایک وسیع پلیٹ فارم پر کھڑا ہوتا ہے۔ اور ساری دنیا اس کی نظروں میں حقیر ہوتی ہے۔ مثلاً جو شخص خدا تعالٰی کی صفت قدرت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی یقین رکھیگا کہ خدا نے ہر چیز کے اندازے اور قواعد مقرر کئے ہوئے ہیں۔ یہ سمجھکر وہ سارے بیہودہ ٹونے ٹوٹکوں سے بچ جائیگا۔ کیونکہ اسے معلوم ہوگا کہ یہ باتیں کچھ اثر نہیں رکھتیں اور بیہودہ ہیں۔ اس طرح وہ سارے شکوک اور شبہات سے پاک ہو جائیگا +

خدا کو رب العٰلمین ماننے کا اثر اسی طرح خدا کی رب العٰلمین صفت ہے۔ اسکے ماتحت ایک مومن اسی دنیا کو سب کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ یہ بھی یقین رکھتا ہے۔ کہ یہ دنیا خدا کے ان گنت عالموں میں سے ایک عالم ہے۔ اسکے سوا اور بھی عالم ہیں اور اس بنا پر مثلاً وہ یقین رکھیگا کہ علم ہیئت کی ترقی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ علوم کی ترقی مومن کے اس عقیدہ کی

تصدیق کر رہی ہے۔ لڑائی سے قبل خیال کیا جاتا تھا۔ کہ دنیا تین ہزار سال کی روشنی کے برابر لمبی ہے یعنی اس قدر لمبی ہے جتنا عرصہ روشنی کی شعاع تین ہزار سال میں طے کر سکتی ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ روشنی کے ۱۱ ہزار سال سے بھی زیادہ دنیا کا طول ہے اور ابھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ تحقیق بھی غلط ثابت ہو کر اس سے بہت زیادہ لمبائی دنیا کی معلوم ہوگی ✤

یہ امر بتانے کے بعد کہ صفات الٰہیہ کے علم سے انسان کو ذہنی طور پر کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اب میں بتاتا ہوں کہ صفات الٰہیہ سے انسان عملی طور پر کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے؟

انسان دنیا میں خدا سے کیا کچھ حاصل کر سکتا ہے؟

انسان چاہتا ہے کہ اسے عزت حاصل ہو۔ اور ادھر دیکھتا ہے کہ خدا کا ایک نام معزؔ ہے۔ اسلئے وہ سمجھتا ہے کہ ادھر ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی کو کیوں نہ کہوں کہ اے معز مجھے عزت دے ✤

پھر انسان کو رزق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور خدا رازق ہے۔ جو اس کی اس صفت سے واقف ہے وہ بجائے ادہر اودہر دھکے کھانے کے اسی کے حضور میں کہیگا کہ اے رازق مجھے رزق دے ✤

یا پھر کبھی ہم مصائب اور مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ خدا کی صفت کاشف السوء بھی ہے یعنی بدی کو مٹا دینے والا۔ اسلئے ہم اسی سے کہینگے کہ ای تکالیف کو دور کرنیوالے اور مصائب کو مٹانیوالے خدا ہمیں تکالیف سے بچالے۔ تو گویا ہماری مثال ایسی ہوگی۔ کہ ہم ایک ایسے درخت کے نیچے بیٹھے ہیں جسے خوب پھل لگے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے ہاتھ میں ایک لمبا بانس ہے۔ جب جی چاہتا ہے بانس کے ذریعہ پھل اتار لیتے ہیں ✤

مثلاً کسی کو کوئی بیماری اور دکھ ہو تو وہ شافی خدا کے سامنے اپنی درخواست کو پیش کریگا اور کہیگا کہ تو جو شفا دینے والا ہے مجھے شفا عطا فرما ✤

یا مثلاً بعض لوگوں کو اولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر دنیا میں کوئی شخص نہیں جو اولاد دے سکے۔ جب ایسا شخص ہمارے پاس آئیگا تو ہم اسے کہیں گے کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں خدا خالق ہے۔ اسے کہو اے خالق مجھے بھی اولاد دے۔ یہ صرف باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ

ایسا ہوتا رہتا ہے۔ یہیں ایک ہندو ہے اس کی شادی کو کئی سال ہو گئے تھے مگر اولاد نہ ہوتی تھی۔ اس نے دعا کی کہ اے خدا اگر مرزا صاحب سچے ہیں تو انکے طفیل مجھے اولاد دے۔ بیس سال تک اسکے اولاد نہ ہوئی تھی اسکے بعد اسکے اولاد ہو گئی +

اسی طرح قریب ہی کے گاؤں کا ایک اور ہندو ہے۔ جو ایک دفعہ جلسہ کے ایام میں بٹالہ سے قادیان آنیوالی سڑک پر بیٹھ گیا تھا اور سب جلسہ پر آنیوالوں کو رس بھی پلاتا تھا اور یہ بھی بتاتا تھا۔ کہ مرزا صاحب کے صدقے مجھے خدا نے یہ بچہ دیا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ چونکہ خالق ہے اسلئے جب دنیا کے ڈاکٹر کسی بات سے جواب دے دیتے ہیں تو اسکے متعلق ہم کہتے ہیں کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر خدا ہی کی منشاء نہیں تو اور بات ہے ورنہ اس سے حاصل کرنیکا رستہ کھلا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی دشمن ہے۔ جو دین کیلئے مضر ہو اور اس کی موت دین کیلئے مفید ہو سکتی ہو یا طاعون یا اور بیماریوں کے کیڑے ہیں جو ہمارے لئے مضر ہوتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں۔ کہ وہ مر جائیں تو ہم خدا تعالےٰ کی صفت ممیت سے کہینگے کہ انہیں مار ڈال۔ یا کبھی کوئی چیز کا مردہ ہو اور ہمیں اس کی حیات مطلوب ہو تو ہم اسکے لئے خدا تعالیٰ سے اس طرح دعا کرینگے کہ اے محیی اسے زندہ کر دے۔ اور ہمارا تجربہ ہے کہ خدا تعالےٰ ایسے موقعوں پر دعائیں سنتا ہے اور بظاہر مردہ وجودوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ جیسے عبد الرحیم خان صاحب کی مثال موجود ہے۔ کہ جب ڈاکٹروں نے جواب دیدیا۔ تو حضرت صاحب نے دعا کی۔ اور وہ تندرست ہو گئے +

پھر انسان سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ اور لوگ تو گھبرائینگے کہ کس طرح ان کا اثر دور کریں۔ لیکن ہم کہینگے خدا غفار ہے۔ اسے کہو وہ بخشدیگا +

غرض ہر چیز کا خزانہ خدا تعالےٰ کے پاس موجود ہے۔ کوئی ضرورت ایسی نہیں جسکا خزانہ خدا کی صفات میں نہ مل سکتا ہو۔ پس خدا کی صفات کے علم کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ضروریات کو پوری کر سکتا ہے۔ اور گویا صفات الٰہیہ ایسی نالیاں ہیں۔ جو ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جاری ہیں۔ اور ہمارا کام یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ جس نالی سے ملے۔ اس کے نیچے پیالہ لے جا کر رکھدیں یعنی جس بات کی ضرورت ہو۔ اسکے مطابق جو خدا تعالیٰ کی صفت ہے اس کو پکاریں۔ چنانچہ خدا تعالےٰ بھی فرماتا ہے وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا (۹۔۷)

کہ خدا تعالیٰ کے اندر سب صفات حسنہ پائی جاتی ہیں۔ اسلئے جو ضرورت تمہیں پیش آئے۔ ان کے ذریعہ اس سے مانگو۔ اس آیت سے دعا کرنے کا بھی یہ نکتہ معلوم ہو گیا۔ کہ جو چیز مانگنی ہو اس کے مطابق جو صفت ہو اسکے ذریعہ سے مانگنی چاہئے۔ پس صفات کا باریک علم دعا کی قبولیت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور جو اس علم کا پتہ لگا لیتا ہے۔ اسکی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ اور جو خدا تعالیٰ کی صفات کا سب سے زیادہ علم رکھیگا۔ اس کی دعائیں بھی سب سے زیادہ قبول ہوں گی +

دعا کیلئے مناسب صفت کو کس طرح منتخب کرے؟

اگر یہ سوال کیا جائے کہ دعا کیلئے صفاتِ الٰہیہ کا انتخاب کس اصل پر ہونا چاہئے؟ تو اس کا یہ جواب ہے کہ سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ مثلاً جو تکلیف ہے وہ کیوں ہے؟ اور پھر اس وجہ کو مدنظر رکھکر جس صفت کے ذریعہ سے دعا کرنا مناسب ہوگا اسکے ذریعہ سے دعا کی جائے گی۔ ظاہری علوم میں بھی اس کی مثال دیکھ لو۔ ایک شخص کے پیٹ میں درد ہوتی ہے تو اسے طبیب کسٹر آئل دیتا ہے۔ ایک دوسرے کو پیپر منٹ۔ تیسرے کو قے کراتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ گو ہے تو سب کے پیٹ میں ہی درد لیکن سبب مختلف ہیں۔ اسی طرح انسان کی تکالیف کئی اسباب سے ہوتی ہیں مثلاً قرض کو ہی لیلو۔ کبھی قرض اسوجہ سے چڑھ جاتا ہے کہ انسان سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو جاتا ہے جس کی مناسب سزا اسے مالی تنگی کا پہنچنا ہوتی ہے۔ کبھی اسکی یہ وجہ ہوتی ہے کہ خدا دیکھتا ہے کہ اگر اسکو زیادہ مال دونگا۔ تو گمراہ ہو جائیگا۔ کبھی اسکی وجہ اسکی سستی ہوتی ہے یا اس قدر آمد نہیں پیدا کرتا کہ سال کا خرچ چل سکے۔ یا مثلاً کسی پر ذرائع آمد کے محدود ہونے کے سبب سے قرض ہو جائیگا۔ یہ چاروں باتیں خدا تعالیٰ کے الگ الگ اسموں کے نیچے آئیں گی۔ اگر کمی آمد کی وجہ سے قرض ہو تو انسان کہیگا کہ اے باسط مجھے رزق میں فراخی دے۔ تب خدا اسے رزق دیگا۔ لیکن اگر اس کی سستی کے سبب سے اس کی آمدن کم ہے تو وہ یہ دعا کریگا کہ اے قیوم مجھے چستی عطا فرما۔ اور اگر گنہ کے سبب سے مقروض ہے تو کہیگا کہ اے غفور مجھے بخشدے۔ اور اگر اس سبب سے تنگی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ شخص فراخی رزق کے ساتھ ایمان کو سنبھال نہیں سکتا تو اس طرح دعا کی جائیگی۔ کہ اے ہادی مجھے مضبوطی ایمان بخش +

غرض صفات الٰہیہ کے ماتحت دعا کرنا ایک مستقل علم ہے اور میں نے صرف موٹی موٹی باتیں

بطور مثال بتائی ہیں۔ تا معلوم ہو کہ خدا تعالیٰ کی صفات ہمارے لئے نئے علوم بیان کرتی ہیں۔

حضرت مسیح موعود کے متعلق صفات الٰہی کے نظارے

حضرت مسیح موعود نے خدا کی صفات کا علم سیکھا۔ اور ان کے اثر کے نظارے دکھائے۔ لوگوں نے آپکا مقابلہ کیا اور آپ کو ہلاک کرنا چاہا۔ حضرت صاحب نے ان کے مقابلہ کیلئے خدا تعالیٰ کی صفت قیوم سے مدد طلب کی اور مخالف ناکام رہے۔ پھر تکالیف پہنچانے کی کوشش کی۔ اسکے لئے آپنے حفیظ صفت کو بلایا۔ اور آپ دشمنوں کی شرارتوں سے محفوظ رہے۔ علم کے متعلق مخالفوں نے آپکو کہا کہ جاہل ہے۔ عربی کا ایک صیغہ نہیں جانتا۔ مگر آپنے کہا مجھے پتہ ہے کہ علم کا خزانہ کہاں ہے۔ میں وہاں سے علم لے آؤنگا۔ چنانچہ آپنے خدا تعالیٰ کی صفت علیم کو پکارا اور آپ کو بےنظیر علم دیا گیا۔ آپ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ چالیس ہزار الفاظ کا مادہ ایک منٹ میں خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈال دیا۔

پس دیکھو خدا کی صفات کا علم حاصل کر کے آپ کیا سے کیا بنگئے۔ گویا کہ آپ اس دنیا کے آدمی ہی نہ رہے۔ آسمانی عالم کے وجود ہو گئے۔

صفات الٰہی کا علم رکھنے والے کے نزدیک بادشاہ کی حقیقت

جو کوئی اس علم کو حاصل کرتا ہے اس کی خاص حالت ہو جاتی ہے۔ دیکھو ایک بادشاہ کی نسبت لوگ کہتے ہیں۔ اس کا بڑا اقبال ہے۔ مگر میں کہتا ہوں۔ اس شخص کے مقابلہ میں اسکی کیا حقیقت ہے جسے صفاتِ الٰہیہ کا علم حاصل ہو گیا دنیوی بادشاہوں کے خزانے ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ جس بادشاہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسکے خزانے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ پھر ان بادشاہوں کو ایسی دقتیں پیش آجاتی ہیں۔ جنکا وہ کوئی علاج نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جرمن کے ایک قیصر کو خناق ہو گیا۔ بیسیوں ڈاکٹروں نے زور لگایا مگر کچھ نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جو لوگ اسکے در پر گرنیوالے ہیں وہ ایسی بیماریوں سے جو سخت تکلیف دہ ہوں یا ڈراونی ہوں محفوظ رہتے ہیں۔ یورپ کے اخبارات نے مذکورہ بالا قیصر کی وفات پر لکھا کہ بڑے بڑے ڈاکٹر تین دن تک ملک الموت سے جنگ کرتے رہے لیکن آخر کار ملک الموت کامیاب ہو گیا۔ یہ بادشاہ اس تکلیف سے مرا تھا کہ دیکھنے والے بیتاب ہو ہو جاتے تھے۔ مگر جس شخص سے اس کا تعلق ہو جس کے قبضہ میں ملک الموت ہے۔ وہ کب اس قسم کے

خطرات کی پرواہ کرسکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نبی کی جان ملک الموت اس سے پوچھکر نکالتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبان پر وفات کے وقت یہ الفاظ تھے اللھم بالرفیق الاعلےٰ۔ اے خدا اب میں تجھ سے ملنا چاہتا ہوں +

صفات الٰہی سے واقف کیحالت

جسکو صفات الٰہیہ سے کام لینے کا طریق معلوم ہوجاتا ہے اس کے سامنے ساری دنیا ہیچ ہوجاتی ہے۔ اور اگر خدا تعالیٰ کسی وجہ سے اسکے لئے ابھی ایک صفت جاری نہ کرے تو دوسری کُھلی ہوتی ہے۔ ادھر چلا جاتا ہے۔ مثلاً اگر اسپر موت آتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ استغناء کی وجہ سے اسکے لئے محی صفت جاری نہیں کرتا اور مار ڈالتا ہے۔ تو اس کی مالک یوم الدین کی صفت بھی تو ہے۔ اسلئے وہ دوسرے رنگ میں فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ کا بندہ کبھی کسی بات سے نہیں گھبراتا۔ اسکا رنج بھی خوشی کا پہلو رکھتا ہے۔ اور خوشی بھی خوشی کا۔ اگر مرتا ہے تو بھی وہ خوش ہوتا ہے۔ اور اگر زندہ رہتا ہے۔ تو بھی خوش ہوتا ہے۔ اگر اس کا کسی سے جھگڑا فساد ہوجاتا ہے۔ تو خدا کی صفت جبار کو بلاتا ہے۔ کہ اے جبار اسکی اصلاح کردے۔ اور خدا تعالیٰ اصلاح کردیتا ہے۔ اور پھر خواہ کس قدر دشمنی اور عداوت ہو خدا چونکہ ودود بھی ہے اسکے متعلق اسکے دشمنوں کے دل میں محبت پیدا کردیتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم (انفال ع) کہ اگر تم دنیا کا سارا مال بھی خرچ دیتے تو لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا نکرسکتے۔ لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ کیونکہ قلوب کا جوڑنا اسی کا کام ہے +

مومن کے وزرا

پس دیکھو مومن کی کتنی عظیم الشان حکومت ہوتی ہے۔ دنیاوی بادشاہ تو چھ سات وزیروں سے کام لیتے ہیں لیکن مومنوں کے کم از کم ۹۹ وزرا تو ہو گئے۔ کیونکہ ۹۹ صفات الٰہی جو عام طور پر مشہور ہیں یہ سب کی سب ان چیزوں کو جو ان کے ماتحت ہیں مومن کی خدمت میں لگادیتی ہیں اور اسکا بوجھ ساری دنیا پر بانٹ دیتی ہیں۔ مثلاً کبھی مومن کی خواہش ہو کہ دنیا کے کاموں سے فارغ ہو تو اسکے لئے خدا کی صفت وکیل ہے۔ اسے کہے کہ اے وکیل تو ہی میرے کام کردے۔ فوراً وہ صفت اپنی جلوہ سے دنیا میں ایسے سامان پیدا کردیتی ہے کہ اسکے کام آپ ہی آپ ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ انبیاء اور ان کے کئی اتباع دینوی کاموں سے

علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ مگر خدا ان کے سارے کام پورے کرتا رہتا ہے +

تیسرا نفع یہ ہوتا ہے کہ ہم ان صفات کو اپنے اندر پیدا کر کے ترقی کر سکتے ہیں۔ یعنی پہلے درجہ میں تو انسان خدا تعالیٰ کی صفات کو اپنی مدد کیلئے بلاتا ہے جب اس سے ترقی کرتا ہے تو پھر خود صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرنے لگجاتا ہے۔ گویا خدا سے یہ نہیں چاہتا کہ اُسے رزق دے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ رزاقیت دے ربوبیت دے۔ ملکیت دے۔ رحمانیت دے۔ خالقیت دے اس حالت میں پہنچکر انسان کے اخلاق اور ہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ انسانوں میں رہتا ہے لیکن الگ ہی قسم کا انسان ہوتا ہے۔ دشمن بھی اسکے اخلاق دیکھکر حیران رہجاتا ہے۔ اور ان کی خوبی مانتا ہے۔ البتہ عداوت اور دشمنی کیوجہ سے یہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ بناوٹ کے طور پر کرتا ہے +

غرض پہلے تو انسان خدا کی صفات کا ظہور مانگتا ہے۔ لیکن پھر کہتا ہے کہ یہ صفات ہی دیدے۔ اب ساری صفات اسکے اندر پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور اب وہ ایسا شیشہ ہوتا ہے۔ کہ جس پر خدا کا عکس پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور دنیا اس کو دیکھتی ہے۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود کو الہام ہوا یا شمس یا قمر انت منی وانا منك۔ گویا حضرت صاحب کو خدا نے کہا کہ تو سورج ہے اور میں چاند ہوں۔ اور میں سورج ہوں۔ تو چاند ہے +

حضرت مسیح موعود کے ایک الہام کا مطلب

اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ لوگ مجھے نہ جانتے تھے تو نے بتایا ہے۔ کہ وہ ہے۔ اسلئے تو سورج ہے پھر تو اصل میں روشن نہیں ہے مینے اپنا پرتو تجھ پر ڈالا ہے۔ تب تو روشن ہوا ہے اسلئے میں سورج ہوں اور تو چاند ہے۔ اسی طرح بندہ خدا کی صفات کو لیکر خدا کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ غرض یہ تین قسم کے فوائد ہیں۔ جو صفات الٰہی سے حاصل ہو سکتے ہیں +

لقاءِ الٰہی

اسکے بعد ایک اور درجہ ہے جسے لقا کہتے ہیں۔ اسکے معنے ہیں خدا مل گیا۔ لقا کی تعریف کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا کے اندر شامل ہو جانا۔ بلکہ یہ کہ خدا کی صفات جو جلوہ گری کریں۔ ان کو اپنے اندر جذب کر لینا حضرت مسیح موعود نے اس کی لطیف مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ لوہا لیکر آگ میں ڈالو تو اس کی پہلی حالت یہ ہوگی۔ کہ معمولی گرم ہو گا

اور زیادہ گرم کیا جائیگا۔ تو جلانے کا کام کریگا۔ مگر اس کی شکل آگ کی سی نہیں ہوگی۔ اس سے ترقی کریگا تو آگ کی طرح چمک پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح بندہ کا لقا ہوتا ہے۔ بندہ خدا میں محو ہوتے ہوتے اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ لوگ سمجھنے لگجاتے ہیں۔ کہ یہ بندہ نہیں خدا ہے چنانچہ بعض بندوں کو اسیوجہ سے خدا بنا لیا گیا +

رویٔت اور لقا میں فرق

اب میں بتاتا ہوں کہ رویٔت کیا ہے اور لقا کیا۔ اور ان میں کیا فرق ہے؟ اسلئے یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ رویٔت تو عارضی ہوتی ہے یعنی اسکے یہ معنی ہیں۔ کہ خدا کا جلوہ دیکھ لیا۔ اور لقا کے معنے یہ ہیں کہ خدا مل گیا۔ اس کو پالیا یہ مستقل درجہ کا نام ہے۔ اور اصل لقا ہی ہے۔ رویٔت کے بعد لقا کا مقام ہے اور جسے یہ مقام حاصل ہو گیا اسے ایک قسم کی رویت ہمیشہ ہی حاصل ہوتی رہتی ہے +

لقا الٰہی سے کبھی نا امید نہیں ہونا چاہیئے

اب میں لقا کا کچھ ذکر کرتا ہوں۔ مگر اس سے قبل یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ خدا سے ملنے میں مومن کو کبھی نا امید نہ ہونا چاہیئے۔ اسلئے کہ خدا تعالےٰ خود چاہتا ہے کہ بندہ اس سے ملے۔ اگر یہ خواہش صرف ہماری طرف سے ہوتی تو اور بات تھی۔ مگر اب تو یہ صورت ہے جس طرح کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ملنے کا تب مزا ہے کہ دونوں ہوں بے قرار   دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

بس چونکہ خدا تعالےٰ خود بندہ کے لقا کو چاہتا ہے۔ اسلئے اس سے نا امید نہیں ہونا چاہیئے۔

پہلی خطاؤں کی معافی

لقاء کیلئے یہ ضروری ہے کہ انسان پہلے پچھلی صفائی کرے اسکے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑا آسان طریق بتلایا ہے۔ ایک شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ اور آکر کہا حضور مجھ سے خطا ہو گئی ہے۔ میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا تمہاری ماں زندہ ہے۔ اسنے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا خالہ ہے؟ کہا نہیں۔ فرمایا کوئی اور رشتہ دار جو ہے۔ اسکی خدمت کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان رشتوں کا ادب اور خدمت کرنا خطاؤں کو معاف کراتا ہے۔ مگر تین باتیں اس سے پہلے سوچے۔

ایک یہ کہ نیت کرے۔ اور اخلاص اسکے اندر رہو۔

دوسرے یہ کہ سستی اور غفلت ترک کرے۔

تیسرے یہ کہ بات کو سوچنے کی عادت ڈالے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو۔ تو کامیاب نہ ہوگا۔ اگر کسی کی نیت نیک نہ ہو تو کوئی اسے نوکر نہیں رکھتا۔ اگر کوئی سست ہو۔ تو بھی اسے کوئی نہیں رکھتا۔ اور اگر بات کچھ کی جائے۔ اور سمجھے کچھ اور تو بھی نہیں رکھتا۔ پس توبہ کے ساتھ یہ تینوں باتیں بھی ہونی ضروری ہیں۔ اور جو لقائے الٰہی کے خواہشمند ہوں انہیں فوراً یہ باتیں پیدا کرنی چاہئیں ÷

خدا تک پہنچنے کا رستہ اسکے بعد میں لقا کے متعلق موٹا طریق بتاتا ہوں۔ اور تفصیل کو چھوڑ دیتا ہوں۔ کیونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

یاد رکھو کہ لقاء کا مطلب خدا تک پہنچنا ہے۔ اور تک کا لفظ اسیوقت بولا جاتا ہے جب کہ درمیان راستہ ہو جسے ہمنے طے کرنا ہو۔ پس ہمیں لقاء کیلئے راستہ تلاش کرنا پڑیگا جس پر چل کر ہم اس مقصد کو حاصل کر سکیں۔ چونکہ اس مقصد کو صرف قرآن کریم ہی پورا کر سکتا ہے اسلئے ہم اسی کیطرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون پر اس میں مکمل روشنی ڈالی گئی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ الحمد للہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم۔ مالك یوم الدین۔ ایاك نعبد و ایاك نستعین۔ اھدنا الصراط المستقیم۔ ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ مومن اللہ تعالےٰ سے ایک رستہ دکھانے کی درخواست کرتا ہے۔ پھر دوسری جگہ آتا ہے۔ صراطك المستقیم (۷-۱۵) وہ راستہ مجھے دکھا جو تیری طرف سیدھا چلا آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ میں جس راستہ کے دکھانے کی دعا سکھائی گئی ہے وہ وہی راستہ ہے جو سیدھا خدا تک پہنچتا ہے اب یہ سوال ہے کہ وہ کونسا رستہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبُلنا (۲۹-۶۹) جو لوگ ہماری ملاقات کیلئے کوشش کرتے ہیں ہم انہیں یقیناً اپنے تک پہنچنے کے راستے بتا دیتے ہیں۔ مگر ان سب راستوں سے ایک مکمل اور مجمل راستہ ہے جسے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اور وہ راستہ وہی ہے جو سورۃ فاتحہ میں بتایا گیا ہے۔ عقل کہتی ہے

جب خدا تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں راستہ کے دکھانے کی دعا سکھائی ہے تو پہلے راستہ بھی بتایا ہوگا تبھی اسکے بعد یہ دعا سکھائی کہ اب اس راستہ پر مجھے چلا۔ جب ہم سورہ فاتحہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر ایک روحانی راستہ نظر آتا ہے اور وہ راستہ سورہُ فاتحہ میں بیان کردہ چار صفات الٰہیہ ہیں۔ مگر راستہ کا لفظ بتاتا ہے کہ ان صفات کو حاصل کرنے میں ایک ترتیب ملحوظ ہے۔ پہلے ایک صفت کو انسان حاصل کر سکتا ہے اسکے بعد دوسری کو پھر تیسری کو اور ہم تبھی اس راستہ پر چلنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جب ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کس ترتیب سے ان صفات کو اپنے اندر ہمیں پیدا کرنا چاہیئے۔

اس سوال کو حل کرنے کے بعد ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ جب بندہ کی طرف آتا ہے تو وہ تنزل اور تشبیہ اختیار کرتا ہے ورنہ اس کی ذات وراء الوراء ہے۔ اور جب ایک اعلیٰ ہستی جو وراء الورٰی ہو وہ محدود سے ملنے کیلئے آئے تو یقیناً وہ تدریجاً تشبیہ اور تنزل اختیار کرتی چلی جائے گی اسکے بغیر وہ اس سے کبھی مل نہیں سکیگی۔ پس صفات الٰہیہ جتنی جتنی بندہ کے ساتھ تعلق زیادہ پیدا کرتی چلی جائینگی وہ اسیقدر تنزل اور تشبیہ اختیار کرتی چلی جائینگی اور اسکے مقابلہ میں بندہ جس قدر خدا تعالیٰ کے قریب ہونیکی کوشش کریگا اسیقدر وہ مادیت کو چھوڑ کر وسعت اختیار کرتا چلا جائیگا۔ اس امر کو سمجھنے کیلئے یہ فرض کر لو کہ خدا تعالےٰ کے پاس جانے کا رستہ ایک بڑے دریا کی طرح ہے اس کا وہ نقطہ جدہر بندہ ہے اس کی مثال پہاڑ کی سی ہے اور وہ نقطہ جس طرف خدا تعالےٰ ہے اس کی مثال سمندر کی سی ہے۔ محدود اور چھوٹے نقطہ کی طرف دیکھو دریا چھوٹا ہوتا چلا جائیگا۔ اور وسیع نقطہ کی طرف وسیع ہوتا چلا جائیگا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہوگا کہ جہاں وسعت ہوگی وہاں زور کم ہوگا اور جہاں تنگی ہوگی وہاں زور ہو جائیگا اور شور بھی بڑھتا چلا جائیگا۔ یہی حال خدا تعالیٰ کی صفات کے ظہور کا ہے وہ بھی جوں جوں اس نقطہ کے قریب ہوتی ہیں جو خدا تعالےٰ سے تعلق رکھتا ہے زیادہ وسیع ہوتی چلی جاتی ہیں اور انکے اثر مخفی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور جوں جوں وہ بندوں کی طرف آتی ہیں انکا دائرہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے اور ان کا ظہور زیادہ واضح ہوتا چلا جاتا ہے ×

دنیا میں تو ہم یہ قاعدہ دیکھتے۔ کہ چھوٹی چیز بڑھ کر بڑی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جیسے بیج درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی حالت انسانی ترقی کی ہے۔ مگر خدا کی صفات جب ظہور کرینگی۔ تو چونکہ وہ تنزل اور تشبیہ اختیار کرتی ہیں اسلئے ان کا دائرہ تنگ ہوتا چلا جائیگا۔ بالکل اسیطرح جس طرح دریا پہاڑ کی طرف چھوٹا ہوتا ہے یا جس طرح سورج کے لاکھوں میل انسانی آنکھ کی مناسبت سے ایک ٹکیا کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس تمام قاعدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم خدا تعالیٰ کیطرف جانیوالے راستہ کو دیکھیں تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ خدا تعالیٰ کی صفات جب تنزل اختیار کرتی ہیں تو جو ان کی پہلی منزل ہوگی وہ بندہ کی آخری منزل ہوگی اور جو ان کی آخری منزل ہوگی وہ بندہ کی پہلی منزل ہوگی۔ کیونکہ بندہ نیچے سے اوپر جا رہا ہے اور وہ اوپر سے نیچے کو آرہی ہیں۔ اسی طرح یہ کہ خدا تعالیٰ کی صفات جب تنزل اختیار کرتی ہیں تو ان کی پہلی منزل زیادہ وسیع ہوگی اور آخری سب سے تنگ۔ لیکن بندہ کی ترقی اس کے الٹ ہوگی۔ اس کی پہلی منزل زیادہ محدود ہوگی اور آخری بہت زیادہ وسیع۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر رہا ہے +

خدا کی بندہ کی طرف آنے کی منزلیں

اس قاعدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے سورۃ فاتحہ سے سیر فی اللہ کا راستہ نہائت آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس سورۃ میں چار صفات الٰہیہ بیان ہوئی ہیں۔ رب العالمین۔ رحمٰن۔ رحیم اور مالک یوم الدین پچھلے قاعدہ کے مطابق یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رب العالمین ان چاروں صفات میں سے تشبیہ اور تنزل کا حصہ کم رکھتی ہے اور زیادہ وسیع ہے اس سے کم رحمٰنیت اس سے کم رحیمیت اس سے کم مالکیت یوم الدین۔ گویا جب اللہ تعالیٰ نے جو وراء الوریٰ ہے تنزل اختیار کیا تو اسکی صفت رب العالمین ظاہر ہوئی۔ جب اور تنزل کیا تو رحمٰنیت جب اور تنزل کیا تو رحیمیت اور جب اور تنزل کیا تو مالکیت یوم الدین کی صفت ظاہر ہوئی لیکن اسکے مقابلہ میں جب بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف قدم بڑھائیگا تو وہ سب سے پہلے جس منزل پر پہنچیگا وہ مالکیت یوم الدین ہوگی۔ اسکے بعد وہ رحیمیت اور اسکے بعد رحمٰنیت اور اسکے بعد ربوبیت عالمین کی منازل تک پہنچیگا گویا خدا تعالیٰ کی صفات کے تنزل کی منازل کی پہلی منزل بندہ کیلئے آخری ہوگی۔ اور انکی آخری

منزل بندہ کیلئے پہلی منزل ہوگی +

دوسری بات مذکورہ بالا قاعدہ کے رو سے یہ معلوم ہوئی کہ مالک یوم الدین کی صفت مخفی ہے۔ اس سے ظاہر رحیمیت کی۔ اس سے ظاہر رحمانیت کی اور اس سے ظاہر ربوبیت کی

صفت رب العلمین کا جلوہ

غور کر کے دیکھو رب العلمین کی صفت نہائت وسیع ہے وہ ساری دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ سورج۔ چاند۔ جانور وغیرہ سب پر محیط ہے۔ اور اسی وجہ سے زیادہ مخفی ہے۔ رب پیدا کرنے والے کو کہتے ہیں اور یہ صفت اتنی مخفی ہے کہ بعض اوقات لوگ کہہ دیتے ہیں۔ کہ خدا نے کب کوئی چیز پیدا کی ہے۔ اب پیدا کر کے دکھائے۔ پھر ربوبیت کی صفت کے ماتحت وہ میلان بھی ہے جو ماں باپ کے اندر رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ماں باپ پرورش کرتے ہیں۔ تو گویا خدا کی ربوبیت یہ ہوئی کہ اسنے بندہ کو پیدا کیا ہے۔ اور اسکے اندر وہ طاقتیں پیدا کی ہیں۔ جن سے آگے انسان پیدا ہو سکے۔ پھر جس طرح بچہ کو ماں باپ بڑھاتے ہیں۔ کہ بڑا ہو کر ان کے کام آئے۔ اسی طرح خدا تعالے کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو سمجھنے کی طاقتیں دیں ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ سے اسے سمجھ سکے اور ان طاقتوں کے پیدا کرنے میں اسنے جبر سے کام لیا ہے یعنی انسان کا اختیار نہیں رکھا کہ وہ طاقتیں لے یا نہ لے۔ بعینہ جس طرح ماں باپ بچے کو بچپن میں جبراً تعلیم دیتے ہیں اسی صفت کے ماتحت انسان کو انسانیت مطلقہ دیجاتی ہے۔ اگر خدا تعالیٰ جبراً یہ طاقتیں سب کو نہ دے تو سب انسان مکلف بھی نہ رہیں۔ ہاں جب انسان کو سمجھ آتی ہے تو پھر یہ اسکے ارادہ پر منحصر ہے کہ وہ ان طاقتوں کو استعمال کرے یا نہ کرے جس طرح کہ ماں باپ بچے کو پڑھا دیتے ہیں آگے وہ اس علم سے کام لے یا نہ لے یہ اسکے ارادے پر منحصر ہے۔ چونکہ یہ صفت ہر ذرہ ذرہ سے تعلق رکھتی ہے اسلئے بوجہ اپنی وسعت کے اس قدر نمایاں نہیں اور انسان بھی اس کی طرف قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ بعض خدا تعالیٰ کو ماننے والے بھی کہہ اُٹھتے ہیں کہ کس نے کہا تھا کہ خدا ہمیں پیدا کرے +

صفت رحمانیت اور رحیمیت کا جلوہ

چونکہ ربوبیت کی صفت بہت مخفی تھی اسلئے اللہ تعالیٰ کی ذات نے اور تنزل کیا اور صفت رحمانیت کا جلوہ دکھایا اور رحمانیت کے جلوہ میں ایسی چیزیں انسان کیلئے مہیا کیں کہ جن کی اسے ضرورت تھی۔ جیسے ہوا۔ سورج۔

چاند وغیرہ چونکہ یہ جلوہ زیادہ ظاہر ہے لوگ اسکی قدر نسبتاً زیادہ کرتے ہیں اور یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اسنے ہمارے آرام کیلئے اس قدر سامان پیدا کیا ہے مگر پھر بھی یہ صفت ایک حد تک مخفی ہی ہے کیونکہ اسکا تعلق انسانی اعمال سے نہیں ہوتا اسلئے اس کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ جنس سے ہوتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے ایک اور منزل تیار کی اور وہ صفت رحیمیت ہے۔ اسکے معنے ہیں کہ انسان کام کرے۔ تو بدلا پائے۔ جو کام نہ کرے۔ وہ نہ پائے۔ اس صفت کے ماتحت خدا تعالیٰ کا تعلق افراد سے بھی قائم ہو گیا۔ پس اس کا ظہور اور زیادہ واضح ہے +

صفت مالکیت کا جلوہ پھر صفات الٰہیہ نے اس سے بھی تنزل اختیار کیا۔ اور مالک یوم الدین کے رنگ میں جلوہ کیا۔ ہر ایک انسان الگ الگ خدا کے حضور پیش ہوگا۔ اس طرح خدا ہر ایک کے سامنے ہو گیا۔ اور یہ صفت اتنی ظاہر ہوگی۔ کہ جب قیامت کے دن لوگ خدا کے سامنے پیش ہونگے تو نبی بھی کہینگے نفسی نفسی ہر ایک کو اپنی اپنی فکر ہوگی۔ کسی اور کی فکر نہ ہوگی۔ حدیثوں میں آتا ہے۔ رسول کریم فرماتے ہیں۔ کہ جب ایسی حالت ہوگی۔ تو لوگ کہینگے نبیوں کے پاس چلو۔ اس پر وہ آدمؑ۔ نوحؑ اور موسیٰؑ کے پاس آئینگے۔ مگر وہ نفسی نفسی کہیں گے۔ پھر لوگ رسول کریم کے پاس آئینگے۔ اور آپ ان کی سفارش کرینگے اور یہ سفارش خدا کے وعدہ کے مطابق ہوگی نہ کہ اپنے زور سے۔ تب لوگوں کا خطرہ دور ہوگا +

بندہ کا خدا تک پہنچنا اب جب بندہ اوپر چڑھیگا۔ تو پہلے مالک کی صفت پر پہنچیگا۔ پھر رحیمیت۔ پھر رحمانیت۔ پھر ربوبیت کی صفت پر اور پھر خدا کو دیکھ لے گا +

اب ہمنے یہ دیکھنا ہے کہ بندہ کس طرح ان صفات کو اختیار کرے؟ اور یہ سوال نہایت اہم اور قابل توجہ ہے۔ پہلا جس قدر مضمون تھا وہ درحقیقت اس مضمون کیلئے بطور تمہید کے تھا +

بندہ کا مالک یوم الدین بننا یاد رکھنا چاہئے کہ بندہ سب سے پہلے مالک یوم الدین کی صفت کو حاصل کر سکتا ہے۔ مالک یوم الدین کے معنی ہیں جزا و سزا کا فیصلہ کرنا اور جج بننا۔ اسکے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ بندہ کے اندر جج بننے کی قابلیت ہے یا نہیں۔ سو ہم جب انسان کی

قوتوں پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر بندہ مالک یوم الدین ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ہر انسان جب کسی کو کوئی کام کرتے دیکھتا ہے تو معًا اسکے متعلق ایک رائے لگا لیتا ہے خواہ کوئی چھوٹا بچہ ہو یا بڑا معمر انسان۔ زمیندار ہو یا تعلیم یافتہ۔ جب بھی کسی کو کوئی کام کرتے دیکھتا ہے تو اس پر رائے لگا لیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ نے ہر ایک انسان میں جج بننے کی قابلیت رکھی ہے۔ خواہ کوئی ادنیٰ ہو یا اعلےٰ۔ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ۔ اسکے اندر یہ قابلیت ہوتی ہے کہ وہ ججی کرتا ہے۔ کبھی کسی کو نیک قرار دیتا ہے۔ کسی کو بد۔ کسی کو شرارتی بناتا ہے۔ کسی کو بھلا مانس۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ انسانی آنکھوں کے سامنے سے کوئی چیز گذرے یا کسی اور حس کے ذریعہ سے کسی امر کا علم ہو اور اس کے متعلق انسان کوئی فیصلہ نہ کرے۔ پس ہر انسان جج ہے۔ مگر یہ انسانی حالت مخفی ہے۔ کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ دوسرا شخص اسپر جج بن رہا ہے جس طرح خدا کی رب العالمین والی صفت مخفی تھی اسی طرح بندہ کی مالکیت یوم الدین والی صفت مخفی ہوتی ہے یہ مالکیت ایسی ہے کہ اسے کوئی بادشاہ بھی نہیں چھین سکتا۔ اور اس کا نام حریت ضمیر ہے۔ بادشاہ مال چھین سکتے ہیں جائیدادیں چھین سکتے ہیں، وطن سے نکال سکتے ہیں لیکن باوجود اسکے اس ججی کی صفت کو نہیں چھین سکتے۔ اگر پھانسی پر بھی چڑھا دینگے۔ تو اس وقت بھی پھانسی پر چڑھنے والے کا دماغ کام کر رہا ہوگا اور فیصلہ کر رہا ہوگا کہ یہ بادشاہ ظالم ہے یا انصاف کے ماتحت اسے پھانسی دے رہا ہے۔ یہ صفت درحقیقت خدا تعالیٰ کا ایک جلوہ ہے جو انسان میں پایا جاتا ہے +

اب یہ تو معلوم ہو گیا کہ خدا نے انسان کو مالک یوم الدین بنانے کی طاقت اس میں رکھی ہے مگر اسپر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات تو مومن و کافر سب میں پائی جاتی ہے۔ پس یہ سیر فی اللہ کا زینہ کس طرح بن سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طاقت لقاء تو سب میں رکھی گئی ہے مگر سیر کیلئے اس طاقت کو خاص طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ لقائے الٰہی خدا تعالیٰ کی صفات کی مشابہت سے حاصل ہوتا ہے اسلئے سیر فی اللہ کیلئے ضروری ہوگا کہ سب سے پہلے انسان اس ججی کی مخفی طاقت کو اسی طرح استعمال کرے جس طرح کہ خدا تعالےٰ اپنی صفت مالکیت کو استعمال کرتا ہے +

خدا تعالیٰ کی صفت مالک یوم الدین کس طرح عمل کرتی ہے؟

قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی صفت مالک یوم الدین کو مندرجہ ذیل اصول کے مطابق استعمال فرماتا ہے۔ اول اصل اس صفت کے اجراء کے متعلق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہر چیز کے تمام پہلوؤں کو جان کر فیصلہ کرتا ہے۔ بے جانے کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ اب جو شخص خدا تعالیٰ کی اس صفت کو جلوہ گر دیکھنا چاہے اسے چاہیئے کہ غور کرے کہ کیا وہ بھی اسی طرح کرتا ہے۔ یا وہ جونہی سنتا ہے کہ فلاں شخص نے چوری کی ہے تو کہدیتا ہے کہ تب تو وہ بہت بُرا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ اس طرح نہیں کرتا۔ اسلئے خدا کی قضاء اور بندہ کی قضاء میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ سارے حالات معلوم کرکے فیصلہ کرتا ہے اور انسان یونہی فیصلہ کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ جس طرح روزمرہ ہر انسان فیصلہ کرنے لگجاتا ہے سب مجسٹریٹ اسی طرح کرنے لگ جائیں تو دنیا میں اندھیر مچ جائے۔ کوئی کسی کے متعلق جاکر کہے۔ کہ فلاں نے چوری کی ہے۔ اور مجسٹریٹ سنتے ہی فوراً اس شخص کو قید کرڈالے تو کس قدر ظلم برپا ہو جائے۔ پس اپنے نفس میں سوچو کہ وہ قضاء جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے سپرد کی ہے اس کو تم کس طرح استعمال کرتے ہو۔ اگر خدا تعالیٰ جس طرح اپنے جج ہونے کی صفت کو استعمال کرتا ہے اسی طرح نہیں کرتے تو اس کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتے۔ اور اگر اس کی طرف قدم بڑھانا چاہتے ہو تو چاہیئے کہ اپنے دماغ کے گوشوں میں بھی کسی کی نسبت بغیر تحقیق و تدقیق کوئی خیال نہ آنے دو جبتک پہلے کامل تحقیق نہ کرلو۔

جس کا قصور ہو اسی کو سزا دو

دوسری اور تیسری خصوصیت خدا تعالیٰ کے فیصلہ میں یہ پائی جاتی ہے۔ کہ جس کام کا جرم ہوتا ہے۔ اور جس کے متعلق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے دوسروں کے جرموں کی وجہ سے نہیں پکڑتا۔ اور نہ دوسروں کو اس کی بجائے پکڑتا ہے۔ پس اس شخص کو جو خدا تعالیٰ کی صفت مالکیت کو اپنے اندر جلوہ گر کرنا چاہتا ہے سوچنا چاہیئے کہ کیا وہ بھی اسی طرح کرتا ہے کیا وہ اس طرح تو نہیں کرتا کہ جب اسے کسی شخص سے نفرت پیدا ہوتی ہے تو اسکے بھائی سے بھی نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ جس کا قصور ہوتا ہے۔ اسی کو سزا دیتا ہے۔ پس صفت مالکیت میں خدا تعالیٰ کے ساتھ مشابہت

پیدا کرنے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس کی نسبت کوئی فیصلہ کرنا ہو۔ اپنے فیصلہ کو اسی کی نسبت محدود رکھو نہ کہ اس کی وجہ سے اسکے رشتہ داروں اور دوستوں کو بھی برا سمجھو۔ اور نہ یہ کرو کہ دوسرے کے جرم کی وجہ سے اسے پکڑ دو +

جرم کے مطابق سزا دو چوتھی خصوصیت خدا تعالیٰ کی قضا میں یہ ہے کہ وہ جسقدر جرم کسی کا ہو اتنی ہی سزا دیتا ہے۔ سالک کو چاہئے کہ وہ بھی ایسا ہی کرے یہ نہو کہ مثلاً اسے کسی نے گالی دی۔ اور وہ اسکے بدلہ میں یہ خواہش کرے کہ اگر بس چلے تو اسے مار دوں۔ بلکہ خدا تعالےٰ کی طرح اگر سزا دینی ہی پڑے یا رائے قائم کرنی ہو تو جرم کے مطابق ہی سزا دے یا رائے قائم کرے۔

فیصلہ کرتے وقت میزان رکھو پانچویں بات خدا تعالیٰ یہ کرتا ہے۔ کہ جب فیصلہ کرتا ہے تو میزان رکھتا ہے۔ یعنی یہ دیکھتا ہے۔ کہ جرم تو کیا مگر کس حالت میں؟ ایک شخص نے چوری سے کسی کی روٹی کھالی۔ یہ جرم ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اسکے جرم کا فیصلہ کرتے وقت یہ بھی دیکھتا ہے کہ اسنے کس حالت میں وہ روٹی کھائی ہے۔ آیا دوسرے کے مال پر تصرف کرنیکے لئے یا یہ کہ وہ بھوک سے مجبور تھا اور اور کوئی ذریعہ پیٹ بھرنیکا اسے معلوم نہیں تھا۔ پس جو سالک ہو اسے بھی چاہئے کہ اسی طرح کرے۔ یہی نہ دیکھے کہ کسی نے کیا جرم کیا ہے بلکہ اسکے حالات اور مجبوریوں کو بھی دیکھے اور اندھا دھند فیصلہ نہ کرے۔ خدا تعالےٰ ہمیشہ ہر کمزوری کی وجہ مدنظر رکھتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت مسیح موعود کا پتہ نہ ہو خدا کا قانون اسے کافر تو قرار دیگا مگر خدا تعالےٰ اسے اسوجہ سے سزا نہیں دیگا۔ کیونکہ بوجہ علم نہ ہونیکے اسکے لئے ناممکن تھا کہ ایمان لاسکے +

سفارش نہ سنو چھٹی بات خدا تعالےٰ یہ کرتا ہے کہ کسی کے خلاف کسی کی سفارش نہیں سنتا تمہارے لئے بھی ضروری ہے۔ کہ کسی کے کہنے پر کسی کے متعلق فیصلہ نہ کرو۔ تمہیں خود خدا نے جج بنایا ہے۔ تم کسی کی کیوں سنو +

ہر فیصلہ میں رحم کا پہلو غالب ہو ساتویں بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا امور کو مدنظر رکھکر فیصلہ کرنے کے باوجود خدا تعالیٰ جب فیصلہ کرتا ہے تو اس میں رحم کا پہلو غالب رہتا ہے۔ ذرا گنجائش نکل آئی جھٹ معاف کر دیا۔ تمہیں بھی کسی کی برائی معلوم ہو جو ادنیٰ اور معمولی ہو۔ تو

برائی کا فیصلہ ہی نہ کرو بلکہ اس کی نیکیوں کو دیکھکر حتی الوسع اسکی طرف نیکی منسوب کرو۔

صفت مالکیت پیدا کرنے کا نتیجہ

یہ سات باتیں ہیں۔ جنکا خیال خدا تعالےٰ صفت مالکیت کے اظہار کے وقت رکھتا ہی۔ اگر بندہ بھی ان کو مدنظر رکھے تو آہستہ آہستہ اسکے اندر صفت مالک یوم الدین قائم ہو جائیگی اور اسے خدا تعالیٰ سے ایک مشابہت حاصل ہو جائے گی +

جب بندہ یہ استعداد پیدا کر لیتا ہے تو وہ مادہ کی طرح ہو جاتا ہے گو یا اس میں ترقی کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسوقت خدا تعالیٰ کی صفت مالک یوم الدین جو اس درجے کے آدمی کیلئے منبع فیض ہو اسپر اپنا پرتو ڈالتی ہے اور اس کی روح میں نئی طاقتیں پیدا کر دیتی ہے۔ حضرت مسیح موعود نے جو یہ لکھا ہے کہ میں پہلے مریم بنا اور پھر عیسیٰ بنا۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ آپکے اندر پہلے خدا تعالیٰ کی صفات کا اثر قبول کرنے کی قابلیت پیدا ہوئی بعد میں خدا تعالےٰ کے بالمقابل صفت کے اتصال سے نئی قوتیں حاصل ہوئیں جو عیسوی قوتوں سے مشابہ تھیں۔ یا اس حالت کی مثال تیار شدہ زمین کی سمجھ لو۔ جب سالک کی حالت اس طرح کی ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کی مالک یوم الدین والی صفت اسپر اثر ڈالتی ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح مرد عورت ملتے ہیں۔ یا زمین اور بیج ملتے ہیں۔ اور خدا تعالےٰ کی صفات ایسی نہیں کہ وہ کسی پر پر تو ڈالیں اور نتیجہ نہ نکلے اسلئے جب ان کا ظہور ہوتا ہے تو انسان کے اندر ضرور ہی نئی طاقت اور قوت پیدا ہو جاتی ہے +

یہ جو مینے بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفت مالکیت اسپر جلوہ کرتی ہے۔ اسکے یہ معنی ہیں۔ کہ جس طرح یہ لوگوں سے عفو کا معاملہ کرتا تھا خدا تعالےٰ بھی اس سے عفو کا معاملہ کرتا ہے۔ اور چونکہ گنہ ہی ایک ایسی زنجیر ہے جو انسان کی روحانی ترقی کی رفتار کو سست کرتی رہتی ہی جب یہ زنجیر کھل جاتی ہے تو انسان کی روحانی ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ دنیاوی سفر میں تو یہ ہوتا ہے کہ پہلے لوگ تیز چلتے ہیں۔ اور پھر جوں جوں تھکتے جاتے ہیں۔ آہستہ چلنے لگتے ہیں۔ مگر خدا کی منزلیں ایسی ہیں کہ پہلے انسان آہستہ چلتا ہے۔ اور پھر تیز۔ کیونکہ اسے ہر قدم پر نئی طاقت ملتی جاتی ہے +

صفت مالکیت پیدا کرنے کا فائدہ

اگر لوگ مالک یوم الدین کی صفت کو اپنے اندر پیدا کریں تو پھر سارے جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ لوگوں میں لڑائی اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ جج کی طاقتوں کو غلط طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اگر انہیں صحیح طور پر استعمال کریں۔ تو کبھی لڑائی نہو۔ قرآن کریم میں خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ اگر زیادہ الٰہ ہوں تو فساد ہو جائے اور ادھر فرماتا ہے کہ بحر و بر میں فساد پیدا ہو گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت زیادہ الٰہ بنگئے تھے یعنی لوگ خدا تعالیٰ کی صفت مالکیت کے ماتحت اپنی قضاء کو کرنے کی بجائے اس صفت کو مستقل طور پر استعمال کرنے لگ گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑائی اور فساد پیدا ہو گیا۔ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ فساد ہمیشہ خدا تعالےٰ کی صفات سے علیحدگی اور مستقل پالیسی اختیار کرنیسے پیدا ہوتا ہے +

حضرت مسیح نے کہا ہے جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ وہ دوسرے کیلئے بھی پسند نہ کرو۔ اگر کوئی یہ پسند نہیں کرتا۔ کہ کوئی اس کا مال چرائے تو اس کو بھی چاہئے۔ کہ کسی کا نہ چرائے اسلام نے بھی ایسی باتیں کہی ہیں۔ مگر ادنیٰ درجہ کے لوگوں کیلئے۔ اور اعلیٰ لوگوں کے لئے یہ کہا ہے۔ کہ یہ نہ دیکھو دوسرا کیا کرتا ہے۔ بلکہ یہ دیکھو کہ خدا کیا کرتا ہے۔ جو کچھ خدا کرتا ہے وہی تم کرو۔ خدا چونکہ غلطی نہیں کرتا۔ اسلئے انسان جب اسکی اتباع کریگا تو وہ بھی غلطی سے بچ جائیگا۔

بندہ کا درجہ رحیمیت پانا

صفت مالکیت بیج کی طرح ہے اس سے اوپر رحیمیت کا درجہ ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ کام سے بڑھکر بدلا دینا۔ پہلے وہ سات باتیں اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ فیصلہ کر لینا چاہئے۔ کہ ان کو مدنظر رکھکر فیصلہ کرینگے نہ ان سے باہر جائینگے۔ نہ ان کو چھوڑینگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ خدا سالک کے گناہ مٹاتا جائیگا۔ اور اگر کوئی غلطی ہوگی تو اسے نظر انداز کر دیگا اور اسکا یہ فائدہ ہوگا۔ کہ اسکے دل میں بدی سے نفرت پیدا ہو جائیگی +

اسکے بعد رحیمیت کی مشابہت میں یہ عادت پیدا کرنی چاہئے کہ ہر کام کرنیوالے کو اس کے حق سے زیادہ دیا جائے۔ مثلاً ایک شخص کسی کا نوکر ہو۔ وہ یہ فیصلہ کرے کہ میرا مالک جو تنخواہ مجھے دیتا ہے اور اسکے بدلے جتنے کام کی امید مجھ سے رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ کام میں کرونگا۔

اور مالک یہ فیصلہ کرے۔ کہ اس کام کی جتنی تنخواہ مقرر ہوئی ہے میں اس سے زیادہ سلوک ملازم سے کرونگا۔ اگر آقا اور نوکر دونوں ایسے ہوں۔ کہ اس اصل پر چلیں۔ تو یہ بھی ایک قسم کا مقابلہ ہوگا۔ مگر کیسا عجیب مقابلہ ہوگا جو صلح اور امن پیدا کردیگا۔ صحابہ میں اس قسم کے واقعات ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ایک صحابی اپنا گھوڑا بیچنے کیلئے آئے۔ اور ایک دوسرے صحابی اسے خریدنے لگے۔ گھوڑے کے مالک نے مثلاً دو ہزار درہم قیمت بتائی اور لینے والے نے تین ہزار درہم۔ بیچنے والا اسپر مصر تھا کہ میں دو ہزار سے زیادہ نہ لونگا۔ کیونکہ میرا گھوڑا اس سے زیادہ قیمت کا نہیں ہے۔ لیکن گھوڑا خریدنیوالا کہتا تھا کہ میں تین ہزار سے کم نہ دونگا۔ کیونکہ یہ گھوڑا اس سے کم قیمت کا نہیں ہے۔ اگر ساری دنیا کے لوگوں کی یہی حالت ہو تو خیال کرو کہ دنیا کیسی خوبصورت بنجائے گی؟۔

یا مثلاً ایک مزدور ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ اتنی مزدوری میں مجھے اتنا کام کرنا چاہئے۔ وہ اس سے زیادہ کرے۔ اور جس نے اسے لگایا ہو۔ وہ مقررہ مزدوری سے کچھ زیادہ دیدے۔ یہی اصول زندگی کے ہر شعبہ میں برتنے کی کوشش کیجائے۔ مگر سوال ہو سکتا ہے۔ کہ ایک غریب شخص ہے وہ کیا کرے یا زمیندار ہے وہ کیا کرے؟

اسکے متعلق میں زمینداروں ہی کی مثال دیتا ہوں۔ مثلاً ایک زمیندار ہے۔ جب وہ کھیت کاٹنے کیلئے لوگوں کو لگائے۔ اور کہے کہ میں کاٹنے والوں کو اس اس قدر غلہ دونگا اب اگر وہ اس غلہ سے زیادہ دے یا روٹی کھلادے تو وہ گویا اس صفت پر عمل پیرا ہو جائیگا۔ یا مثلاً گنے چھیلنے پر لگایا اور اسکے لئے مزدوری مقرر کی۔ جو ادا کردیگی۔ مگر چلتے وقت اسے بچوں کیلئے گنے دے دیئے۔ یا رس دیدی۔ یا گڑ۔ شکر دیدی۔ یہ رحیمیت ہوگی۔ خواہ کتنی ہی تھوڑی چیز مزدوری سے زائد دیجائے وہ اس صفت کے ماتحت آئیگی۔ پس تم میں سے ہر شخص اس صفت کو استعمال کر سکتا ہے۔ اگر امیر ہے تو بدلا دینے میں زیادہ دے سکتا ہے۔ اور اگر نوکر ہے تو کام کرنے میں زیادتی کر سکتا ہے +

مگر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ کسی کے نوکر ہو سکتے ہیں۔ نہ ان کے کوئی نوکر ہو سکتے ہیں۔ جیسے نابینا وغیرہ۔ ان کی بھی رحیمیت ہے۔ اور وہ یہ کہ جو اچھے کام کرنیوالے لوگ ہیں۔ انکی

لوگوں میں قدر بڑہائیں۔ اس طرح کام کرنیوالوں کا دل بڑھتا ہے اور وہ اور زیادہ اچھا کام کر سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی کا دل بڑہانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے لوگ اچھی رائے حاصل کرنیکے لئے بہت سا مال و دولت خرچ کر دیتے ہیں۔ حضرت مسیح موعودؑ سنایا کرتے تھے۔ کہ ایک عورت نے ایک انگوٹھی بنوائی وہ اسے دوسری عورتوں کو دکھانے کی بہت کوشش کرتی رہی۔ مگر کسی نے توجہ نہ کی۔ آخر اس نے اپنے مکان کو آگ لگا دی۔ اور جب عورتیں افسوس کرنے کے لئے اسکے پاس آئیں اور پوچھا کچھ بچا بھی تو کہنے لگی۔ اس انگوٹھی کے سوا اور کچھ نہیں بچا۔ ایک عورت نے پوچھا۔ یہ تم نے کب بنوائی تھی؟ یہ تو بہت ہی خوبصورت ہے۔ اسنے کہا اگر کوئی پہلے یہی بات کہدیتا تو میرا گھر کیوں جلتا۔ غرض طرح منہ کی بات بھی بڑا اثر رکھتی ہے۔ کسی کو ایک کام کرنے پر سو روپیہ دو۔ لیکن ساتھ ہی اسکی مذمت کر دو۔ تو اسے کبھی خوشی نہ حاصل ہوگی۔ یا چپ ہو رہو تو بھی اس کا حوصلہ پست ہو جائیگا۔ پس جو قومیں خدا کی رحیمیت کو جذب کرنا چاہتی ہیں۔ ان کا کام ہے کہ خود رحیم بنیں۔ جو ان کے کارکن ہوں۔ ان کی قدر کریں۔ ان کے کام کی تعریف کریں۔ زبان سے بدلا دینا معمولی بات نہیں ہوتی بلکہ اس میں بہت سے فوائد ہیں مگر اس پر عمل کرنے میں کسیکا کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ جو کوئی مفید کام کرتا ہے۔ تمہارا فرض ہے۔ کہ اس کی تعریف کرو۔ ہماری جماعت میں ابھی یہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ ایک شخص ولایت میں دین کی خدمت کر رہا ہوتا ہے۔ اسکی بیوی بچے یہاں پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جیسے تمہاری بیویوں کو خواہشات ہوتی ہیں۔ اسی طرح اسکو بھی ہوتی ہیں۔ مگر اس کی بیوی تنہا سوتی اور تنہا ہی اُٹھتی ہے اسکے بچے لاوارثوں کی طرح باپ کی محبت کو ترس رہے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کے پاس نہیں ہوتا۔ ادھر مبلغ اپنی جگہ پر تنہا ہوتا ہے۔ وہ دین کا کام کر کے جب اپنے مکان میں جاتا ہے۔ تو اسے یہ توقع نہیں ہوتی۔ کہ مکان میں کوئی اس کی ضرورت کو پورا کرنے والا ہو گا۔ بلکہ اسے خود ہی آکر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ مگر لوگ ان باتوں کی ذرہ بھر بھی قدر نہیں کرتے۔ اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے۔ تو عیب نکالنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ عیب کو تو دیکھتے ہیں۔ مگر خوبیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض کارکن

سست ہو جاتے ہیں۔ اگر حوصلہ بڑھایا جائے، تو سب کارکن کام کرنے لگ جائیں۔ پس جو کام کریں ان کی قدر کرنی چاہیئے۔ میں خصوصاً قادیان کے لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ کام کرنیوالوں کی قدر کی عادت ڈالو۔ لوگوں کی فکروں۔ ذمہ داریوں اور مشکلوں کو نہ دیکھنا اور اعتراض کرتے جانا صفت رحیمیت کے خلاف ہے۔ پس رحیمیت کو پیدا کرو۔ اور اس کا استعمال ہر ایک شخص کر سکتا ہے۔ غریب سے غریب بھی کر سکتا ہے۔ خاص اپنے متعلق بھی اور عام بھی کہ جو اچھا کام کرتا ہے اُس کی تعریف کر دیجائے۔ پھر علاوہ تعریف کے خدا کے آگے اُسکے لئے دعا مانگو کہ وہ اچھا کام کر رہا ہے۔ میرے پاس تو اُسے دینے کیلئے کچھ نہیں۔ اے خدا تو ہی اپنے پاس سے اُسے دے *

غرض مزدور اپنے آقا کا زیادہ کام کرے۔ اور آقا مزدور کو مزدوری سے زیادہ دے۔ پھر جو دین کا کام کرنیوالے ہیں اُن کے کام کی قدر کیجائے اور اس سے بھی بڑھکر تعریف کیجائے، جتنا کہ وہ کام کرتے ہیں۔ نیکی پر خوشی کا اظہار کیا جائے تب جا کر صفت رحیمیت سے مناسبت پیدا ہوتی ہے۔ اور خدا سے تشابہ پیدا ہوتا ہے، اور غیریت جاتی رہتی ہے۔ اور جنس کو جنس سے تعلق ہو جاتا ہے۔ اور یہ صفت خدا تعالیٰ کو انسان کیطرف کھینچتی ہے اور اُس کی صفت رحیمیت انسان پر جلوہ کرتی ہے، اور اس جلوہ کے ماتحت اُس کا ثواب بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ وہ نماز ایک پڑھتا ہے تو ثواب سو کا ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ لیکن جو خود رحیم نہیں ہوتا وہ خواہ سارا دن نماز پڑھتا رہے وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ صرف اسی شخص کے حق میں کہ جو خود رحیم بنتا ہے خدا تعالیٰ کی صفت رحیمیت جوش میں آتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کہتا ہے میں بھی اسے بڑھکر دوں اور ایسے شخص کو اعلیٰ مقام ملجاتا ہے۔ لیکن جس کے اندر رحیمیت نہیں ہوتی وہ سارا سال نمازیں پڑھتا رہے تو بھی اُسے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک روحانی مقام اگر پچاس سال کی نمازوں کے بعد ملتا ہو۔ تو جو اپنے نفس میں رحیمیت پیدا نہیں کرتا وہ تو اگر ایک سال نمازیں پڑھیگا تو اُس کا ایک ہی سال گذریگا اور انچاس باقی رہینگے۔ لیکن وہ جس میں رحیمیت کی صفت ہوگی ایک سال نمازیں پڑھکے پچاس سال کا ثواب حاصل کریگا۔ کیونکہ اُسکے نفس کی رحیمیت خدا کی رحیمیت کو

کھینچیگی۔ اور خدا تعالیٰ کی رحیمیت کا تقاضا ہے کہ بندہ کے تھوڑے کام پر زیادہ بدلہ اور بار بار بدلا دے۔ پس اس صفت کے ذریعہ سے انسان تھوڑے عرصہ میں بڑے بڑے درجے حاصل کر لیتا ہے *

بندہ کا درجۂ رحمانیت پانا جب خدا تعالیٰ کی صفت رحیمیت انسان کی صفت رحیمیت سے ملتی ہے تو اُس میں اور نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ گویا پھر ایک روحانی جنم لیتا ہے اور رحمانیت کے مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ رحمانیت کے معنی ہیں، کہ کسی نے کچھ کام نہ بھی کیا ہو تو بھی اس سے نیک سلوک کرنا۔ جیسے خدا تعالیٰ نے سورج۔ چاند زمین آسمان۔ ہوا۔ پانی۔ پیدا کئے ہیں۔ یہ انسان کے کسی عمل کے نتیجہ میں نہیں ہیں۔ بلکہ اگر یہ نہ ہوتے تو انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا تھا۔ بندہ کا تیسرا مقام اسی صفت کا حصول ہے۔ اور وہ اس طرح کہ یہ پہلے تو صرف ان لوگوں سے حسن سلوک کرتا تھا جو اُس کا کام کرتے تھے۔ اب یہ کوشش کرتا ہے کہ جن سے اسکو کوئی بھی فائدہ نہیں اُن سے بھی نیک سلوک کرے۔ اس صفت کا حصول بھی غریب امیر سب کیلئے ممکن ہے۔ قادیان میں ایک مخلص نابینا تھے حافظ معین الدین ان کا نام تھا۔ اُنہیں اتنا توکل حاصل تھا کہ کسی کو کم ہی ہوگا۔ غریب آدمی تھے لنگر خانہ کی روٹی پر اُن کا گذارہ تھا اور لوگ اُنہیں نابینا سمجھکر کبھی کبھی کچھ مدد کر دیتے تھے وہ باوجود نابینا ہونیکے ادھر ادھر پتہ لگاتے رہتے تھے کہ کسی کے گھر فاقہ تو نہیں۔ یا اور کوئی تکلیف تو نہیں؟ اور اگر کوئی تکلیف زدہ اُنہیں معلوم ہوتا تو اپنی روٹی لیجا کر اُسے دے آتے۔ یا اگر اُن کے پاس پیسے ہوتے تو وہ دیدیتے۔ اُن کے اس قسم کے بہت سے واقعات مجھے معلوم ہیں پس اس صفت کی مشابہت پیدا کرنے کیلئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی مالدار ہی ہو۔ غربا بھی اپنے ذرائع کے مطابق رحمانیت کا جامہ پہن سکتے ہیں۔ اور بغیر کسی پچھلی خدمت کے صلہ یا آئندہ کی امید کے نیکی کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص مدرسہ میں ملازم ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں اپنے سارے وقت کے پیسے ہی وصول کروں تو یہ رحمانیت نہیں ہوگی۔ جیسے مدرسہ والے عام طور پر کرتے ہیں کہ ملازمت کے وقت سے باہر بھی کسی غریب کو مفت نہیں پڑھا سکتے۔ رحمانیت یہ ہے کہ جب کہ اپنے وقت کے ایک حصہ میں وہ اپنی معیشت کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ تو دوسرے وقت میں

وہ بعض غربا کو بغیر صلہ کی امید کے نفع پہنچادیں +

ایک عالم اسی طریق پر اپنے علم کو خرچ کرے۔ ایک مالدار اپنا مال خرچ کرے۔ اور یہ سمجھے کہ میں تو ایک سوراخ کے طور پر ہوں جس میں سے خدا ہاتھ ڈال کر دوسرے لوگوں کو دے رہا ہے۔ جو لوگ اس مقام پر پہنچ جائیں۔ اُن پر خدا کا فیضان پھر تیسری بار نازل ہوتا ہے۔ اور اس دفعہ خدا کی رحمانیت اُن کے لئے ظاہر ہوتی ہے +

بندہ خدا کا مہمان گویا ایسے بندے خدا کے مہمان ہوتے ہیں۔ اور وہ ہر منزل پر اُن کا استقبال کرتا ہے۔ جب انسان مالکیت کی منزل پر ہوتا ہے۔ تو خدا مالکیت کی شکل میں آتا ہے اور کہتا ہے آئیے۔ جب رحیمیت کی منزل پر ہوتا ہے۔ تو خدا رحیمیت کی شکل میں آتا ہے اور کہتا ہے آئیے۔ جب انسان رحمانیت کی منزل پر ہوتا ہے تو اللہ جل جلالہ رحمانیت کی صورت میں آتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ آئیے۔ رحمانیت کا مقام ایک نہائت ہی وسیع مقام ہے۔ اس مقام پر کئی باتیں انسان کو بتائی جاتی ہیں۔ اور رحمانیت کے ساتھ جو ہدایت تعلق رکھتی ہے وہ سکھائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الرحمٰن علم القراٰن۔ رحمان نے قرآن سکھایا ہے یعنی کلام الٰہی کا نزول صفت رحمانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مقام والا پیچھے نہیں ہٹتا۔ خدا تعالےٰ نئے نئے اخلاق اسے سکھاتا ہے اور نئے نئے ترقی کے سامان اسے دیتا ہے +

رب العالمین بننا صفت رحمانیت کو حاصل کرنے پر جب بندہ پر خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت جلوہ کرتی ہے تو اس میں پھر ایک نیا جوش پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے وہ چاہتا ہے کہ اور اوپر چڑھے۔ اسوقت اسکے لئے اگلی منزل آسان ہوجاتی ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ آؤ اب میں رب العالمین کی صفت کا بھی جلوہ گاہ بنوں۔ رب کا کام جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ماں باپ کے کام سے مشابہ ہوتا ہے۔ ماں باپ یہ نہیں کیا کرتے کہ دودھ گھر میں رکھدیں کہ بچہ آپ تلاش کرکے پی لیگا۔ بلکہ وہ یہ کرتے ہیں کہ بچہ کو خود تعہد سے دودھ پلاتے ہیں اور اگر وہ نہ پیئے تو جبراً پلاتے ہیں۔ اسی طرح جب بندہ اس مقام پر آتا ہے تو لوگوں کے پیچھے پڑ پڑ کر انہیں ہدایت منواتا ہے۔ اور اسی پر کفایت نہیں کرتا کہ صرف وعظ کرد ے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت

آتا ہے کہ آپ ایک دفعہ طائف میں تشریف لیگئے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ پر پتھر پھینکے۔ اور آپ وہاں سے واپس آگئے۔ آتے ہوئے رستہ میں ایک جگہ سستانے لگے باغ والے نے اپنے غلام کے ہاتھ کچھ میوہ آپ کیلئے بھیجا۔ آپ نے میوہ کی طرف توکم ہی توجہ کی اُس غلام ہی کو تبلیغ کرنے لگ گئے اور آپ کا یہ ہمیشہ دستور تھا کہ جہاں مکّہ کے لوگ جمع ہوتے آپ وہاں چلے جاتے اور اُنہیں تبلیغ کرتے۔ حج کیلئے جو لوگ آتے اُن کے خیموں میں تشریف لیجاتے اور اُنہیں تبلیغ کرتے۔ اور اس طرح نہیں کہ کوئی ملگیا تو اُسے تبلیغ کردی۔ بلکہ آپ تلاش کرتے پھرتے اور ڈھونڈ کر انہیں حق پہنچاتے جس طرح ماں باپ بچے کو تلاش کر کر کے کھلاتے پلاتے ہیں کہ بھوکا نہ رہجائے۔

غرض اس صفت کو اپنے اندر پیدا کرنیکے یہ معنے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو دنیا کا باپ یا ماں فرض کرے اور لوگوں کے فائدہ کا خود خیال رکھے اور خواہ لوگ اُس کی بات نہ بھی مانیں تب بھی ان کے پیچھے پڑا رہے۔ جب انسان اپنے قلب کو ایسا بنا لیتا ہے تو ایسے آدمی کو ایسے لوگ بھی ملجاتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہم اس سے کچھ لے سکتے ہیں۔ اُن پر وہ جبر بھی کرسکتا ہے اور سزائیں بھی دے لیتا ہے۔ اور اس طرح اُن کی تربیت کرتا ہے اور اُن کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ کچھ لوگوں کو منتخب کر کے اُن کو سکھاتا ہے۔ جب وہ مرجاتا ہے تو جن کو اُس نے سکھایا ہوتا ہے وہ دوسروں کو سکھاتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے۔ اور وہ اُسی نسل کا باپ نہیں ہوتا جس کو سکھاتا ہے۔ بلکہ اگلی نسلوں کا بھی باپ ہوتا ہے۔ جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم آج بھی ہمارے باپ ہیں۔ جس طرح کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے باپ تھے۔ اس مقام کا انسان اپنی ہمدردی کو کسی مذہب کے آدمیوں سے محدود نہیں کرتا بلکہ ہر مذہب کے لوگوں کا ہمدرد ہوتا ہے اور سب کا سچا خیر خواہ ہوتا ہے۔

ربّ العٰلمین کا کامل مظہر یہ وہ مقام ہے جس کے کامل اور اکمل مظہر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے اور آپ کے سوا اور کوئی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ربّ العٰلمین کا کامل مظہر وہی ہوسکتا ہے جو پہلوں کی بھی تربیت کرے اور پچھلوں کی بھی۔ اور یہ مقام سوائے رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے کسی کو حاصل نہیں۔ آپ ہی ہیں جو فرماتے ہیں کہ جب

آدم ابھی مٹی میں تھا۔ اسوقت میں خاتم النبیین تھا۔ آپ اسلئے پہلوں کے تربیت کرنے والے نہیں کہ آپ نے براہ راست ان کو سکھایا۔ بلکہ اسلئے کہ پہلے نبی اسلئے آئے تھے کہ لوگوں کو محمد صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تربیت کے نقطہ تک پہنچائیں۔ پس رسول کریم ہی کامل طور پر رب العلمین کی صفت کے مظہر تھے۔ اور یہی وہ درجہ ہے جس کا پانیوالا احمد کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اسی لئے رسول کریم کا نام محمدؐ رکھا گیا کہ سب تعریفیں آپ میں جمع ہو گئیں۔ اور یہ ناممکن تھا کہ بغیر محمد نام کے خاتم النبیین نبی ہوتا۔ پس آپ کا نام بھی آپ کے خاتم النبیین ہونے پر دلالت کرتا ہے +

رب العلمین کا دوسرا ظل مسیح موعود ہیں

غرض رسول کریم صفات الٰہی کا کامل مظہر ہیں مگر مسیح موعود بھی بوجہ اسکے کہ وہ آپ کا کامل ظل ہے آپ کے نور کو حاصل کر کے ظلی طور پر اس مقام کا مظہر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح موعود کو الہام ہوا۔ کہ تجھ پر ایمان لائے بغیر کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا گویا رسول کریم کی اتباع کا صحیح رستہ آپکو ہی معلوم تھا۔ اور کسی کو نہیں۔ آپ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد کے لوگوں کے لئے راہنما تھے کیونکہ مقام محمدی کی ترقی کا آخری نقطہ آپ تھے۔ اور درمیانی اولیاء امت محمدیہ کو آپ ہی کے نقطہ کی طرف لا رہے تھے۔ اور آپ پہلی قوموں کے لئے اسلئے بھی تربیت کرنیوالے ہیں کہ آپ کے ہاتھ پر ہی اللہ تعالےٰ نے سب نبیوں کی پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کی سچائیوں کو ظاہر کیا اور آپ ہی کے ذریعہ سے سب دنیا کے نبیوں کی تصدیق کرائی۔ اور تعصب قومی کو دور کرایا گیا۔ آپ ہی نے کرشن اور رامچندر کی صداقت کو ظاہر کیا جس طرح کہ دوسرے نبیوں کی صداقت کو آپنے ظاہر کیا۔ گو کہ اسوجہ سے آپ پر کفر کا فتوےٰ بھی لگا۔ لیکن یہ جو کچھ ہے ظلی ہے ورنہ حقیقی طور پر جو شخص اگلوں پچھلوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا وجود ہی ہے +

جو شخص اس مقام پر پہنچ جاتا ہے اسپر اس مقام کی نسبت سے رب العالمین کی صفت نازل ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ تب ہی عالمین قرار دیا جاتا ہے اور خدا اس کا

رب ہو جاتا ہے۔ جو شخص اس سے تعلق کرتا ہے خدا تعالیٰ کی کامل ربوبیت کا وہی مستحق ہوتا ہے اور جو اس سے قطع تعلق کرے وہ گویا خدا کے عالموں میں سے نکل جاتا ہے یعنی اس کی کامل ربوبیت نہیں ہوتی۔ اور اس نکتہ میں کفر اور اسلام کا راز مضمر ہے ÷

انتہائی مدارج گو میں نے یہ بتایا ہے کہ اس صفت کے کامل مظہر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں مگر یہ بات نہیں کہ اور کوئی اسکا مظہر نہیں ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ سب نبی ہی اس مقام پر پہنچے ہوئے ہیں۔ ہاں سب کے درجے الگ الگ ہیں کوئی زیادہ پُر جلال مظہر ہے۔ کوئی کم ÷

ان مدارج کو طے کرنیکا علم کس طرح ہو اب یہ بات رہی کہ کس طرح معلوم ہو کہ انسان نے ان مدارج کو طے کر لیا۔ اسکے لئے یاد رکھنا چاہئے۔ کہ جس طرح مدرسہ میں پڑھنے والے طالب علموں کو اپنی جماعت سے اوپر کی جماعت میں ترقی تب ملتی ہے جب وہ اس جماعت کے مضامین کو جس میں وہ ہوں اچھی طرح یاد کر لیں۔ اسی طرح وہی شخص اگلی صفت کی طرف ترقی کر سکتا ہے جبکہ وہ پچھلی صفت پر اچھی طرح عامل ہو جائے مگر جس طرح طالب علم کی ترقی اسلئے نہیں روکی جاتی کہ اسے ایک ایک نقطہ کیوں یاد نہیں۔ اسی طرح بندہ اگر ایک صفت سے اچھی طرح مناسبت پیدا کر لیتا ہے تو گو اس میں بعض کمزوریاں ابھی ہوں اسے اوپر کی صفت کے حصول کی طاقتیں مل جاتی ہیں۔ اور قلیل غلطیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ÷

اس موقعہ پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ پچھلے مضمون سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو مذکورہ بالا چاروں صفات پر باری باری عمل کرنا چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ تو سیر کا طریق ہے۔ کہ الگ الگ منزلیں بنائی گئی ہیں۔ ورنہ یوں انسان کو ہر وقت ہی سب صفات کی مشابہت کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہاں ترقی کامل تبھی ہوگی اور اوپر کی صفات پر وہ تبھی پوری طرح کاربند ہو سکیگا جبکہ وہ نیچے کے درجہ کی صفات پر اچھی طرح عمل کر لیگا ÷

نبی کی بددعا اور مباہلہ ایک اور سوال ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جبکہ نبی ربّ العالمین

صفت کے مظہر ہوتے ہیں تو بددعا یا مباہلہ کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نبی خود بخود ایسا کبھی نہیں کرتے۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایسا کرتے ہیں۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ جب نبی کریم طائف میں گئے۔ اور وہاں کے لوگوں نے آپ کو مارا۔ اور آپ واپس آگئے۔ تو پہاڑ کا فرشتہ آپ کے پاس آیا۔ اور کہا اگر حکم ہو تو پہاڑ اکھاڑ کر ان لوگوں پر گرا دوں۔ مگر رسول کریم نے فرمایا نہیں۔ اور آپ نے دعا کی۔ کہ یا اللہ اس قوم کو پتہ نہیں کہ میں کون ہوں اسی طرح کہا یا اللہ ان کو ہلاک نہ کر شاید ان کی اولاد مسلمان ہو جائے +

اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی بعض بددعائیں تو کی ہیں مگر وہ سب خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت تھیں۔ مولوی عبدالکریم صاحب سناتے ہیں کہ رات کو ایکدن حضرت صاحب دعا مانگ رہے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے عورت دردزہ سے رو رہی ہوتی ہے۔ جب میں نے غور سے سنا تو معلوم ہوا۔ کہ حضرت صاحب کی گریہ کی آواز آرہی تھی۔ وہ دن طاعون کے تھے۔ آپ دعا فرما رہے تھے کہ الٰہی اگر ساری مخلوق مرگئی۔ تو پھر تجھ پر ایمان کون لائیگا۔ پس جب نبی کہتے ہیں کہ فلاں تباہ ہو جائے تو خدا تعالیٰ کے حکم سے کہتے ہیں۔ اور خدا کے حکم کے ماتحت بددعا کرتے ہیں +

پھر سوال ہوتا ہے کہ بددعا تو خدا کے حکم سے کرتے ہیں۔ مگر مباہلہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اسکے لئے یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ مباہلہ اس لئے کیا جاتا ہے۔ کہ جس کو مباہلہ کے لئے بلایا جاتا ہے۔ وہ گمراہی میں حد سے زیادہ بڑھا ہوتا ہے۔ اور یہ بات ربوبیت میں شامل ہے۔ کہ ایک کی ہلاکت سے باقیوں کو بچایا جائے۔ جیسے ایک عضو اگر خراب ہو۔ تو سارے جسم کو بچانے کیلئے اسے کاٹ دیا جاتا ہے +

اور اس شبہ کا جواب کہ خدا تعالیٰ جو رب العالمین ہے۔ وہ کیوں بعض وقت بددعا کا حکم دیتا ہے۔ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ بعض دفعہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص گمراہی میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کی دنیا کی زندگی کی ایک ایک گھڑی اس کے اخروی عذاب کو لمبا کر رہی ہے اور واپس لوٹنے کا راستہ اسنے اپنے ہاتھ سے بالکل بند کر دیا ہے۔ تب اس کی ربوبیت چاہتی ہے کہ اسے اس دنیا کی

رخصت کردے۔ تا اسکے گنہ اور زیادہ نہ ہو جائیں اور عرصۂ عذاب لمبا نہ ہو جائے۔
وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین +

نام کتاب مع مضمون	زبان	قیمت
سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب — ردّ عیسائیت	اردو	۳ر
محمودؐ کی آمین۔ منظوم	"	۲ر
ایام الصلح۔ دعویٰ مع دلائل و پیشگوئی طاعون	"	عہ ر
مواہب الرحمٰن نشانات صداقت	عربی مترجم فارسی	۶ر
حقیقت المہدی۔ آنے والا مہدی صلح کار ہے یا خونی۔	اردو و عربی	۱ر
اربعین۔ ہر چہار نمبر نشان صداقت مرسلین اور ایک نعمت کی طرف دعوت	اردو	۱۲ر
بشیر احمد، شریف احمد، مبارکہ کی آمین۔ منظوم	اردو	۲ر
تحفہ گولڑویہ۔ مفتری و صادق میں مابہ الامتیاز۔	"	
خطبہ الہامیہ۔ قربانی کی اصل حقیقت وثبوت دعویٰ خود و تفسیر چند آیات	عربی مترجم اردو و فارسی	عہ ر

نام کتاب مع مضمون	زبان	قیمت
تریاق القلوب۔ چند پیشگوئیوں کے گواہوں کے نام اور پورا ہونے کی تفصیل	اردو	۸ر
کشتی نوح۔ طاعون سے بچنے کا طریق اور احمدی تعلیم کی تفصیل۔	"	۶ر
لیکچر لاہور، اسلام اور دیگر مذاہب	"	۴ر
لیکچر سیالکوٹ، کرشن ہونے کا ثبوت	"	۱ر
چشمہ مسیحی ینابیع الاسلام کا جواب ردّ عیسائیت۔	"	۴ر
قادیان کے آریہ اور ہم۔ ردّ آریہ	"	۳ر
چشمہ معرفت ردّ آریہ	"	۸ر
نجم الہدیٰ احمد و محمد کی تعریف	اردو عربی فارسی	۱ر
مسیح ہندوستان میں۔ سفر مسیح ناصری	اردو	۶ر
نزول المسیح۔ نشانات صداقت	"	۱۲ر

حضرت اقدس

کی وہ کتابیں جو آجتک شائع نہیں ہوئیں۔ اب تیار ہو گئی ہیں خواہشمند احباب جلد منگوالیں

یعنی

منن الرحمٰن ۱۲ر - فریاد درد البلاغ ۸ر - ترغیب المومنین ۳ر - تجلیات الٰہیہ ۱ر

تقاریر و تصانیف حضرت خلیفۃ المسیح ثانی

ایدہ اللہ بنصرہ

نمبر شمار	نام کتب	قیمت	نمبر شمار	نام کتب	قیمت
۱	منصب خلافت	۱ر	۱۵	آئینہ صداقت	۸ر عمر
۲	برکات خلافت	۴ر	۱۶	ترک موالات اردو	۸ر
۳	انوار خلافت۔	۱۲ر	۱۷	" انگریزی	۲ر عمر
۴	حقیقۃ الرؤیا	۱۲ر	۱۸	تحفۃ الملوک قسم اول	۸ر عمر
۵	ذکر الٰہی۔	۷ر	۱۹	" " " دوم	۱۲ر
۶	عرفان الٰہی	۱۰ر	۲۰	" " انگریزی	۱۲ر
۷	تقدیر الٰہی	عہ ر	۲۱	صادقوں کی روشنی	۸ر عمر
۸	ملائکۃ اللہ	۶ر عہ	۲۲	تحفہ شہزادہ ویلز طبع دوم اردو	۱۴ر
۹	اسلام میں اختلاف کا آغاز	۱۱ر	۲۳	" مجلد "	۴ر عمر
۱۰	ہدایات زرّیں۔	۱۰ر	۲۴	" انگریزی	عا
۱۱	اسلام اور دیگر مذاہب	۴ر		غیر مجلد نہایت اعلیٰ کاغذ	
۱۲	" " انگریزی	۶ر	۲۵	کلام محمود مجلد	۱۰ر
۱۳	حقیقۃ النبوۃ۔	۴ر عمر	۲۶	خطبات محمود۔	۱۳ر
۱۴	حقیقۃ الامر	۲ر	۲۷	مدارج تقویٰ	۲ر

ان کتب کے علاوہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی ہر ایک کتاب بک ڈپو تالیف و اشاعت

قادیان سے مل سکتی ہے

مینجر

بک ڈپو